

# بے پتوار



عبدالرب بھٹی

## پیش لفظ

شروع اللہ کے بابرکت نام سے جس کی تعریف ہی سر بہ سر رحمت العالمین ہے..... جس نے مجھ گناہ گار کو اپنے فیوض و برکات سے ہمیش، اور بن مانگے ہی مستفیض کیا، کم از کم مجھ پر غالب کا یہ شعر صادق نہیں آتا کہ.....  
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے.....

اللہ نے میری ہر خواہش پوری کی، دستِ سبائی سے لے کر شوقِ قلم و قرطاس تک..... اور میں جو بھی مانگوں گا، جو خواہش رکھوں گا وہ صرف اللہ تعالیٰ سے رکھوں گا کہ یہ ایک عاجز بندے کا حق ہے۔ ”بے پتوار“ کوئی مادرائی یا محیر العقول واقعات پر مبنی کہانی نہیں ہے..... بلکہ یہ ہمارے ہی معاشرے کی ایک سچی داستان ہے۔ جس میں آپ، میں اور ہم سب سانس لے رہے ہیں، ہمارے ارد گرد جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہم دیکھ رہے ہیں اور محسوس کر رہے ہیں۔

”بے پتوار“ میں عشق و محبت کی داستان دل ستان بھی ہے جو ایک عام انسان کو خاص بنا دیتی ہے اور بے دھڑک بڑے سے بڑے طوفانِ مصلطام خیز کے آگے ڈٹ جانے پر مجبور کر دیتی ہے۔  
اس میں معاشرے کی روایتی بے حسی اور کج ادائیاں بھی ہیں جو انسان کے افکار، احساسِ محدودی اور کم مانگی کے جذبات پر وان چڑھانے کا باعث بنتی ہیں۔

”بے پتوار“ جیسی حقیقت خیز کہانی میں فرسودہ، رسم و رواج کی الم ناک حقیقتیں باشعور قارئین کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ آج کل تفریحی ادب میں آج بھی حقیقت پسند قارئین..... ایسی کہانیاں ذوق و شوق سے پسند کرتے آئے ہیں۔ ایک زندہ و جاوید معاشرتی کتھا کو پڑھنے کا اپنا ایک خاص لطف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے واقعات کڑی در کڑی ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں جس سے دلچسپی، کشاکش اور سنسنی خیزی کا اثر غالب رہتا ہے اور قاری ایک تجسس کے زیر اثر کتاب کو ایک ہی نشست میں پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔  
کثیر الاشاعت ہفت روزہ اخبار جہاں میں یہ ناول چھپنے کے بعد میرے دوست محترم عبدالغفار صاحب نے اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ میں ان کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔

آپ کی آراء اور دعاؤں کا طالب

نیا زمند

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

باہر ٹھہرتی ہوئی رات میں خنک ہوا سرسراہی تھی۔ جاڑا اس قدر تھا کہ رگوں میں موجود خون تک برفاب ہوا جا رہا تھا۔ گارے مٹی سے بنے اس جھونپڑی نما گھر کے پکے اور بوسیدہ صحن میں ایک کونے پر کھڑی بہت سی پیال کی ڈھیری سے وہ دیہاتن سی جوان لڑکی لپٹ کر علیحدہ ہوئی تو..... بہت سا پیال اس کے نازک بازوؤں میں بھر آیا۔ وہ بڑی چوکھٹ کو پار کرتی ہوئی باہر آئی اور قریب ہی کھڑی ایک بیل گاڑی پر پیال ڈال کر اسے پھیلائے لگی۔ یہی عمل اس نے تین مرتبہ مزید دہرایا اور پھر اندر کچے صحن میں ہی کھڑی چند ٹائیے کے لیے ہانپنے لگی۔

اوپر کھلے اور صاف تاروں بھرے آسمان پر دیکھتے چاند کی ٹھنڈی روشنی میں اس لڑکی کا معصوم اور صبح چہرہ اس وقت شدید تھکن اور اعصاب زدہ نظر آ رہا تھا۔ ذہنی اور جسمانی تکالیف کی تفسیر بنی اس لڑکی کی کجکاری آنکھوں میں اس وقت شدت عم سے آنسو جھلملاتے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ خالصتاً مقامی اور دیہاتی لباس میں ملبوس تھی جو کافی حد تک پرانا اور میلا چیکٹ ہو رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کے ہلکے سبز رنگ کے شیشوں جڑے گلے والی قمیض اور اسی رنگت کی شلوار میں اس کا ملکوتی معصوم سا حسن اس وقت اور کوئی نہیں دیکھ رہا تھا لیکن اوپر آسمان پر نکلے مہبوت چاند کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی لالہ بابا کی شہزادے کی طرح اپنی شمسی کشش ثقل سے نکلنے اور اس معصوم دیہاتن لڑکی کے دلاویز حسن کے مدار میں آنے کے لیے بے چین ہو۔

دفعۃً صحن کے ایک جانب بنے تنگ و تاریک کوٹھڑی نما کمرے میں ہولے ہولے اور درد انگیز کراہیں سی بلند ہونے لگیں جس نے تھکی ہاری اس لڑکی کو چونکا دیا۔ اس نے ایک لمحے کو کوٹھڑی نما کمرے کے بند دروازے کو دیکھا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ حرکت میں آ گئی۔ نیز اس کے چہرے پر بھی پریشانی کی لکیریں کچھ مزید گہری ہو گئیں۔ وہ جلدی سے کوٹھڑی کے اندر داخل ہوئی جہاں جھنگا سی کھاٹ پر ایک مدقوق سا ضعیف بوڑھا لیٹا کراہ رہا تھا۔

اس کی ہیئت کذائی سے یوں لگتا تھا جسے وہ کسی شدید قسم کے مرض میں مبتلا ہو۔ کھاٹ پر صرف میلی چیکٹ رلی بچھی ہوئی تھی اور ایک عجیب قسم کی سزا اند بھی ماحول کو پراگندہ کئے ہوئے تھی۔ اس لڑکی نے پریشان کن نگاہ سے گھاٹ پر پڑے بوڑھے کو دیکھا۔ اندر لالین کی ریقان زدہ روشنی میں لڑکی کو وہ بوڑھا کوئی دم کا مہمان نظر آنے لگا۔ وہ قریب المرگ بوڑھا اس کا باپ تھا جسے اچانک ہی گزشتہ دنوں سے ایک خطرناک وبائی مرض نے جکڑ لیا تھا۔ گوٹھ کا ایک پرانا حکیم بدھل اس کا علاج کر رہا تھا اور اس نے یہی بتایا تھا کہ اسے کالایرقان ہو چکا ہے۔ جس کا علاج شہر کے بڑے ہسپتال کے سوا کہیں ممکن نہیں۔ مگر پھر بھی حکیم نے اپنی حکمت کا حق ادا کرتے ہوئے گوندی کے پتوں کا عرق نیم کے پتوں میں ملا کر پیتے رہنے کی تاکید کی تھی۔ وہ بے چارہ اس قدر بخار میں تپ رہا تھا کہ پوری کٹھڑی میں اس کی حدت محسوس ہو رہی تھی۔ خود اس لڑکی کو بھی اندر کی فضا قدرے گھٹی ہوئی اور پتی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

وہ دوبارہ صحن میں آگئی۔ جہاں سردی نے ایک بار پھر اس کے نازک وجود کو ٹھہرا کر رکھ دیا۔ تاہم اس نے سردی کی پروا کئے بغیر قریب جمھولتی ہوئی رسی سے ٹنگی رلی اتاری اور باہر آ کر بیل گاڑی پر بکھری ہوئی پیال پر بچھا دیا پھر وہ وہیں ایک لمحے کو رکی۔ باہر ہر طرف کھرا سا چھایا ہوا تھا۔ سناٹا اس قدر تھا کہ پتا بھی کھڑکتا تو دھماکے جیسی آواز محسوس ہوتی۔ لڑکی کی بے چین سی نگاہیں سامنے دبیز کھر میں لپٹے ہوئے کچے راستے پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے شاید کسی کا انتظار تھا۔ پھر وہ بیلوں کے قریب آ کر ان پر دھری موٹی گودڑ نما پھٹی پرانی چادروں کو بیلوں کے جسموں پر پھیلا کر درست کرنے لگی جو ان دونوں کے لیے گرم لحافوں کا کام دے رہی تھیں۔ لگتا تھا اس لڑکی کو اپنے بیلوں سے بڑی محبت تھی۔ اس نے باقاعدہ ان دونوں جانوروں کے نام رکھے ہوئے تھے۔ ایک سانولہ تھا اور دوسرا ہیرا۔ پھر وہ ان کی تھو تھنیوں پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی تو اس کی کپکپاتی ہوئی آواز میں بلا کا درد سمٹ آیا تھا۔

”رے سانولے! دھڑیں سائیں سے دعا کرو ہمارے بابا کو بچالے۔“ پھر وہ دوسرے سے مخاطب ہوئی۔ ”ہیرے! تو بھی دعا کر۔۔۔۔۔ بابا کے لیے۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔ ورنہ ہم اکیلے رہ جائیں گے۔ سارے سنسار میں کوئی ہمارا نہیں ہو گا۔“ یہ کہتے ہوئے بے اختیار اس لڑکی کی آنکھوں میں آنسو جھللا گئے۔

پھر یوں ہوا کہ محسوسات کی غیر مرئی ڈور نے دونوں جانوروں کو احساس کی جکڑ بندی

میں لیتے ہوئے یہ باور کرا دیا کہ ان کی کھری میں بڑے انس کے ساتھ جو لوگ چار اڈالا کرتے تھے اور موسموں کے تغیر و تبدل میں ان کی حفاظت کرتے تھے۔ وہ ہمدرد لوگ آج کسی بڑی پریشانی میں مبتلا ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس لڑکی کو چند لمحے کے لیے بیلوں کی موٹی موٹی سیاہ ابھری ہوئی آنکھوں میں معصومانہ چمک، نمی کی صورت میں جھللاتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اب شدید قسم کے تذبذب میں مبتلا نظر آرہی تھی۔ وہ پھر بڑبڑائی۔

”جانے چا چا سوڈھل کو کیوں دیر ہوگئی۔“

بیلوں نے ہولے سے ”اؤں۔۔۔۔۔ اؤں۔۔۔۔۔“ کیا تو وہ یکدم چونکی۔ پھر ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کے دماغ میں لپکا۔ درحقیقت وہ اپنے باپ کو شہر بغرض علاج لے جانا چاہتی تھی جو ان کے گوٹھ سے کوئی بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ مگر یہ سب پروگرام منہ اندھیرے روانہ ہونے کا تھا اور چا چا سوڈھل اور چاچی عنایتاں نے بھی اس کے ساتھ جانا تھا، لیکن پھر یوں ہوا کہ اچانک ہی اس لڑکی کے باپ کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی اور وہ شدید قسم کے بخار میں پھنکنے لگا۔ اس کی حالت آج شام کے بعد سے بگڑنا شروع ہوئی تو لڑکی خود حکیم بدھل کے ہاں سے دوائی لے کر آئی اور وہ اپنے باپ کو دی جس سے برائے نام ہی افاقہ ہوا تھا اور رات کو پھر حالت پہلے سے زیادہ بگڑنے لگی تو بے چاری پریشان سی ہو گئی اور پھر کسی کے ہاتھ اپنے چا چا سوڈھل کے ہاں پیغام بھجوایا کہ وہ آجائے تاکہ فوری طور پر ”بابا“ کو شہر لے جایا جاسکے۔

جس گوٹھ کے لڑکے کے ہاتھ چا چا سوڈھل کو پیغام بھجوایا تھا اس نے گھنٹہ بھر بعد آ کر بتایا کہ چا چا سوڈھل۔۔۔۔۔ بس پہنچنے والا ہے ساتھ ہی اپنی بیٹی کو اس نے یہ بھی ہدایت بھجوائی تھی کہ ان کے آنے تک وہ بیل گاڑی وغیرہ تیار کر کے رکھے۔ سواب وہ اپنا کام نمٹا چکی تھی۔ مگر اس کے چاچا کا کچھ پتہ نہ تھا؟ وہ اندر آگئی تو ایک بار پھر کٹھڑی سے اسے اپنے قریب المرگ باپ کی نیم غنودہ سی کراہیں سنائی دینے لگیں وہ پریشان سی ہو گئی۔ اسے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ چا چا سوڈھل ابھی نہیں پہنچا تھا۔ اسے حیرت کے ساتھ دکھ بھی ہو رہا تھا جو اس کی پڑمردگی میں مزید اضافے کا باعث بن رہا تھا۔ اس بے چاری کو اپنے باپ کی جاں بہ لب کراہیں پریشان کئے دے رہی تھیں۔

”دھڑیں سائیں۔۔۔۔۔ میرے بابا۔۔۔۔۔ پر رحم کرنا اور۔۔۔۔۔ اور چا چا سوڈھل کو جلدی بھیج دینا۔“ بے اختیار اپنی بے بسی پر ایک بار پھر اس کی سیاہ آنکھوں کے گوشے نمناک ہو گئے تھے۔

پھر شاید اللہ نے اس کی دعا قبول کر لی کیونکہ اگلے ہی لمحے باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

”اللہ رکھی! دروازہ کھول میں آیا ہوں سوڈھل۔“

یہ چاچا سوڈھل تھا جس نے دستک کے ساتھ ہی باہر سے اپنی بھتیجی اللہ رکھی کو پکارا تھا اور اللہ رکھی کے اندر اس آواز پر جیسے جان سی پڑ گئی۔ اس نے لپک کے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی اس کا چاچا سوڈھل ایک موٹی سی چادر اوڑھے کھڑا تھا۔ ”آ..... آ..... چاچا اندر آ جا۔“ اللہ رکھی نے بڑے رसान سے کہا۔ اس آڑے اور بے یار و مددگار وقت میں کسی اپنے کو پا کر اس کی پڑمردگی یکدم دھل سی گئی تھی۔ چاچا سوڈھل جو پچاس سے اوپر ہی کا تھا سردی سے ٹھنھرتا کانپتا ہوا اندر آ گیا۔

”دھیئے..... مجھے دیری ہو گئی پر شاباش ہے توں آپڑاں کام پورا کر کے رکھا ہے۔ کیا کروں تیری چاچی نے بھی کھاٹ پکڑ لی ہے۔ اچھا بتا بھائی کیا ہے۔“

”بس چاچا ویسا ہی ہے۔“ اللہ رکھی ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی اور سوڈھل اندر کوٹھڑی میں آ گیا۔ وہ اللہ رکھی کے بیمار باپ کا چھوٹا بھائی تھا یہی کوئی چار پانچ سال چھوٹا۔ اللہ رکھی کے باپ پر اب نیم بے ہوشی سی طاری ہو گئی تھی۔ سوڈھل بھائی کی جانب دیکھ کر قدرے مایوس سا نظر آنے لگا۔ وہ آگے بڑھا اور اسے سہارا دیتے ہوئے آہستگی چارپائی سے اٹھا کر اپنے بازوؤں پر سنبھال لیا۔ اللہ رکھی نے بھی ہاتھ بڑھایا اس نے فوراً باپ پر رلی ڈال دی تھی۔ پھر وہ چاچا سوڈھل کے عجب میں چلتی ہوئی باہر آئی۔

”دھیئے تو نے کچھ کھایا یا بھی ہے۔ نہیں تو روٹی وغیرہ باندھ لے۔ میں تو جلدی میں کچھ نہ لاسکا آپڑیں نال..... تیری چاچی بھی بس۔“ اس نے پھر اپنی بیوی کا رونارویا۔

اس اثناء میں وہ اپنے بیمار بھائی کو تیل گاڑی پر بھیچھی پرال پر آہستگی کے ساتھ لٹا چکا تھا اور اللہ رکھی نے بھی بڑھ کر اپنے باپ پر دو تین چادریں ڈال دیں۔ تاہم سوڈھل چاچا کی بات پر وہ گوموسی ہو گئی۔ اس کی متذبذب سی چپ نے جہان دیدہ سوڈھل کو زاوراہ کی عدم دستیابی کے بارے میں بتا دیا۔ اس کے بعد وہ بھی چپ رہا۔

پھر اس نے اللہ رکھی کو گھر کا دروازہ بند کر کے تالا لگانے کی ہدایت کی اور خود بیلوں کی رسی تھام کر انہیں ہولے سے ٹھکانے لگا۔ ادھر اللہ رکھی فوری دروازہ وغیرہ بند کر کے تیل گاڑی پر اچک کر آ بیٹھی اور سوڈھل بھی چاچا کے سنبھال کر بیٹھ گیا۔

تیل ہولے سے ”آں..... آں.....“ کی آواز نکال کر ڈکرائے اور آگے کو

ہولے۔

رات کے مہیب سنائے میں تیل گاڑی کے چوبی اور بے تکتے پہیوں سے ”چوں..... چک..... چوں..... چک“ کی بیزار کن آوازیں انتہائی ناگوار معلوم ہو رہی تھیں سامنے کچے راستے پر مدہم چاندنی میں لپٹی ہوئی کہر کی دھندلی چادر سی تھی ہوئی تھی۔ تیل گاڑی ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھی چلی جا رہی تھی۔

بیلوں کی رسی تھامے سوڈھل اندر سے بڑا مسرور تھا۔ اپنے بھائی کی موت اسے یقینی نظر آرہی تھی۔ وہ تو یونہی اپنی بھتیجی اللہ رکھی کے سامنے ”درمند بھائی اور پُر شفقت چاچا“ بننے کی اداکاری کر رہا تھا تا کہ وہ اس سے بد دل نہ ہو، وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ اب کوئی دم کا مہمان ہے۔ اس کے بعد..... ہاں..... اس کے بعد اللہ رکھی کا اس دنیا میں اس کے سوا کوئی نہ تھا اور باپ کے مرنے بعد وہ لازماً اس کی ذمہ داری بننے والی تھی اور بے حس اور حریص چاچا سوڈھل پہلے ہی سے اپنی اس ”ذمہ داری“ سے اچھی طرح سے ختنے کے لیے شیطانی منصوبہ بنا چکا تھا۔

وہ ایک عرصے سے کسمپری کی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ دے کا مریض بھی تھا مگر حقہ گر گر کر انا پھر بھی نہیں چھوڑتا تھا۔ وہ وڈیرے میر کھمیر خان کی زمینوں میں ”رہا کی“ کرتا تھا۔ اب اس سے مشقت نہیں ہوتی تھی۔ وہ تھا بھی بے اولاد، لے دے کے ایک بیوی تھی جو ہر سے انوائی کھٹوائی لئے پڑی رہتی تھی۔ وہ اس قدر بے حس اور لالچی ہو چکا تھا کہ اسے اب اپنے بیمار بھائی کی یقینی موت اور بھتیجی اللہ رکھی کی ”سرپرستی“ اس کے ذمے آنے کی صورت میں سارے دلدر دور ہوتے نظر آ رہے تھے۔ بس اب اس کی یہی ایک خواہش تھی کہ کسی طرح سے تیل گاڑی میں موت وزیست کی کینکشن میں مبتلا اس کے بھائی کا دم پار ہو جائے۔ ورنہ وہ جانتا تھا کہ شہر کے ہسپتالوں میں کتنا ذلیل و خوار ہونا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ سنگد لاندہ فکر بھی کھائے جا رہی تھی کہ اگر شہر پہنچنے سے پہلے پہل اس کا دم نہ نکلا تو ہو سکتا ہے یہ بیخ جائے اور النازر چہ ہی گلے پڑ جائے۔ لہذا اب تیل گاڑی ہانکنے کے دوران وہ اب اس سنسنی خیز گتھی میں الجھ گیا کہ اس زندہ لاش سے کس طرح چھٹکارا حاصل کرے۔

اب وہ جان بوجھ کر تیل گاڑی کی رفتار بھی قدرے آہستہ رکھے ہوئے تھا۔

اللہ رکھی نے تیل گاڑی کی ہلکی رفتار پر جھنجکتے ہوئے چاچا سوڈھل کو ٹوکا۔ ”چاچا.....

بہت آہستہ چل رہی ہے۔ تیز چلاؤ نا۔“

زردی پھیلی ہوئی نظر آئی۔ اس کا دل دھڑکا، بیمار مٹھل کے چہرے پر جان کنی کے آثار عیاں تھے اور پھر وہ خود کو پُر سکون سا محسوس کرنے لگا۔ ”کم بخت بڑا ہی سخت جان ہے یہ مجھے شہر پہنچا کر ہی دم لے گا۔“ سوڈھل نے دل ہی دل میں اسے کوسا تھا۔

پھر معا ایک سفاک خیال نے اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرا دی۔ جسے اللہ رکھی قطعاً محسوس نہیں کر سکتی تھی۔ سوڈھل اپنے اندر اچانک ابھرنے والے اس سفاک خیال کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے اللہ رکھی سے بولا۔ ”دھیئے! تو ایسا کر میری جگہ بیٹھ جا کر اور گاڑی سنبھال۔ میں جب تک مٹھل کے آہستہ آہستہ مالش کرتا ہوں۔ آجا..... شاباش۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک طرف کوسرک گیا۔

اللہ رکھی بے چاری متذبذب سوڈھل چاچا کی جگہ آگئی اور بیلوں کی رسی اس کے ہاتھوں سے لے کر خود تھام لی۔ چاچا سوڈھل اب پچھلی طرف آگیا جدھر مٹھل لیٹا ہوا تھا۔ اللہ رکھی نے رسی کو ہولے سے جھٹکا دے کر مخصوص آواز میں انہیں ڈکارا اور پھر ایک ناگوار اور بیزار سی چرچراہٹ کے ساتھ بیل گاڑی کا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔

سوڈھل کا دل نہ جانے کیوں بے طرح دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے بمشکل اپنی مرتعش کیفیت پر قابو پاتے ہوئے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ رلی کے اندر سرکایا پھر ناگ کے زہریلے پھن کی طرح سوڈھل کا ہاتھ اپنے جان بہ لب بھائی کی اکہری گردن پر آگیا اور اگلے ہی لمحے اس کا دباؤ گردن پر بڑھتا چلا گیا۔

ادھر بے چاری اللہ رکھی دل ہی دل میں اپنے چاچا سوڈھل کو دعائیں دیتی ہوئی کو چپانی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ اس بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ جس شخص کو وہ فرشتہ سمجھ رہی تھی وہ ایک جلا دصفت شخص تھا جو موت کا فرشتہ بنا بڑے آرام سے عقب میں بیٹھا، اسے یتیم کرنے پر تلا ہوا تھا۔

ادھر سوڈھل کے ہاتھ کے شکنجے نے بے سدھ اور نڈھال پڑے مٹھل کی گردن کو پوری طرح دبوچ کر تنفس کا رہاسہا کمزور سلسلہ بھی منقطع کر ڈالا تھا۔ جاں بہ لب پڑے مٹھل کے کمزور جسم نے بمشکل روح کا ساتھ چھوڑتے ہوئے تشنہ ساجھٹا لیا اور ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کی روح نفسِ معصی سے پرواز کر چکی تھی۔

جلا دصفت سوڈھل نے اپنا کام مکمل کر کے ہاتھ رلی کے اندر سے باہر کھینچ لیا۔ سخت سردی کے باوجود اسے اپنی پیشانی عرق آلودی محسوس ہوئی جسے اس نے فوری میلی قمیض کے دامن سے پونچھ ڈالا۔

سوڈھل نے چونک کر اس کی بات سنی اور مکارانہ تشویش سے بولا۔ ”دھیئے! تیز چلانے کو تو چلاؤں۔ پر مجھے پیہوں کی کاٹھی کمزور محسوس ہو رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ٹوٹ جائے تو..... اس سے بھی رہ جائیں گے۔“

اللہ رکھی بے چاری یہ سن کر چپ ہو رہی۔ تاہم اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ وہ بے چاری بار بار پرال پر لیٹے اپنے بیمار باپ کی تپتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ پھیرنے لگتی اور دل ہی دل میں اس کی زندگی اور شفا یابی کی دعائیں مانگنے لگتی۔

عجیب سی بات تھی ایک کے ہاتھ بیمار بوڑھے کی زندگی کے لیے اٹھ رہے تھے تو دوسری جانب اس کی موت کی آرزو بددعا کی صورت پر نکل رہی تھی۔ یہ سوڈھل تھا جو اپنے بھائی کی موت کا شدت سے آرزو مند تھا۔ عجیب فلسفہ قدرت تھا یعنی سوڈھل بھی اپنے بھائی کی موت کے سلسلے میں اپنی ”دعا“ کے پورا ہونے پر اُمید تھا۔

بہر طور وقت بھاری سیل کی طرح سرک رہا تھا۔ کچا اور ناہموار راستہ اب ختم ہونے کو تھا کیونکہ سامنے شہر جانے والی پکی سڑک مدہم چاندنی میں نظر آنے لگی تھی۔ سوڈھل پر اب عجیب کیفیت طاری تھی وہ بار بار اپنے عقب میں بیٹھی اللہ رکھی سے پوچھتے جا رہا تھا۔ ”دھیئے! مٹھل..... کوسا نس آ رہا ہے نا۔“

اور بے چاری اللہ رکھی جانے کیوں اپنے چاچا سوڈھل کے ان الفاظ پر لرزی جاتی۔ پکی سڑک کی چوڑی پٹی اب سامنے آچکی تھی۔ وہ چونکہ ذرا اونچی تھی اس لئے سوڈھل نے بیلوں کی رفتار یکدم بڑھادی پھر ایک زوردار جھٹکے سے بیل گاڑی کے پیسے پکی سڑک کے ابھرے ہوئے کناروں سے ٹکرائے..... گاڑی کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اللہ رکھی گرتے گرتے سنبھلی اس کے بیمار باپ کے حلق سے بھی زوردار کراہ خارج ہو کر رہ گئی۔ اب بیل گاڑی سڑک پر چڑ چکی تھی۔ پھر دفعۃً سوڈھل کو اپنے بیمار بھائی کی مسلسل کربناک کراہوں کی آوازیں آنے لگیں۔

”چاچا..... چاچا..... گاڑی روکو۔ بابا کو نہ جانے کیا ہو رہا ہے۔“ پیچھے سے اللہ رکھی کی پریشان کن آواز ابھری اور سوڈھل نے بیلوں کی رسی کھینچ دی۔ بیل گاڑی ہولے سے چرچرا کر رک گئی۔ سوڈھل وہیں بیال پر بیٹھے بیٹھے پیچھے کی جانب گھوما۔ اللہ رکھی ذرا پیچھے کو سرک گئی۔ سوڈھل نے ہولے سے رلی کا ایک سرا اپنے بیمار بھائی کے چہرے سے سرکایا تو چاند کی غبار آلود اور مدہم روشنی میں اسے اپنے بھائی کے جھریوں بھرے چہرے پر موت کی

چاری اللہ رکھی بھی وقت کی اس دورخی برب سیئے زندگی کی گاڑی کھینچنے پر مجبور تھی۔ اس کے باپ مٹھل کو مرے آج ہمیدہ ہو چلا تھا، لیکن اللہ رکھی کو یوں لگتا تھا جیسے ابھی دروازہ کھلے گا اور اس کا بابا اندر آ کر اپنے مخصوص لہجے میں اسے پکارے گا۔

”رے میڈی آمز گودی..... میڈی دھی راڑیں..... آ..... آجاتے سیر کرانے لے چلوں۔“ پھر اسی اثناء میں باہر بیلوں کے بھی ڈکرانے کی آواز ابھرتی تو مٹھل پیار سے اللہ رکھی کو کہتا۔ ”دیکھ دھیئے..... سانولا بہرا بھی تجھے بلار ہے ہیں۔“

پھر جلد ہی غزدہ اللہ رکھی کو یہ جاں گسل احساس ہوتا کہ وہ باپ کے مشفق سائے سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکی ہے تو اس کی اذیت میں مزید اضافہ ہونے لگتا۔ مگر یہ سب کچھ اس سے بھلایا بھی تو نہیں جارہا تھا۔ ماں کا سایہ تو بچپن سے ہی چھن گیا تھا۔ باپ نے اتنی محبت دی تھی کہ وہ باپ کو ہی سب کچھ سمجھنے لگی تھی۔ روز شام کو اس کا باپ کھیتوں سے کام کے بعد تھکا ماندہ لوٹتا اور آتے ہی اسے بیل گاڑی میں سیر کرانے لے جاتا۔

”بابا..... تو تھکا ہوا آتا ہے۔ مجھے نہ لے جایا کر۔“ اللہ رکھی معصومانہ تکلف سے اپنے باپ سے کہتی تو وہ پیار سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے شفیق لہجے میں کہتا۔

”دھیئے راڑیں! تجھے دیکھ کر میری ساری ٹھکن دور ہو جاتی ہے اور پھر کون سا میں تجھے آڑیں سر پر بیٹھا کے لے جاتا ہوں۔ یہ ہیرا اور سانولا جو ہیں۔“ وہ اسے مطمئن کر دیتا اور اللہ رکھی باپ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی۔

اللہ رکھی اب اپنے چاچا سوڈھل اور چاچی عنایتاں کے ساتھ مستقل آکر رہنے لگی تھی۔ چاچی عنایتاں کا رویہ تب تک تو درست رہا جب تک اس کے شوہر سوڈھل نے اللہ رکھی کو مکمل طور پر اپنی ذمہ داری میں لینے اور بڑی چالاکی سے اس کا مکان فروخت کرنے کے بعد رقم اپنے تصرف میں لے لی تو پھر چاچی عنایتاں اپنی اصلیت پر اتر آئی۔ وہ پہلے ہی انوائی کھٹوائی لے کر بڑی رہتی تھی۔ اب اللہ رکھی یعنی اپنی بھتیجی کی صورت میں اسے مفت کی بلکہ مالدار نوکرانی مل گئی تھی۔ لہذا اس نے سارے کام کا بوجھ بے چاری اللہ رکھی کے کاندھوں پر ڈال دیا لیکن اللہ رکھی نے کبھی گلہ شکوہ نہیں کیا تھا۔ وہ سراپا معصوم، منکسر المزاج، مثل اللہ میاں کی گائے تھی۔ حتیٰ کہ وہ چاچی عنایتاں کی جھڑکیوں کو بھی خنداں پیشانی سے قبول کر لیتی اور حرف شکایت تک نوک زبان پر نہ لاتی۔ اللہ رکھی اب انہی لوگوں کو اپنا سب کچھ سمجھتی تھی۔

سوڈھل نے اللہ رکھی کی جانب سے یکسر اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ تاہم کبھی کبھار

”چاچا..... بابا..... ٹھیک ہے نا۔“ دفعۃً اللہ رکھی نے اپنی معصوم سی لرزتی آواز میں پوچھا۔

”دھیئے! دھڑیں سائیں خیر کرے۔ بھائی کی آواز نہیں آرہی۔“ سوڈھل فوراً تشویش سے بولا اور ساتھ ہی اپنا چہرہ متفکر سا بنالیا۔

اللہ رکھی دھک سے رہ گئی۔ اس نے فوری بیلوں کی رسی کھینچ لی اور جلدی سے پیچھے کی جانب پلٹی۔

سوڈھل اس کے باپ کے اوپر سے رلی ہٹا رہا تھا۔ مدہم روشنی میں مٹھل کی آنکھیں ایک ٹک کھلی ہوئی تھیں۔

”بابا..... بابا..... اٹھ بابا۔“ اللہ رکھی جذباتی انداز میں چیخی۔ غالباً اس پر یہ اذیت ناک انکشاف ہو چکا تھا کہ اس کا بابا اسے بھری دنیا میں تنہا چھوڑ کر ملک عدم سدھار چکا ہے۔

”چاچا..... چاچا دیکھو..... بابا اٹھ نہیں رہا۔“ وہ سوڈھل سے مخاطب ہوئی جو بہ ظاہر غمگین چہرہ لئے اپنے مردہ بھائی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ اللہ رکھی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی آواز کو گلوگیر بنا کر ازراہ تاسف بولا۔ ”میڈی دھی..... صبر کر تیرا بابا گزر گیا ہے۔ دھڑیں مولا کا یہی حکم تھا۔“

یہ سننا تھا کہ بے چاری اللہ رکھی وہیں اپنے باپ کی لاش سے لپٹتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ”بابا تو مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میں اب کس کے لیے کھیتوں میں روٹی لسی لے کر جاؤں گی بابا..... میرا کون ہے اب۔“

وہ بے چاری بلکان ہوئی جا رہی تھی۔ مکار سوڈھل نے بڑی شفقت سے اللہ رکھی کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”ایسا مت بول دھیئے..... ہم ہیں نا تیرے ساتھ۔ تیرا چاچا۔ تیری چاچی۔ ہم بھی تیرے ماں باپ کی جگہ ہیں اور پھر دھڑیں سائیں تیرے ساتھ ہے۔ چپ ہو جا دھیئے شاباش۔“

اللہ رکھی کے رونے کی آواز اب سسکیوں میں بدل گئی تھی۔ سوڈھل یہ آہنگی بیل گاڑی کے اگلے پھٹے پر آ بیٹھا اور رسی تھام کر بیلوں کو ٹنکار تے ہوئے واپس گونٹھ کی جانب موڑنے لگا۔ دینز کھر میں لپٹی رات دھواں دھواں ہو کر سستی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

☆=====☆

وقت بڑی عجیب شے ہے۔ زخم بھی دیتا ہے اور مرہم بھی خود ہی لگاتا ہے۔ بے

جب وہ یہ دیکھتا کہ اس کی بیوی عنایتیاں کی زیادتی اللہ رکھی پر کچھ بڑھنے لگی ہے تو وہ اسے تنہائی میں بڑی چالاکی سے سمجھاتا۔

”اڑی چری..... اتنی سختی نہ کر اس پر۔ ایسا نہ ہونگ آکر بھاگ ہی جائے یہاں سے۔ تو نہیں جانتی یہ ہمارے لئے سونے کی چڑیا ہے۔ سونے کی چڑیا۔“

”کیا مطلب سوڈھل ذرا کھل کر تو بتا۔“

عنایتیاں نے کسی خیال کے تحت پوچھنا چاہا۔

”بتا تو دوں پر تم عورتیں لوگ چیٹ کی بڑی ہلکی ہوتی ہو۔“ سوڈھل نے جیسے جواز پیش کیا۔ تو اس کی بیوی چالاکی سے بولی۔

”نہیں ڈے سوڈھل! میں کسی سے اس کا ذکر نہیں کروں گی۔ بتانا۔ مجھے بھی تو کیا عام عورتوں کی طرح سمجھتا ہے بھلا۔“

سوڈھل چند ثانیے بعد توقف سے۔ بولا۔ ”سن ڈی..... دیکھ وہ تو نے دودے خاں کا نام تو سنا ہو گا ناں۔“

اس کی بات پر عنایتیاں کچھ یاد کرتے ہوئے جواباً بولی۔ ”ہاں..... وہی دودا خاں نہیں جو بڑا دولت مند ہے اور اس نے دو بیویاں بھی کر رکھی ہیں۔“

”ہاں ڈی وہی..... ٹھیک پہچانی تو“..... سوڈھل دبے دبے جوش سے بولا۔ پھر اس کا لہجہ قدرے سرگوشیاں ہو گیا۔ کہنے لگا۔ ”دیکھ ڈی عنایتیاں! وہ تیسری شادی کرنا چاہتا ہے اب پتہ ہے کس سے بھلا۔ اپنی اللہ رکھی سے۔“

”کیا؟“ عنایتیاں ہک بک رہ گئی۔

”ہاؤ..... عنایتیاں اور پتہ ہے وہ اس کے عوض پورے پچاس ہزار روپے دے گا۔ پچیس ہزار..... رام کو دے کر قرضے سے اپنی گردن چھڑائیں گے اور پچیس کے باقی جیب میں۔ کیسا؟“ سوڈھل نے کمینے پن سے ہنستے ہوئے کہا اور عنایتیاں کی آنکھوں میں بھی حریصانہ چمک عود کر آئی۔ لہذا وہ بھی کمینے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

”واہ رے سائیں..... ہمارے تو پورا رہ گئے۔“

”اسی لیے تو کہتا ہوں ڈی..... اللہ رکھی پر ابھی ہاتھ اپنا ذرا ہلکا رکھ۔“ سوڈھل معنی

خیز لہجے میں بولا۔

”ہاں..... سوڈھل ایک بات اور بتا، وہ تو نے اللہ رکھی کے باپ کے مکان کا کیا کیا اسے بچ کیوں نہیں دیتا۔ وہاں سے بھی پیسے آجائیں گے چار۔“ عنایتیاں نے جیسے کچھ یاد

دلاتے ہوئے اپنے شوہر کو گرفتار تجویز سے نوازا۔

اس کی بات سن کر سوڈھل مکاری سے اپنی دودھیابھنوں کو سکیتڑتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”ہاؤ ڈی..... جلدی اچھی نہیں ہوتی ٹھنڈا کر کے کھا اور پتہ ہے شادی کا سارا خرچ پاڑیں بھی دودا خان ہی کرے گا، لیکن میں ذرا بہانے سے اللہ رکھی سے اس بات کا ذکر کر ڈالوں گا کہ اس کی شادی کے لئے اس کے باپ کا مکان بیچنا پڑے گا بیلوں کو پہلے ہی میں اپنے قبضے میں کر چکا ہوں۔“

”پر سوڈھل..... اللہ رکھی دودے خان سے مان جائے گی شادی پر۔ میرا مطلب ہے اس کی عمر بھی تو۔“ عنایتیاں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ کیونکہ سوڈھل نے فوراً اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”اڑی چپ ڈی! بھلا مرد اور گھوڑے کی عمر کا کیا۔ باقی رہی بات اللہ رکھی کی..... تو اس کی فکر نہ کروہ بالکل اللہ میاں کی گائے ہے۔ وہ انکار نہیں کر سکے گی۔“

عنایتیاں شوہر کی بات پر مکارانہ انداز میں سر کو تقبیہ جنبش دینے لگی۔ ”اچھا سوڈھل..... یہ سارا کچھ کب تک ہو جائے گا..... میں تو بیزار سی ہو گئی ہوں اس غربت ماری زندگی سے۔“

”بس..... اب ہمارے دن پھرنے والے ہیں۔ ذرا بھائی مٹھل کا چالیسواں گزرنے دے۔ قبر کی مٹی سوکھے..... ورنہ پورا گوٹھ نہ صرف تھوکرے گا ہم پر بلکہ بلکہ۔“ دفعۃً وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور عنایتیاں نے دیکھا سوڈھل کی تنگ سی پیشانی پر باوجود سردی کے پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ وہ حیرت سے اس کو بوکھلایا ہوا چہرہ تنگ لگی۔ پھر سوڈھل کو جانے بیٹھے بیٹھے کیا ہوا۔ وہ ایک دم اپنی جھلنگ سی چار پائی سے اٹھا اور بوسیدہ سی ٹوپی اور اجرک سنبھالتے ہوئے درشت لہجے میں بیوی سے بولا۔ ”چل اٹھ اب جا..... ساری باتیں ایک دم نہ اگلو الیا کر..... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کچے گارے مٹی کے کمرے سے نکل گیا۔

اس کا رخ گوٹھ کے اکلوتے چھپر ہوٹل کی طرف تھا۔ بل کھاتی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ہنوز اپنی بیوی عنایتیاں کو دل ہی دل میں کو سے جارہا تھا کم بخت..... کسی دن میرے منہ سے اگلو کر ہی چھوڑے گی بے دھیانی میں کہ..... اپنے بیمار بھائی مٹھل کو میں نے گلا دبوچ کر مارا ہے۔ ورنہ..... وہ تو ویسے بھی مر رہا تھا۔ اس نے جیسے اپنے آپ کو تسلی دی۔ چھپر ہوٹل نزدیک آ رہا تھا دور مغرب میں آسمان نارنجی رنگ کا ہو رہا تھا۔



☆=====☆=====☆

گارے مٹی اور کہیں کہیں پختہ انیوں سے بنی اس قدیم طرز تعمیر کی حامل حویلی نما عمارت سے ملحقہ ایک کشادہ سی اوطاق میں گوٹھ جاگیر داد پور کا وڈیرا میر لکھ میر خان اپنی بھاری بھر کم شخصیت کے ساتھ، سرکنڈوں کے بنے ایک خاصے اونچے موٹھ سے پر براجمان اپنے سامنے پختہ فرش پر آلتی پالتی مارے ہاتھ جوڑے مفلوک الحال ہاریوں کی جانب، رعونت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہاں جتنے بھی بیٹھے تھے وہ سب وڈیرے میر لکھ میر خان کی زمینوں پر ”رہاکی“ کرتے تھے۔ وڈیرے کے داہنی جانب مصاحب خاص المعروف منشی میرل منکن ہار..... بڑے مستعد انداز میں کھڑا تھا۔ وہ سیاہ رنگت کا خاصا جاندار مگر پست قامت شخص تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں ایک موٹا رجسٹر تھام رکھا تھا۔ باقی دیگر خدمت گار اور چاکر وغیرہ بھی وڈیرے کے عقب میں مؤدبانہ کھڑے تھے۔

دفعۃً وڈیرے میر لکھ میر خان کی گونجی آواز ابھری۔ اس نے اپنے سامنے بیٹھے ایک ہاری کو مخاطب کیا۔

”اڑے..... موگو کیا بات ہے بابا..... اس بار تو نے چاولوں کی فصل بڑی دیر سے دی ہے۔ تجھے پتہ نہیں ہے اڑے کہ بیوپاری کو دیر سے فصل پہنچاؤ تو وہ غرے کرتے ہیں اور سستا بھاؤ لگاتے ہیں۔“

موگو نامی ایک کمزور سا کسان میلی کچلی صدری اور تہ بند میں ملبوس ذرا آگے سرکا اور ہاتھ اپنے جوڑتے ہوئے ملتجیانہ لہجے میں بولا۔ ”سس..... سائیں بھوتار..... اس میں ہمارا کوئی دوش نہیں۔ اس کی وجہ خشک سالی اور پانی کی کمی ہے سائیں اور جب پانی نہروں میں آیا تو وارے بندی سے ملنے لگا اسی لیے سائیں فصل اترنے میں دیر۔“

”اچھا ہل بابا ہل..... بکواس چھوڑ اپنی اب..... یہ بتا کہ تجھے کتنی زمین ملی ہوئی ہے رہاکی کے لئے؟“ وڈیرے نے اس کی بات کاٹتے ہوئے نخوت سے کہا۔

”سائیں وڈا..... بب..... بیس جریب (دس ایکڑ)۔“ موگو نے مختصر کہا۔

”ہونہہ۔“ وڈیرے نے ہنکارا بھرا پھر اپنے معتد خاص جونی میری کے فرائض بھی سرانجام دیتا تھا میرل منکن ہار کو مخاطب کیا۔

”اڑے بابا..... میرل۔“

”حاضر سائیں وڈا۔“ وہ مستعدی سے یکدم بولا۔

”بابا اس موگو نے کتنے من چاول دیئے ہیں۔“

وڈیرے کی بات پر میرل نے جھٹ سے رجسٹر کھولا کان میں انکی ہوئی پنسل نکالی۔ پھر چند لمحے رجسٹر پر نظریں جمائے بولا۔ ”سائیں وڈا چار سو بوریاں دی ہیں۔“

”کیا؟ بیس جریب پر صرف چار سو من۔“ وڈیرا خشکیں حیرت سے بولا اور موگو کو پھر غصے سے تکتے لگا۔ اس بے چارے نے فوراً اپنی گردن جھکا دی۔

”اور کھا دس کی تھی؟“ وڈیرے نے دوبارہ منشی میرل سے پوچھا۔

”سائیں وڈا کھا دساری ہماری تھی۔“ منشی میرل اپنی نظریں رجسٹر پر گاڑتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

”ہوں۔“ وڈیرے نے دوبارہ مخصوص انداز میں ہنکارا بھرا۔

”اچھا بابا..... چنگا..... موگو کو پھر چاولوں میں سے تیسرا حصہ دے دے لگ بھگ ایک سو ساڑھے تینتیس من۔“ وڈیرے کی بات پر بے چارہ موگو اتنا کم حصہ ملنے کی وجہ سے تاسف آمیز حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ وہ تو آدھے حصے یعنی پوری دو سو بوریوں کی آس لگائے بیٹھا تھا جو اصولی طور پر اس کا حق بھی تھا۔ تاہم وہ چپ نہ رہ سکا اور احتجاجا بولا۔

”سس..... سائیں بھوتار..... اتنا غضب نہ کرو ہم گریبوں پر..... سخت گرمیوں کی تپتی دھوپ میں ہم نے اپنے معصوم بچوں اور کمزور عورتوں کو لے کر بوائی اور پھر کٹائی کی۔ آخر کو آدھا فصل پر ہمارا بھی حق ہے سائیں بھوتار۔“

اس کی داد فریاد پر وڈیرا لکھ میر خان یکدم چراغ پا ہو گیا اور آنکھیں پھاڑتے ہوئے گھور کر موگو ہاری سے کراخت لہجے میں بولا۔

”اڑے تو کھا د بھی ہماری ہی تھی اور جو تو نے اتنی دیر میں فصل دی ہمیں تو کیا سمجھتا ہے کہ منڈی میں اب مہنگے داموں جائیں گے ہمارے چاول..... اڑے بابا ہمیں تو مول بھی ملنے کی امید نہیں ہے۔“ وڈیرا چند ٹانے تھما۔ پھر جیسے قطعیت سے بولا۔ ”بابا پھر تیری مرضی ہے..... میں دوسرے لوگ تلاش کر لوں گا۔ گوٹھ بھرا پڑا ہے میرے آدمیوں سے۔“

موگو غریب بے چارہ وڈیرے کی بات پر لرز اٹھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے وڈیرے کی ”رہاکی“ سے انکار کر دیا تو بھوکوں مر جائے گا۔ دوسرے اس کا گوٹھ میں بھی رہنا دھبہ کر دیا جائے گا۔ لہذا اس نے اپنے ہاتھ جوڑ کر تقریباً گڑ گڑاتے ہوئے کہا۔

”سائیں وڈا..... ہم آپ کے پرانے نمک خوار ہیں۔ آپ جتنا حصہ دو ہمیں قبول ہے سائیں..... ہمیں قبول ہے۔“ اس کے لہجے میں بے بسی اتر آئی تھی۔

اس کی بات پر وڈیرے میر لکھ میر خان کے تیور بھی ذرا نرم پڑ گئے اور وہ معتدل لہجے

میں موگو ہاری سے بولا۔ ”اڑے بابا..... تجھے ہم نے مزدوروں کی سہولت بھی تو دے رکھی ہے۔ پھر کیوں اپنے کنب کو خوار کرتا ہے۔ بابا ایک گھنٹے کی بوائی پر پانچ روپے ہمارا ذمہ ہے اب تم بولتا ہے کہ یہ بھی ہماری جیب میں جائے تو پھر۔“ اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

شاید اسے غریب موگو کی مسکین صورت دیکھ کر خود اپنی بات کی منافقت کا اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ خسرت زدہ لوگ بھلا اپنی جگہ کسی کو مزدور رکھنے کی عیاشی کے متحمل کس طرح ہو سکتے تھے۔ ادھر موگو بے چارہ خاموش رہا۔ وہ شاید اپنی مجبوری و ڈیرے کو کبھی نہیں سمجھا سکتا تھا کہ جس گھر میں بیمار ماں باپ کے علاوہ جوان جہان اولادیں بھی ہوں اور غربت نے ڈیرے ڈال رکھے ہوں اور ایسے میں اپنے کنبے سمیت تپتی دھوپ اور خون جلاتی گرمیوں میں وڈیرے کی بیس جریب (دس ایکڑ) زمین کا سینہ چیر کر اپنا خون پسینہ پلانے کے بعد آدھے کے بجائے تیسرا حصہ ملتا ہو۔ اتنی محنت شاقہ کے بعد اس طے والے تیسرے حصے..... یعنی ایک سو ساڑھے تینتیس من بوریوں میں سے بھی آدھا حصہ اس کے بھائی پریل کو جاتا ہو اور یوں صرف اسے لگ بھگ چھیاٹھ بوریوں کو فروخت کر کے ٹیکس بھی خود بھرنا پڑے اور انہی میں سے ایک بڑی رقم وڈیرے میر لکھ میر خان کو کھاد کی ادائیگی کے سلسلے میں جائے تو ایسے میں بھلا یہ لوگ خود اپنی روزی پرلات مارتے ہوئے پٹے پرلی ہوئی وڈیرے کی چند جریب زمین پر بھاری مزدوروں کو کیونکر رکھ سکتے تھے۔

یہی پانچ روپے فی مزدور پر تین گھنٹے کے حساب سے تیس روپے بچیں تو اس رقم سے کئی مسائل حل ہو سکتے تھے۔ اسی اثناء میں وڈیرا لکھ میر خان دوسرے ہاری سے مخاطب ہوا۔ یہ سوڈھل تھا۔

”ہاں بابا..... سوڈھل..... یہ میرل تیرا تارہا تھا کہ تو پٹے پر کچھ جریب ”رہا کی“ کے واسطے زمین اور لینا چاہتا ہے ہم سے۔ خیر تو ہے کیا دوسری شادی کر لی ہے تو نے۔ دوسری بیوی کو بھی کھیت میں جوتے گا۔“

”ناسائیں وڈانا..... دوسری اب اس نے کیا کرنی ہے۔ وہ تھاناں سائیں..... مٹھل بے چارہ مر گیا اس کی ایک ہی دھی تھی۔ اللہ رکھی، وہ اب اسی کے گھر آگئی ہے۔ پورا گھر اس نے آتے ہی سنبھال لیا ہے۔ اب دو چار جریب زمین بھی سنبھال لے گی تو کیا قیامت آجائے گی۔“ منشی میرل رجسٹر کو بغل میں داب اور پمبل اپنے کان میں اٹکاتے ہوئے اپنی معلومات وڈیرے کے سامنے پیش کرتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا۔ ادھر

سوڈھل..... اپنی ترجمانی منشی میرل کی زبان سے ہوتی دیکھ کر اپنی بانجھیں پھیلائے احمقانہ انداز میں کھی..... کھی کرنے لگا۔

”ہالا بابا..... میرل! پھر دے دے اسے انگوٹھا لگوا کر جتنی جریب زمین مانگے رہا کی کے واسطے۔“ وڈیرے لکھ میر خان نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ پھر تیسرے ہاری کو سر کے اشارے سے سامنے آنے کو کہا۔

☆=====☆=====☆

”یہ کیا بابا سائیں! اتنی محنت کی سب نے، تو نے، مان نے ادی ہدایتاں نے اور اس کا معاوضہ بھوتار سائیں نے اتنا کم دیا۔“ موگو ہاری تھکا مارا گھر اپنے لونا تو جوان بیٹے ساون سے ہی نہیں بلکہ سب گھر والوں سے نظریں چراتا ہوا محن میں بچھی کھری چار پائی پر ڈھے سا گیا۔ اس کے چار پائی پر گرتے ہی ساون نے باپ سے وڈیرے کی اوطاق میں بٹائی کے بارے میں پوچھا تھا اور جب اسے یہ پتہ چلا کہ وڈیرے لکھ میر خان نے اس بار بھی انہیں ان کی محنت کا صلہ بہت کم دیا ہے تو حیرت اور غصے سے اپنے باپ سے بولا تھا۔ بیٹے کی بات پر موگو نے اپنے سر سے ٹوپی اتاری اور دانت بھینچنے کے انداز میں اسے سرزنش کرتے ہوئے بولا۔

”ڑے آہستہ بات کر ہمارے مکان کی دیواریں چھوٹی ہیں کہیں باہر وڈیرے کے کسی آدمی یا چچے نے سن لیا تو۔“

”تو کیا..... بگاڑ لے گا وڈیرا ہمارا..... بابا سائیں..... اپنے حق کے لیے بھی نہ بولیں تو لعنت ہے ایسی حیاتی پر۔ ہونہہ۔“ تئیس چوبیس کے سن کا گھبرو جوان ساون غصے سے اپنا پاؤں پٹختا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔

پورے گھر میں ایک وہی کڑیل جوان تھا۔ جس سے اس کا باپ موگو ماں اور جوان بہن ہدایتاں، بری طرح خائف رہتے تھے۔ اس لیے کہ کہیں اس کی وڈیرے میر لکھ میر خان سے برشتگی کی خبر حویلی تک نہ پہنچ جائے۔ ورنہ..... ورنہ..... یہ سوچ کر ان کا معصوم سا کمزور دل ہول سا جاتا تھا کیونکہ وہ پیر بخش کے بیٹے خیر بخش کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ بلکہ پورے گھوٹ کے لوگوں نے دیکھا تھا۔ جس نے بٹائی کے سلسلے میں وڈیرے میر لکھ میر خان کے آگے اڑنے کی کوشش کی تھی اور آج تک اس کا پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ کہاں گیا۔ زمین کھا گئی یا آسمان نے نگل لیا مگر جاننے والے جانتے تھے کہ بے چارے پیر بخش کے بیٹے خیر بخش کو وہاں دھکیل دیا گیا تھا جہاں سے کوئی واپس نہیں لوٹتا۔

اس کی چچا زاد سورتھ جو اکثر اس کے انتظار میں رہتی تھی وہ اب بڑی شوخ نگاہوں سے ساون کا راستہ روکے، اسے نکلے جا رہی تھی۔ اس وقت خنکی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا اور سرمئی سرمئی سا اندھیرا گوٹھ پر چھانا شروع ہو گیا تھا۔

”دیکھ سورتھ! یوں اچانک میرے راستے میں نہ آیا کر..... کسی دن بری طرح لتاڑ کر رکھ دوں گا..... کبھی..... ہٹ جا پرے.....“ ساون اس کی جانب دیکھتے ہوئے قدرے جارحانہ لہجے میں بولا۔

”اسی لئے تو تیرے آگے آتی ہوں۔“ جواں سال اور شوخ و شنگ سورتھ نے ایک ٹھنڈی آہ بھرنے کے انداز میں اور اپنی آنکھوں میں عجیب سا نشہ اتارتے ہوئے کہا..... اسے ساون کے جارحانہ لہجے نے گھائل کر دیا تھا..... جسمانی نہیں بلکہ ذہنی طور پر..... جہاں دل ہوتا ہے..... جس میں ان گنت نا آسودہ خواہشوں اور جذباتوں کی چنگاریاں سی دبی ہوئی ہوتی ہیں۔

ساون اکثر سورتھ کے اس بے باکانہ طرزِ مخاطب پر ایک لمحے کو انگشت بدنداں رہ جاتا تھا۔ وہ اسے اس گوٹھ کی لگتی ہی نہیں تھی..... کم از کم گوٹھ کی الہڑچھو کر یوں کے ایسے پنچھن نہیں ہوتے..... ”یہ..... یہ تو شہر کی چھو کری دکھائی پڑتی ہے۔“ وہ ایک لمحے کو دانت پیس کر اندر ہی سورتھ پر تبصرہ کر ڈالتا۔

وہ اپنا راستہ بدلتے ہوئے خاموشی سے آگے بڑھنے لگا تو اسے عقب سے سورتھ کی افسوس زدہ سی آواز سنائی دی..... ”رے ساون! تو بتاتا کیوں نہیں..... کسے چاہتا ہے آخر تو اتنا جو مجھ جیسی کو ہر بار یوں ٹھکرا کر چل دیتا ہے۔“

ساون کے چلتے چلتے قدم جیسے زمین نے پکڑ لئے..... وہ رک تو گیا مگر پیچھے سورتھ کی طرف نہیں گھوما جو ہنوز اپنی ہی ترنگ میں بولتی ہوئی اس کے قریب آتی جا رہی تھی۔

”میں تیری کھاتر روز روز اتنی محنت کر کے سنورتی ہوں..... اور..... اور..... یہ..... دیکھ۔“ وہ ساون کے دوبارہ سامنے آتے ہوئے اپنی کس کر باندھی ہوئی دونوں چوٹیاں دکھاتی، جن میں رنگین جھلم اور چھنچھناتے ہوئے پراندے ڈالے ہوئے ہوتے تھے۔

”اتنی کسوا کر یہ دونوں چوٹیاں بندھواتی ہوں کہ میری آنکھوں سے آنسو تک نکل آتے ہیں..... پر تو ہے کہ.....“ اس کے لہجے میں رقت سی اتر آتی۔

ساون اسے پھر بغور دیکھنے لگتا..... کہہ تو وہ درست رہی تھی..... اس کی جج و جج اگر چہ دیہاتی ہی انداز کی تھی مگر لگتا ہی تھا کہ وہ اپنے اسی دیہاتی طرز کے سولہ نگہار میں کم

اس واقعے کو کافی سال بیت چکے تھے۔ ماں باپ دونوں اس کے اپنے جوان جہاں بیٹے کی گمشدگی پر پاگل ہوئے گوٹھ گوٹھ بستی بستی آج تک بے چارے در بدر ہوتے نظر آ جاتے تھے۔ گوٹھ کے سادالوح اور مصوم لوگ ان کی حالت پر آج بھی لرز اٹھتے تھے اور کمزور دل کی دیہاتن مائیں تو فوراً اپنے جوان بیٹوں کی بلائیں لینا شروع کر دیتی تھیں۔ اگر کبھی ان کے لخت جگر حویلی کے بارے میں کوئی ایسی ویسی باتیں منہ بے نکالتے۔

”ساون کے ابا مجھے تو ڈر لگتا ہے تجھے ابھی ساون بیٹے کو یہ بتانا چاہئے تھا۔ جا اس کے پیچھے کہیں وہ وڈیرے سائیں کے آدمیوں سے نہ منہ ماری کر لے۔“ ساون کے غصے سے گھر سے نکلتے ہی اس کی ماں نے اپنے شوہر موگو سے ازراہ تشویش کہا۔

”بابا..... میں کہتی ہوں ساون کو کام پر نہ لے جایا کرو وڈیرے کی زمین پر اسے اس حساب کتاب کی بے انصافی سے دور ہی رکھ تو اچھا ہے۔“ ایک پرانی سی بوسیدہ اجرک کی چادر اوڑھے ساون سے ایک سال چھوٹی بہن ہدایتاں نے بھی اپنے باپ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ اس نے سرخ رنگ کی کڑھائی والے گلے کی قمیض پہن رکھی تھی جبکہ شلوار کا رنگ میٹالا سا تھا۔ بے چارہ موگو کھری چار پائی پر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھا تھا۔

☆=====☆=====☆

اس بار ساون نے تہیہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے وہ حویلی جا کر وڈیرے سے ضروریات کرے گا اور اپنا پورا حق لے کر لوٹے گا۔ اس وقت شام کے سائے جھکنا شروع ہو گئے تھے چونکہ گرمیوں کی شام تھی اسی لیے ابھی گوٹھ کے چار سو افق پر روشنی سی پھیلی ہوئی تھی۔

ساون کاندھوں پر اجرک ڈالے منگ اور چاولوں کے کھیتوں کے درمیانی کچے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ وہ ایک جوشیلا نو جوان تھا رنگت اس کی قدرے سانولی اور چہرے کے نقوش خالصتاً دیہاتی تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور چمکدار تھیں جسامت خاصی کسرتی تھی تاہم اس کی مجموعی شخصیت میں ایسی ایک خاص کشش تھی جو صنف نازک کو خاص طور پر اپنی جانب کسی غیر مرئی دُور کے ذریعے کھینچنے کی قوت رکھتی تھی۔ مگر اس وقت غم و غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ ایک نہنگ کے درخت کے قریب سے گزرنے لگا، اچانک درخت کے عقب سے وہ پراسرار سی اپرا اپنی تمام تر حشر ستانیوں کے ساتھ ”چھم“ سے اس کے سامنے آگئی اور ساون اسے دیکھتے ہی ٹھٹک کر رک گیا..... وہ سورتھ تھی۔

از کم آدھادن ضرور گنوا دیتی ہوگی، لیکن باوجود اس کے ساون کو اس کے سرفنی پاؤڈر سے تھپے ہوئے چہرے پر وہ بات ذرا بھی نظر نہ آئی جو..... اس سے آگے اس کا دل خود ہی کسی قسم کے تبصرے سے گریز کرنے لگتا۔

وہ پھر اپنا سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا..... اور سوڑھ..... اس بار اپنی جگہ کھڑی ساون کو جاتے ہوئے سختی رہ گئی..... اس کے چمکیلے چہرے پر ٹھکرائے جانے کا تذکرہ آتا تھا۔  
ساون تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا بالآخر وڈیرے لکھ میر کی اوطاق میں پہنچا..... تو اس وقت وڈیرا لکھ میر خان موجود نہ تھا..... تاہم اسے وہاں اس کا منشی میرل منکن ہارمل گیا۔

”بھوتار سائیں نے میرے بابا کو فصل میں سے صرف تیسرا حصہ کیوں دیا ہے..... ہم کو تو آدھوادھ ملنا چاہئے تھا..... ساری محنت ہم بھوگتے ہیں۔“

ساون اپنے کا ندھوں سے اجرک اتار کر دوبارہ کا ندھے پر دھرتے ہوئے قدرے تیز لہجے میں بولا، تو منشی میرل ہی نہیں بلکہ وہاں موجود دیگر حویلی کے چاکر اور خدمت گار بھی ساون کی جرات رندانہ پردنگ رہ گئے تھے۔ تاہم منشی میرل تیکھی نظروں سے ساون کے جوش میں بھرے ہوئے چہرے کی طرف ہلکتا رہا پھر اس کے ذرا قریب آ کر کڑک دار لہجے میں بولا۔ ”ڑے ساون! اپنی اوقات میں رہ گم بات کر..... تو ہمارا ”رہاک“ ہے۔“  
”اجارہ دار“ بننے کی کوشش مت کر.....“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اٹائے راہ ساون کا مجہول و مدقوق سا باپ موگو بھی پھولی ہوئی سانسوں کی ڈور پر قابو پاتا وہاں آن پہنچا۔ اس کے پیروں میں جوتیاں بھی نہ تھیں۔ صرف بوسیدہ سی تہبند اور میلی سی کمری پر سردی سے بچاؤ کے لیے پھٹی پرانی بوری ادھیڑ کر چادر کی طرح لپیٹ رکھی تھی۔ لگتا تھا وہ اپنے بیٹے ساون کا پیچھا کرتا بھاگتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔

باپ کو اچانک وہاں دیکھ کر ساون خفت سی محسوس ہونے لگی۔

”اچھا ہوا تو آگیا موگو..... لے جا پڑیں اس جیوٹ پٹ ساون نوں..... اور سمجھا اسے ہر ”جگہ“ برسنے والی نہیں ہوتی ہے۔“ منشی میرل نے موگو کو مخاطب کرتے ہوئے سراسر اتے لہجے میں کہا۔ اس کی تیز نظریں ہنوز ساون کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

موگو فوراً منشی میرل کی بات کی تہہ تک پہنچ گیا لہذا ہاتھ جوڑتے ہوئے التجائیہ لہجے میں بولا۔ ”مم..... منشی سائیں، چھو کر اہے..... بچہ ہے..... اسے ماپھ کر دے..... اس نے جو کہا..... میں اس کی آپ سے ماپھی مانگ لیتا ہوں پر، پر سائیں بھوتار وڈے کو اس بات

کا پتہ نہ لگے کہ میڈا پٹ ساون ہتھے آیا تھا۔“

ساون کو باپ کے انداز چاکری پر خفت سی محسوس ہونے لگی اس نے کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولنا چاہا تھا کہ موگو نے اسے فوراً جھڑکتے ہوئے کہا..... ”چل چپ ہو جا..... تو جا گھر اس طرح یہاں اوطاق میں نہیں آتے..... وہ تو منشی صائب اپنا آدمی ہے یہ بات بھوتار سائیں وڈے..... تک نہیں جائے گی..... ورنہ بھوتار سائیں بھی ناراج ہو گیا تو ہماری کھیر نہیں ہووے گی۔ چل..... جا گھر..... بھاگ۔“ موگو معصومانہ انداز میں یوں بولا جیسے ساون پانچ چھ سال کا ایک نادان بچہ ہو..... ساون خود کو اب بری طرح جھل سا محسوس کرنے لگا اور اس کی آنکھوں میں درشتگی سی اتر آئی تھی اور وہ اپنے باپ کی طرف ایک لمحہ تیز نگاہوں سے دیکھتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اس کے اوطاق سے نکلنے ہی موگو ایک بار پھر اکڑے ہوئے کھڑے منشی میرل کے قریب آیا اور ہاتھ جوڑتے ہوئے گڑگڑانے والے انداز میں گویا ہوا۔ ”منشی سائیں! ایک بار پھر میری عرض گزارش ہے کہ بھوتار وڈیرے تک یہ بات نہ جائے..... تیری مہربانی ہو گی..... تو..... تو گزرتی نہ کرتیں بوریاں چاولوں کی میں کھدا اپنی کمر پر رکھ کر تیرے گھر دے جاؤں گا.....“ اس کی بات پر منشی میرل کی آنکھیں یکدم چمک اٹھیں اور اس کا لہجہ بھی ذرا نرم ہوا۔ لہذا وہ آہستگی سے اسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔

”دیکھ موگو..... میں تیرا سچا ہمدرد ہوں..... وڈیرے سائیں کے سامنے ہر وقت تیری سفارشی تعریفیں کرتا رہتا ہوں تاکہ تجھے زیادہ کام اور آسانی ملے، پر آپڑیں ساون کو بھی لگام دے کر رکھ..... اب بتا بھلا یہاں خود وڈیرا سائیں موجود ہوتا تو چھوڑتا تیرے بیٹے کو.....؟“ منشی کی بات پر موگو بے چارہ پُر تشویش انداز میں اپنا سر ہلانے لگا۔

☆=====☆=====☆

ادھر بے چاری اللہ رکھی چچا کے ہاں مشق ستم بنی شتم اپنی زندگی گزار رہی تھی وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ دن بدن اس پر کام کا بوجھ بڑھتا جا رہا ہے گھر کے سارے کام کاج سے لے کر دن میں دو بار نہر سے پانی کے تین تین گھڑے بھر کے لانے کے ساتھ اب اس کو کھیتوں میں بھی کام کرنا پڑتا تھا، اس وقت بھی وہ شام گئے نہر سے تین گھڑے پانی سے لبالب بھر کر لا رہی تھی۔ دو گھڑے سر پر رکھے ہوئے تھے جبکہ تیسرا گھڑا اس نے اپنی پچکیلی کمر کو خم دے کر اٹھا رکھا تھا۔ وہ تھکن سے چور چور ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے گورے گورے پاؤں جوتوں سے بے نیاز تھے..... وہ تین پانی سے بھرے گھڑوں کا بوجھ اپنی نازک اور

سر پر رکھوا دیئے..... دوسرا گھڑا سر پر رکھواتے وقت معاوہ ذرا سا چھلک گیا اور ساون کا جسم بھیگ گیا ایک بار پھر دونوں کی نظریں بہت قریب سے چارہوئیں اور اس بار دونوں کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کے دلوں میں اتر رہے ہوں..... چند ثانیے دونوں کو ایسے ہی گم سم گھڑے گزر گئے..... اللہ رکھی کو گھڑوں کا بوجھ اس انوکھی کیفیت کے دوران بالکل محسوس نہیں ہوا۔

پھر اللہ رکھی نے ہی محویت کے اس الفت آمیز سکوت کو توڑا..... ”تت..... تو بھی تو بھیگ گیا..... تجھے جو سردی لگ جائے تو۔“

اس کی بات پر ساون چونک کر ذرا دور ہو گیا..... اس اتفاقی نزدیکی کے بیچ معاوہ فاصلہ آیا تو خرد نے ساون کو جیسے محتاط سا کر دیا..... دراصل وہ خود بڑا لے دیئے رہنے والا شخص تھا..... تاہم اللہ رکھی کی بات پر پہلی بار ہولے سے مسکرا کر بولا..... ”میری خیر ہے..... جس کے جسم میں ہر وقت سر سے لے کر پاؤں تک گرم لہو آگ بن کر دوڑ رہا ہو..... بھلا یہ چند پانی کے چھینٹے کیا بگاڑ لیں گے اس کا..... جا اب تو۔“ اس کا لہجہ ایک ایسی آتشیں ہو گیا تھا جس کی پیش اللہ رکھی کو بھی محسوس ہوئی تھی..... ساون آگے بڑھ چکا تھا..... مگر اللہ رکھی وہیں گھڑے گھڑے کہیں اور پہنچ چکی تھی۔ بالکل الگ دنیا میں..... باپ کے مرنے کے بعد زندگی میں جس قدر کنکھائیاں وہ اب تک جھیلی آئی تھی..... ایک اجنبی جوان کے محض چند ہمدردانہ بول نے اس اذیت ناک لمحوں کے دیئے ہوئے زخموں پر مرہم کا کام کیا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ کسی کی تکلیف کا ایسا ہمدردانہ احساس تو کوئی اپنا ہی کر سکتا ہے مگر..... مگر یہ نو جوان تو ایک اجنبی تھا..... اس کا چہرہ سرخ سا ہونے لگا، جسم کے گرد اوڑھی ہوئی بلکہ اجنبی نو جوان کے ہاتھوں اڑھائی گئی..... وہ چادر اللہ رکھی کو یوں محسوس ہونے لگی جیسے وہ نو جوان اس کے گیلے شریں سے قریب ہو۔

اس نے یک دم گھبرا کر اپنے قدم آگے بڑھا دیئے..... وہ گھر پہنچی تو چاچی عنایتاں جیسے ادھار کھائے بیٹھی تھی لگی لے لینے۔

”ڑی چھوری! ادھر آ..... ذرا..... اتنی دیر لگا دی تو نے..... رات سر پر آنے کو ہے۔ باقی کا کام کیا تیرا باپ کرے گا قبر سے نکل کر.....“ چاچی عنایتاں کا سخت لہجہ اللہ رکھی کو اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیتا..... اپنے مرحوم باپ کے طعنے پر وہ کلس کر رہ جاتی بے چاری..... تاہم وہ صبر کے گھونٹ بھرتے ہوئے خاموشی سے بوسیدہ اور کچے صحن کے ایک کونے میں رکھی لکڑی کی گھڑونچی کے قریب آئی اور اپنے سر سے گھڑے اتار کر اس پر رکھنے

کمزور جان پر سہارے بھر بھری زمین پر بہ مشکل چل رہی تھی..... وجہ بھر بھری مٹی میں چپے ہوئے وہ جھاڑی دار کانٹے تھے جنہوں نے اس کے ننگے پیروں کو بری طرح زخمی کر دیا تھا اور نتیجتاً وہ تکلیف سے دہری ہو گئی تھی اور پانی سے لبالب بھرے ہوئے تینوں گھڑے نیچے آ رہے..... جنہیں وہ دوبارہ منہر کے کنارے بھرنے کے لیے لوٹی تھی..... گھڑے سر سے پھسلنے کی وجہ سے اس کے کپڑے بھی گیلے ہو کر اس کے بدن کے ساتھ چپک کر مشکل کا باعث بن رہے تھے..... گیلے ہونے کی وجہ سے اللہ رکھی کو ٹھنڈ بھی لگ رہی تھی اور پاؤں میں کانٹوں کی جھین آئیز تکلیف اس پر سوا تھی، وہ بمشکل تیز تیز قدموں سے کچی گنڈنڈی پر چلی جا رہی تھی۔

معا سائے سے اسے کوئی تیز تیز آتا ہوا دکھائی دیا..... اللہ رکھی جلدی سے کچے راستے کے دوسرے کنارے کی طرف ہو گئی..... تاہم اس کی محتاط نگاہیں سامنے سے آتے ہوئے اس شخص پر جمی ہوئی تھیں جس کی شبیہ اب مدہم روشنی میں واضح ہونا شروع ہو گئی تھی وہ ساون تھا..... جو اللہ رکھی کو دیکھ کر اور اس کے قریب پہنچتے ہی رک گیا..... جانے کیا ہوا کہ اللہ رکھی بھی اسے دیکھ کر رک گئی..... دونوں کی نگاہیں چارہوئیں..... پھر یوں ہوا کہ ساون نے ایک نظر اللہ رکھی کے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے پھیکے بدن پر ڈالی۔ اس کے بعد اس نے فوراً اپنے اوپر اوڑھی ہوئی موٹی سی سرمئی رنگ کی چادر اتار کر اس کی جانب بڑھائی اور قدرے اکھڑ لہجے میں بولا..... ”ڑی چھو کر تیرے پاس اگر اپنا بدن ڈھاپنے کے لیے چادر نہیں ہے تو پھر اتنا گھٹا کیوں کرتی ہے تو خود کہ..... لے یہ اوڑھ لے۔“

اللہ رکھی یک دم کبھی ساون کو کبھی اس کی اپنی جانب بڑھائی ہوئی چادر کو تنکے لگی..... اسے ساون کے اکھڑ لہجے میں ایک جوش اور اپنائیت محسوس ہوئی تھی..... جانے پھر کیا ہوا کہ اللہ رکھی کی آنکھوں میں آنسو جھللا گئے جو ساون کی نظروں سے چپے نہ رہ سکے وہ ذرا بوکھلا سا گیا، وہ سمجھا شاید اس نے لڑکی کے ساتھ ذرا زیادتی کر دی ہے لہذا فوراً اپنے دونوں ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس کے سر پر رکھے گھڑوں کا بوجھ لینے کی غرض سے ذرا معتدل لہجے میں بولا..... ”لا..... ڑی..... رومت..... گھڑے مجھے پکڑا دے اور تو یہ چادر اوڑھ لے..... ٹھنڈ بھی ہے اور یوں تیرا بھیگنا اچھا بھی نہیں..... لا..... شاباش.....“ اس نے اپنائیت سے کہا تو بے اختیار اللہ رکھی نے اپنی نگاہیں نیچے کر لیں..... ساون نے اس کا اقرار سمجھتے ہوئے آگے بڑھا۔ اس کے سر سے دونوں گھڑے اتار کر زمین پر رکھ دیئے پھر اسے اچھی طرح سے چادر اڑھانے کے بعد دوبارہ دونوں گھڑے باری باری اس کے

لگی..... ادھر چاچی عنایتاں کی گھاگ نگاہیں اللہ رکھی کے سراپے کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں..... اس کی بدلی بدلی کیفیت چاچی عنایتاں سے چھپی نہ رہ سکتی تھی اس پر سواوہ سرمئی رنگت کی چادر تھی۔

”اڑی..... ذرا ادھر تو آ.....“ معاً چاچی عنایتاں نے سرسراتے لہجے میں اسے اپنی چارپائی کے قریب بلایا۔ اللہ رکھی جھجکتے ہوئے قریب آئی۔

”یہ..... چادر تیرے کون سے یار نے دی ہے تجھے.....“ عنایتاں چاچی قدرے گہرے لہجے میں اس سے بولی۔ اس کی بات پر اللہ رکھی کے گھبرائے ہوئے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے، لیکن جب وہ بولی تو اس کا لہجہ حیرت انگیز طور پر کھرا اور سچا تھا۔

”چاچی..... میں راستے میں آ رہی تھی کوئی لڑکا ملتا تھا..... اس نے اپنی یہ چادر اتار کر مجھے اڑھادی تھی..... کیونکہ نہر سے پانی بھرتے ہوئے میں بھگ گئی تھی.....“ اتنا بتا کر اللہ رکھی نے اپنا سر جھکا لیا۔

چاچی عنایتاں۔ کے چہرے پر پہلے تو اپنی سیدھی سادی بھتیجی کی صاف گوئی پر حیرت کے ڈونگرے برسنے لگے..... پھر وہ نوشکی کے سے انداز میں اپنا ہاتھ نچاتے ہوئے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے بولی۔ ”ہائے ڈی..... میں قربان جاؤں، صدقے جاؤں..... تیری اس کسی پنوں والی کہانی پر..... ڈی اس اپنے پنوں..... کا نام تو بتاناں..... ذرا.....“

اللہ رکھی بے چاری شیشا سی گئی..... چاچی کے منہ سے کسی پنوں..... کا نام سن کر وہ ایک لمحے کو چونکی تھی..... وہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی..... ہاں البتہ جب اس کا بابا سائیں زندہ تھا تو اس نے گوٹھ کے پرانی اور سالخورہ سی پیلے رنگ کی عمارت والے اسکول میں کھینچ کھانچ کر پانچ جماعتیں پڑھ ڈالی تھیں۔ اس زمانے میں اس نے کسی پنوں کی اور عمر ماروی کی لوک داستانیں پڑھی اور سن رکھی تھیں..... یہی وجہ تھی کہ جب چاچی نے اسے اور اجنبی نوجوان کے اس اتفاقی تعلق کو چاہے..... طنز یا تمسخرانہ ہی سہی تشبیہ دی تو یکبارگی اللہ رکھی..... کے اندر عجیب سی مسرت نے سر ابھارا تھا۔

”ڈی..... چھوری..... کہاں چلی گئی..... کدھر کھو گئی تو؟.....“ جہان دیدہ چاچی عنایتاں کی کھوجتی نگاہوں نے جیسے اللہ رکھی کے بدلتے چہرے کی مسرت آمیز کروٹوں کو بھانپتے ہوئے دوبارہ اور قدرے بلند آواز میں کہا تو اللہ رکھی جیسے زور سے چونک پڑی۔

”کک..... کیا..... مم..... میں..... کک..... کہیں نہیں گئی..... یہیں کھڑی ہوں۔“ بوکھلاہٹ میں اس کے ہونٹوں سے الفاظ جیسے پھسلے۔

”ہائے ڈی..... اماں..... گھوڑاڑے..... چھوری تو تجھے ہو کیا، گیا ہے.....“ یہ کہتے ہوئے چاچی عنایتاں اسے چھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے یک دم چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ رائی کا پہاڑ بنانے والی عورتوں میں سے تھی..... بے چاری اللہ رکھی..... بری طرح سہم کر چند قدم پیچھے ہٹ گئی..... اٹنائے راہ..... عنایتاں کا شوہر سوڈھل کھانسا ہوا اندر داخل ہوا..... اللہ رکھی نے ہولے سے سلام کیا..... سوڈھل نے بھی شفقت بکھیرتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا..... پھر جیسے دونوں کو ہی مخاطب کرتے ہوئے بولا..... ”یہ تم دونوں اتنی ٹھنڈ میں یہاں کیوں بیٹھے ہو..... اندر آ جاؤ.....“

”پہلے ذرا اپنی اس لاڈلی سدھوری کے کارنامے تو سن لے.....“ چاچی عنایتاں تند لہجے میں اپنے شوہر سے بولی۔

”ہاں..... ہاں سن لوں گا..... پر تو خواہ مخواہ میڈی دھی کے پیچھے نہیں پڑی رہا کر..... چل اندر تو آ جا.....“ سوڈھل قدرے بیزارگی کے ساتھ عنایتاں سے بولا اور کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

چاچی عنایتاں بھی اس کے پیچھے تیز چلتی ہوئی اندر آ گئی..... البتہ اللہ رکھی کو اس نے باہر صحن ہی میں کسی کلام پر لگا دیا..... کمرے میں آتے ہی جب اس نے اللہ رکھی کی شکایت کرنے کے لیے اپنا منہ کھولا تو سوڈھل نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا..... اور اسے سمجھاتے ہوئے بولا..... ”کیوں تو اپنی جان جلاتی ہے بلاوجہ..... تجھے سمجھایا بھی ہے میں نے کہ اسے زیادہ تنگ مت کر..... یہ سونے کی چڑیا ہے..... مھر سے اڑ جائے گی کسی دن..... تھوڑا صبر کر لے..... میں اس کا سودا..... دودا خان سے کرنے ہی والا ہوں۔“ اس کا لہجہ آخر میں سرگوشیا نہ ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے عنایتاں کے منہ سے ہاتھ بھی ہٹا لیا۔

”یہی تو تجھے بتانے لگی ہوں کہ جو کچھ کرنا ہے جلدی کر لے..... کم بخت پر جوانی بھی ایسی آئی ہے..... ایسا نہ ہو گوٹھ کے کسی چھوکرے کے ساتھ ہوا ہو جائے..... آج یہی کیس تو ہوا ہے اس کے ساتھ۔“ بیوی کی بات پر سوڈھل قدرے چونکا۔

”کیا ہوا ہے.....؟“

پھر مختصر اس نے اللہ رکھی کی صاف گوئی سے بتائی ہوئی بات اپنے شوہر کو سنا دی سوڈھل یہ سن کر ہنس پڑا بولا..... ”اڑی تو بھی کوئی چری مائی ہے، اللہ رکھی..... ایسینہیں ہے۔“

”ہاؤ..... ہاؤ..... اب ایسی بھی سستی ساوتری نہیں ہے وہ..... پتہ ہے تجھے یہ ساری رام کہانی اس نے بڑے لذت بھرے انداز میں مجھے سنائی ہے..... جیسے عمر ماروی یا کسی پنوں کی داستان سنارہی ہو.....“ سو ڈھل اس کی بات پر بدستور ہنستا رہا۔

☆=====☆=====☆

گرم لوہے پر گرنے والے پانی کے چھیننے ”شائیں“ کی آواز نکالتے ہیں..... ساون جیسے کڑیل اور گرم جوش نوجوان پر جب محبت کی پہلی پھوار پڑی تو بے اختیار دل سے اس کے ”ہائیں“ کی صدا بلند ہو گئی۔ وہ اپنے گھر کی طرف چلا جا رہا تھا..... لیکن اب پہلے کی طرح اس کی قدموں میں تیزی نہیں رہی تھی..... آہستگی اور دھیماپن آ گیا تھا اس کی چال میں کیونکہ اس کا دل کہیں اور ہی اٹک گیا تھا..... کہنے کو وہ اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا مگر پہنچ کہیں اور گیا تھا..... چلتے چلتے وہ سوچنے لگا..... ایسا کیا تھا آخر اس تین گھڑے اٹھائے ہوئے لڑکی میں..... اور بھی تو گوٹھ کی لڑکیاں میرے قریب سے گزرتی تھیں..... کئی ایک تو اس پر ”شرمیلا طوطا“ والی پھبتی بھی کس دیتی تھیں مگر وہ ذرا بھی ان سے متاثر نہیں ہوتا..... سب سے بڑی مثال اس کی چچا زاد اور حسن دلاؤز کی مالک سوڑھ تھی..... وہ کس قدر اس کے قریب آ جاتی تھی..... مگر پھر بھی اس کا دل سرد نہیں پگھلا تھا۔ اس معصوم اور سادہ ساحن رکھنے والی لڑکی کو اپنی سرمئی چادر اڑھانے اور پھر اس کے پانی سے بھرے گھڑے اٹھانے والے چند ثانے میں..... ساون کو یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ عرصے سے اس کے سینے میں جما گلیشیر رفتہ رفتہ پگھل رہا ہو..... وہاں اب کسی کی چاہت کی نودمیدہ کو نیل سی پھونٹا شروع ہو گئی تھی۔ وہ چہرہ ساون کو اپنی آنکھ کی پتلی بنا ہوا محسوس ہو رہا تھا جو ہٹائے نہیں ہٹ رہا تھا۔ گھر پہنچ کر اسے یہ بھی یاد نہ تھا کہ وہ گھر سے..... کس عالم میں اور کیونکر نکلا تھا..... بس کھویا کھویا سا اپنے گارے مٹی کی دیواروں والے کمرے میں موجود رلی پنچھی چار پائی پر گر سا گیا..... اسے لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے اندر کی کوئی شے راستے میں کہیں گرا سا آیا ہے..... کچھ ایسی ہی بے چینی طاری تھی اس پر۔ وڈیرے لکھ میر خان کی طرف سے ملنے والی کم ہٹائی کا غصہ بھی جانے کہاں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا..... ماں..... بہن کو بھی وہ ویسا نظر نہیں آ رہا تھا جیسا کہ طیش کے عالم میں وڈیرے میر لکھ میر خان کی حویلی کی جانب روانہ ہوا تھا۔ کھانا بھی اس نے بے دلی کے ساتھ کھایا تھا..... ماں اس کی متفکری بیٹے کے پاس آئی..... ”پٹ! خیر تو ہے نہ..... طبیعت چاک ہے..... وڈیرے سائیں سے کوئی بات تو نہیں ہوئی نا“ اس بے چاری کو وڈیرے کا خدشہ لگا ہوا تھا کہ کہیں اس سے یا

وڈیرے کے آدمیوں سے اس کی منہ ماری تو نہیں ہو گئی۔

ساون ماں کی بات پر کھوئے کھوئے سے انداز میں چونکا..... ”آں..... ماں..... نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تو گزرتی نہ کر..... پر بابا سائیں کو حویلی میرے پیچھے نہیں آنا چاہئے تھا.....“ اس نے بتایا۔

اسی وقت اس کی جوان مگر چھوٹی بہن ہدایتاں بھی بھائی کے لیے دودھ کا گلاس لیے اندر داخل ہوئی..... اس نے ساون کی بات سن لی تھی لہذا اس کی تائید میں بولی۔ ”میں نے بابا کو منع بھی کیا تھا کہ نہ جائے..... پر اماں نے.....“ ماں کی جانب کن آنکھوں سے دیکھ کر وہ چپ ہو رہی۔

”میں اتنا خرمغز تھوڑا ہی ہوں..... جو حویلی جا کر وڈیرے سے منہ ماری کروں گا..... میں تو بس ایک بات کرنے گیا تھا..... ویسے وڈیرا نہیں ملا تھا..... منشی سے بھی صرف اتنا ہی کہا تھا کہ فصل سے ہمیں حصہ کیوں کم ملا ہے۔“ ساون نے کہا اور دودھ کا گلاس اپنی بہن ہدایتاں سے لے کر گھونٹ بھرا..... ساون کی ماں نے طمانیت بھری سانس خارج کی اور خاموشی سے باہر چلی گئی۔

”اری ہدایتاں!“ ماں کے کمرے سے نکلتے ہی ساون نے بہن کو مخاطب کیا۔

”ہاؤ ادا.....!“ ہدایتاں بولی۔ ساون چند ثانے خاموشی سے سوچتا رہا پھر بولا۔

”کچھ نہیں..... بس تو جا.....“

ہدایتاں حیران حیران نظروں سے بھائی کو تکتی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور ساون رلی پنچھی چار پائی پر اپنے دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر لیٹ گیا اور آنکھیں موند لیں..... وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

☆=====☆=====☆

دودا خان کا یہ چھپر ہوٹل ایسا ہی تھا جیسا کہ دور دراز کے گوشوں میں ہوتا ہے، اس وقت نارنجی سورج دن بھر چمکیلی اور خوشگوار دھوپ..... پنچھاوڑ کرنے کے بعد تھکا ہارا دور مغربی نیلیوں کے عقب میں آتش گولے کی طرح لڑھک رہا تھا..... چھپر ہوٹل کے احاطے میں لکڑی کی بنچیں اور میزیں وغیرہ پھیلی ہوئی تھیں، ہوٹل کی گارے مٹی سے بنی ہوئی سالنخوردہ سی عمارت میں ایک بڑا سا کوٹھڑی نما کچا کمرہ بھی تھا جہاں ہر وقت جوا اور شراب کا بازار گرم رہتا تھا۔

”کاونڈر“ نام کی ایک بڑی سالنخوردہ میز کے عقب میں بیٹھا، خاکستری رنگت اور

چرخ سا بڑھا شخص اپنے ہوٹل میں چلنے والے ٹیپ ریکارڈر کی آواز اونچی کر رہا تھا۔ جس میں لوگ گلوکارہ ”مائی بھاگی“ ”دو بیڑو“ کا لوگ گیت راگ ”گھڑو“ میں نغمہ سرانگھی۔ ذرا دور جو، گوار اور منگ کی لہلہاتی فصلوں کے کنارے کنارے جاں نثار جانفوں کی طرح صف بستہ کہو اور نہنگ کے پیڑ کافی آگے تک چلے گئے تھے۔ اس وقت ہوٹل میں لوگوں کا رش نہ ہونے برابر تھا، چند ایک ہاری مزدوروں کی ٹولیاں ایک جانب کچہریوں میں مشغول تھے اور کچھ لوگ اندر کچی کوٹھری میں بیٹھے جوا کھیلنے میں مصروف تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا وہ کالی رنگت والا بڑھا شخص بلاشبہ ہوٹل کا مالک دودا خان تھا، وہ ساٹھ سے اوپر کا تھا لیکن ابھی تک جوانی کے درپے تھا سفید بالوں کو اس نے سیاہ کر رکھا تھا۔ اس کا لمبوتر اور پتلا بدبیت سا چہرہ مزید سیاہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے شیشوں کے کام والی سرخ ٹوپی پہن رکھی تھی اور مٹھی میں بیڑی دبائی ہوئی تھی۔ معاوہ اپنے ہوٹل کے احاطے میں ایک شخص کو آتے دیکھ کر چونک گیا۔ اس نے جلدی سے ٹیپ ریکارڈر کی آواز دھیمی کی اور مذکورہ شخص کو وہیں ”ڈھل“ پر بیٹھے بیٹھے پکارا۔ ”ڑے سوڈھل!..... بابا ادھر آ۔“ وہ سوڈھل ہی تھا اللہ رکھی کا چاچا جو اب دودا خان کے پکارنے پر اسی کی جانب چلا آ رہا تھا۔

”آ بابا آ۔“ بھلی کرے آ (خوش آمدید) بسم اللہ بابا..... آؤ بیٹھو۔“ دودا خان نے خالص مقامی انداز میں اس کا پرتاک استقبال کیا اور قریب ہی بوسیدہ سے کاؤنٹر کے پاس دھرے سرکنڈوں کے ایک مونڈھے پر سوڈھل کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”دودا خان! کیسے ہو تم..... بال بچہ تو راضی خوشی ہے..... چاک ہیں مناسب۔“ سوڈھل نے بھی رسمی کلمات کا جواب تبادلہ کرنا ضروری سمجھا۔

”اور سناؤ..... سوڈھل! یار آج کل تو تیری پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہے.....“ دودا خان معنی خیز لہجے میں مسکراتے ہوئے بولا اور ساتھ ہی ایک چھوکرے کو آواز دے کر ”کڑک چائے“ لانے کا کہا۔

سوڈھل دودا خان کا اشارہ سمجھ گیا تاہم تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے بولا۔ ”اپنی ایسی قسمت کہاں یار دودا خان..... بھائی مٹھل کے مرنے کے بعد تو الٹا بھتیجی کی ذمہ داری بھی میرے کمزور کاندھوں پر آن پڑی ہے۔“

”اچھا چھوڑ اس فضول تکرار کو..... مطلب کی بات کر میرے ساتھ.....“ سوڈھل نے بالآخر کہا اور مٹھی میں دبی بیڑی کا کش لگا کر دھواں فضاء میں اُگلا، پھر چٹکی بجاتی اور اپنے سامنے کاؤنٹر پر رکھی مختلف شیشے کی برنیوں میں سے ایک کو کھول کر کیک پیس نکالے

اور پلیٹ میں رکھ کر سوڈھل کی جانب بڑھا دیئے۔ ”لے یہ کھا جب تک چائے آتی ہے۔ اس کے بعد اصلی بیڑی پلاؤں گا تجھے۔“

سوڈھل پلاسٹک کی پلیٹ سے کیک اٹھا کر کھانے لگا اس دوران چائے بھی آ گئی..... دودا خان ایک خاص نگاہ سوڈھل کے چہرے پر ڈالتے ہوئے..... گویا ایک ضرب لوہار کی لگاتے ہوئے قدرے جھک کر سرگوشیانہ لہجے میں بولا..... ”پھر کیا سوچا تو نے؟ پچاس ہزار میں مجھے رشتہ دے گا اللہ رکھی کا.....“ یہ سن کر سوڈھل کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا..... اگرچہ دودا خان پہلے بھی سوڈھل سے یہ بات کر چکا تھا..... اور خود سوڈھل کو بھی دودا خان سے اس بات کی توقع تھی بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ تھا کہ سوڈھل آیا ہی دودا خان کے ہوٹل اسی مقصد کے لیے تھا..... اور ہر بار دودا خان کے منہ سے اللہ رکھی کے رشتے کے عوض پچاس ہزار کی رقم کا سن کر اس کا دل حلق میں آ کر اٹکتا تھا..... لالچی اور خود غرض سوڈھل کو اس بات کی کوئی غرض نہ تھی کہ اس کی بھتیجی اللہ رکھی کسی طور بھی اس گدھ کے لائق نہ تھی جو اللہ رکھی کے باپ کیا بلکہ دادا کی عمر کا لگتا تھا۔ سوڈھل کو تو صرف ان روپوں سے غرض تھی جو دودا خان اسے اللہ رکھی سے شادی کے بدلے میں بطور ”خرچہ“ دے رہا تھا۔

سوڈھل کو کسی سوچ میں مستغرق پا کر دودا خان نے پھر ایک، بیڑی کا کش لگایا اور چٹکی بجا کر رکھ جھاڑتے ہوئے دوبارہ بولا..... ”سوڈھل بابے..... پہلے گرم گرم چائے کی چسکیاں لگالے آرام سے تاکہ سردی سے جو تیرے دماغ کی نیس سکڑی ہوئی ہیں وہ کھلیں۔ اڑے بابا سوچنا کیا۔ یار تو بھی چڑیا ہے کوئی..... میری پیشکش ٹھکرانے سے تجھے کچھ نہیں ملے گا..... ویسے تیری مرضی..... زبردستی نہیں ہے..... تو جانتا ہے مجھے..... گوٹھ میں ایک سے ایک رشتہ لڑکی کا مل سکتا ہے.....“

”نہیں..... نہیں یار دودا سائیں! ایسی بات نہیں ہے..... میں بس ویسے ہی کچھ سوچ رہا تھا.....“ سوڈھل فوراً بات بناتے ہوئے بولا کہ کہیں دودا خان جیسی اسامی ہاتھ سے نہ نکل جائے تاہم سوڈھل کو اس بات کا پورا پورا ادراک تھا کہ یہ بوڑھا گدھ اس کی بھتیجی اللہ رکھی سے ہر صورت شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ خاموشی سے چائے پینے لگا، دودا خان نے دانستہ سوڈھل کی حریصانہ فطرت کو مدنگاہ رکھتے ہوئے ہوا میں ایک تیر پھینکا تھا جو نشانے پر لگا تھا..... درحقیقت دودا خان کی نظر اس وقت سے ہی اللہ رکھی پر تھی جب اللہ رکھی کا باپ مٹھل زندہ تھا..... مگر مٹھل نے دودا خان جیسے بوڑھے گدھ کا رشتہ اپنی پھول سی بیٹی کے لیے نہ صرف ٹھکرادیا تھا بلکہ آئندہ کے لیے بھی اسے خبردار کر دیا تھا کہ پھر کبھی ایسی بات وہ



زبان پر لایا تو پوری برادری سے اس کی شکایت کر دے گا۔ دودا خان اپنا سامنہ لے کر رہ گیا تھا مگر باز پھر بھی نہ آیا۔ اس کے منصوبہ ساز دماغ نے ایک اور چال سوچی..... اس نے مٹھل کے بھائی سوڈھل سے راہ و رسم بڑھانے شروع کر دیئے اور اسے چند روپے بھی اس مد میں تھما تا رہا کہ وہ اپنے ٹیڑھی کھیر جیسی صفت رکھنے والے بھائی مٹھل کو اللہ رکھی کا رشتہ دینے کے لیے راضی کر لے۔

”دیکھ بھائی مٹھل..... آپڑیں اللہ رکھی..... دودا خان کے پاس سکھی رہے گی..... بہت پیسہ ہے اس کے پاس.....“ بالآخر ایک دن چند ٹکوں کے عوض بکنے والا سوڈھل دودا خان کے ایماء پر اپنے بھائی کے ہاں اس کا رشتہ لینے جا پہنچا۔ مٹھل اپنے بھائی کی بات پر بری طرح چراغ پا ہو گیا..... مگر چونکہ سامنے بھائی تھا اسی لئے ضبط سے کام لیتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

”بھائی سوڈھل..... مجھے آج تیری بات سن کر بہت رنج ہوا..... میں سمجھتا تھا کہ تُو میری بیٹی اللہ رکھی کو بھی اپنی بیٹی سمجھتا ہے..... مگر میرا یہ خیال آج غلط ثابت ہوا..... اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بول، اگر تیری اپنی کوئی بیٹی ہوتی تو کیا تو.....“ مٹھل کی بات پر سوڈھل کو چپ لگ گئی اور وہ اپنا سامنہ لے کر آ گیا۔ اب جبکہ اللہ رکھی جسے سوڈھل سونے کی چڑیا سمجھتا تھا..... مکمل طور پر اس کے تصرف میں تھی اور ادھر دودا خان کو بھی اپنی مراد برآنے کی امید پوری ہوتی نظر آنے لگی تھی۔

سوڈھل نے ٹیک اور چائے وغیرہ چٹ کرنے کے بعد دودا خان سے ندیدوں کی طرح بیڑی مانگی..... دودا خان نے بڑے تپاک کے ساتھ کاغذی بیڑی سے بابو بیڑی نکال کر اسے پیش کرتے ہوئے دیا سلائی کے ذریعے سلگانے کا فریضہ بھی خود ہی انجام دیا۔ سوڈھل نے بیڑی کا ایک طویل کش لیا تو اسے ٹھسکہ سالگا اور وہ کھانسنے لگا..... پھر کچھ سوچتی ہوئی نظروں سے دودا خان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا..... ”دودا خان! یار..... مجھے مہلت دے تھوڑے دنوں کی.....“

”سوچنے کی نہیں دے سکتا مہلت..... کیونکہ اب سوچنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی ہے.....“ دودا خان جواباً عیاری سے بولا۔

”تُو ٹھیک کہتا ہے..... میں سوچنے کی نہیں، بس ویسے ہی تھوڑے دن اور دے دے مجھے..... بس میری کوئی مجبوری سمجھ لے۔“

”اچھا ٹھیک ہے سوڈھل!..... پر ایک بات سن۔“ دودا خان نے کہا اور اپنی بات

جاری رکھتے ہوئے گویا متنبہ کیا..... ”میں نے سنا ہے..... تُو نے اللہ رکھی کو بالکل ہی کولہو کا تیل بنا رکھا ہے..... گھر کی اور باہر کی ذمہ داریاں بھی تُو نے اس کے نازک کاندھوں پر ڈال دی ہیں..... ایسا نہ ہو..... اسے بالکل نچوڑ کر میرے حوالے کر دے..... مجھے وہ بالکل صحت مند چاہئے..... سمجھا.....“ سوڈھل اس کی بات سن کر خاصا جڑ بڑ سا ہوا اور اسے چور نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے سیاہ باریک ہونٹوں کے عقب سے پیلے دانٹوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

”نہیں یار..... دودا سائیں! اب ایسی بھی بات نہیں ہے..... تُو بے ہنجر رہے.....“ سوڈھل مبہم انداز میں جواب دیتے ہوئے رخصت ہونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور ساتھ ہی دودا خان بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے تک اسے رخصت کرنے آیا۔

☆=====☆=====☆

وہ ایک چمکیلی دو پہر تھی۔ جس پگڈنڈی نما کپے اور ناہموار راستے پر ساون اجرک اوڑھے چلا جا رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں کھیتوں میں کئی باری کٹائی میں مشغول تھے جن میں عورتیں مرد سب ہی شامل تھے..... معاً اس کی نگاہ ایک جانب کھیت میں کام کرتی ہوئی اللہ رکھی پر پڑی اور وہ ٹھنک گیا۔

اگرچہ ساون کو اللہ رکھی کے نام کا علم نہ تھا مگر وہ پہچان چکا تھا اسے کہ یہ لڑکی وہی تھی جس نے اس کے اندر عجیب سی پلچل مچا دی تھی..... اس نے چلتے چلتے ہی ایک نگاہ اطراف میں ڈالی، کھیتوں میں کام کرنے والے لوگوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ بالخصوص جدھر اللہ رکھی اپنے کام میں مشغول تھی اس کے آس پاس چند ہی عورتیں تھیں جو اس سے خاصی دور تھیں۔ ساون کا دل یکبارگی ایک لمحے کو عجیب انداز میں دھڑکا۔ اس کی وجہ معاً اندر ابھرنے والی وہ خواہش تھی جسے وہ فوری عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا..... لہذا اس نے اپنے سر پر ٹوپی درست کی..... اجرک کو ایک بار اتار کر دوبارہ کاندھوں پر رکھا اور اپنے تلے قدموں سے چلتا ایسے راستے پر آ گیا جو اللہ رکھی کے قریب سے ہو کر گزرتا تھا..... وہاں ایک کیکر کا گھنا بیڑ بھی تھا..... دوسرا ایک خوش کن امر یہ بھی تھا کہ اللہ رکھی گھٹیاں بناتی ہوئی اس کیکر کے درخت کے قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر جیسے ہی وہ درخت کے ذرا قریب پہنچی..... ساون بھی وہاں آن پہنچا..... اب ایک جانب سے درخت انہیں آؤ فرام کر رہا تھا، ساون نے دیکھا کہ اللہ رکھی نے اس کی دی ہوئی وہ سرمئی چادر اوڑھ رکھی تھی جس دن ان دونوں کا سامنا نہروالے راستے پر ہوا تھا اور اللہ رکھی کے ضرورت سے زیادہ بھیگے ہوئے جسم پر اس نے

اپنی یہی چادر اسے اڑھادی تھی۔ یہ دیکھ کر ساون کو ایک مسرت انگیز احساس نے نہال سا کر دیا تھا۔ اسی وقت..... اللہ رکھی کی بھی اس پر نظر پڑ گئی..... دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو من ہی من میں یہ عقدہ کھلا کہ ان پیاسی نگاہوں کو تو یہی منظر درکار تھا جو ان دونوں کے اندر محبت کی ایسی جوت جگا چکا تھا جس نے انہیں بے تاب کی سرحدوں تک پہنچا دیا تھا اور کچھ یہی وجہ تھی کہ وہ کافی دیر تک اسی طرح گم صم دنیا و مافیہا سے بے نیاز ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے..... پھر اللہ رکھی کی مدد بھری اور کھوئی کھوئی آنکھوں میں ساون کو سردی شاعری کے مصرعے اترتے دکھائی دے گئے جو بلاشبہ اللہ رکھی کے دل کی ترجمانی کر رہے تھے۔

نہن اٹھا کر ناز سے مجھ کو سا جن نے جب دیکھا مات  
ہوئیں سورج کی کرنیں، چاند لگا مرجھانے  
دیکھتے ساتھ ہی بن گئے خادم، کہکشاں اور تارے  
ہائے! جمال یار سے ہر ایک چیز لگی شرمانے  
پھر جواں ساون کی آنکھوں نے بھی اپنا پیام دیا۔

سب سے ہیں آنکھیں مقدم عشق میں  
یار کی صورت سے ان کو پیار ہے  
ہے مگر خوبی نہاں اس بات میں  
جس پہ قائم عشق کا معیار ہے  
پیار اس سے صرف آنکھوں کا نہیں  
اک انوکھی لذت گفتار ہے  
التجا جو کچھ بھی رکھتا ہے لطیف  
خوب واقف اس سے وہ دل دار ہے

”ڑی تیرا نام کیا ہے؟“ معاً ساون نے اس کا نام پوچھا۔

”اللہ رکھی“..... اللہ رکھی نے بھی کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا اور پھر اس کا نام

پوچھتے ہوئے بولی..... ”اور تیرا نام؟“

”ساون“..... اس نے جواب دیا، دونوں اب مزید ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے..... نظروں کی کندیں ہنوز آپس میں الجھی ہوئی تھیں۔

ٹھیک اس وقت فضا بندوق کے زور دار دھماکے سے گونج اٹھی اور ساتھ ہی اللہ رکھی کی چیخ بلند ہوتی چلی گئی۔

بارہ بور بندوق کے فار کی زور دار آواز کے ساتھ ہی اللہ رکھی کی تیز چیخ نے ساون کو بری طرح چونکا دیا تھا۔ اس کا دماغ چند ثانیے جھنجھٹا سا گیا مگر جب اس نے اپنے سامنے کانوں پر اپنی ہتھیلیاں رکھے اللہ رکھی کو صحیح سلامت کھڑے دیکھا تو اسے ذرا طمینان ہوا۔ اس نے تیزی کے ساتھ بڑی خونخوار نگاہوں سے فار کی آواز کی سمت دیکھا تو اس کی آنکھوں میں الجھن آمیز درشتگی عود کر آئی۔ بندوق بہ دست وہ شخص دودا خان تھا۔ عمر سیدہ اور اکہری جسامت کا مالک دودا خان جو بھاری بھر کم ڈبل بیرل بندوق سنبھالے ان دونوں کو شکرے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا..... درمیانی فاصلہ کم کرنے کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں اترنے والی کرنش کو بخوبی بھانپ چکے تھے۔ ذرا دور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے چند لوگوں نے بھی چونکتی ہوئی نگاہوں کے ساتھ ان کی جانب دیکھا تھا۔

”دودا خان.....! اگر تو نے یہ شرارت کے طور پر فار کیا ہے تو اس عمر میں تجھے یہ زیب نہیں دیتا جس کی تجھے بہر حال مجھ سے معافی مانگنی پڑے گی۔ اگر یہ دشمنی کا آغاز ہے تو یقین رکھنا..... میں ہوائی فار کرنے کا عادی نہیں ہوں..... لاکار کر سینے کا نشانہ لوں گا۔“ ساون نے اسے دھمکاتے ہوئے کہا تو دودا خان بندوق سنبھالے چند قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔

اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں غضب کا کینہ بھرا ہوا تھا۔ وہ ساون کو گھورتے اور بندوق کو دوسرے ہاتھ میں منتقل کر کے کھرکھراتے لہجے میں بولا۔ ”فی الحال تو میں صرف تجھے اتنا خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ..... یہ لڑکی میری منگیتر ہے..... اور اگر میں نے دوبارہ تجھے اسے گھورتے ہوئے دیکھ لیا تو اگلی بار مجھے تیری جوانی پر بالکل رحم نہیں آئے گا سمجھے.....“ یہ کہتے ہوئے وہ بھناتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اللہ رکھی بے چاری ہلکا ہلکا ساون کا چہرہ تکتے لگی جو عجیب سی نظروں کے ساتھ اس کی طرف دیکھے جارہا تھا۔

”اللہ رکھی!..... یہ..... یہ کیا کہہ رہا تھا..... کیا واقعی تیری اس کے ساتھ منگنی ہوئی ہے۔“ ساون نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”نہن..... نہیں..... یہ..... یہ جھوٹ بولتا ہے..... میں تو اس کو جانتی بھی نہیں.....“ اللہ رکھی نے گھبرا کر جواب دیا تو ساون نے جیسے ایک لمبی اور پُر سکون سی سانس لی۔ وہ دودا خان کو اچھی طرح جانتا تھا..... اکثر اس کے چہرہ بوٹل پر چائے پینے جایا کرتا تھا اور دودا خان کے ایک جوان بیٹے علی بخش سے اس کی ایک حد تک دعا سلام بھی تھی۔ دودا خان نے دوشادیاں پہلے سے کر رکھی تھیں..... پہلی بیوی مرچکی تھی۔ علی بخش پہلی بیوی کے بطن سے تھا

وہ ہوشیار رہے، اب جیسے ہی اس کے کانوں میں دودے اور اس کے بیاہ سے متعلق بھنگ پڑے تو وہ اسے ضرور مطلع کرے پھر اس کے بعد دونوں آئندہ ملتے رہنے کا عہد و پیمان کر کے جدا ہوئے۔

واپسی پر ساون کو تو جیسے دنیا ہی بدلی بدلی ہوئی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ محبت بھی کیا چیز ہے۔ ہو جاتی ہے تو خود سپید گانہ کر کے رکھ دیتی ہے اور اس عشق میں دل کی جو حالت ہوتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ من ہی من میں محبت کے نازک اور کول سے شگوفے نمودار ہوتے ہیں اور انسان ہر سے ایک سرشاری کی سی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔ اللہ رکھی کا پیار پا کر ساون خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھنے لگا تھا..... پہلے جو اس کی طبیعت میں ہر وقت ابال اور جوانی کا جوش سا بھرا رہتا تھا اس میں اب قدرے ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ اب وہ ہر ایک سے بڑے تپاک سے ملتا خوشدلی سے بات کرتا، چھوٹی چھوٹی باتوں کو درگزر کرتا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنے گھروالوں کی بات بھی اب توجہ سے سنا کرتا اور اس پر عمل بھی کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کی اس حیرتناک کایا کلپ کو اس کے باپ موگو، اس کی ماں اور بہن ہدایتاں نے بھی محسوس کیا تھا۔ ساون جانتا تھا کہ محبت جہاں انسان کو ان گنت قوس قزح کے دلنشین رنگوں سے آشنا کرتی ہے وہاں اس راہ پر خار میں ”کالے بیر یوں“ بھی شب خون مارنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ انہی ”کالے بیر“ میں ایک دودا خان بھی تھا جو ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود اللہ رکھی جیسی معصوم لڑکی پر کسی گدھ کی طرح منڈلاتا رہتا تھا..... اور آج کے واقعے نے اسے بری طرح طیش بھی دلادیا تھا۔ اسے رہ رہ کر دودا خان پر غصہ آ رہا تھا جو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اللہ رکھی پر اپنا حق جتا رہا تھا۔ اگر ساون کو پہلے سے معلوم ہوتا کہ اس کی یہ بات محض ایک لغو بیانی ہے تو وہ اسی وقت دودا خان کو اچھی طرح سبق سکھا دیتا..... بہر طور اب اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ جب کبھی بھی اب اس کا سامنا دودا خان سے ہو گا وہ اس کے ساتھ اچھی طرح نمٹے گا۔

☆=====☆=====☆

موجودہ حالات کے پیش نظر دودا خان نے اللہ رکھی کے جلد سے جلد حصول کی خاطر اپنی پیش قدمی تیز کر دی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک دن سرشام بہت سے پھل، گندم اور چاول کی ایک ایک بوری گدھا گاڑی پر لا کر سوڈھل کے گھر جا پہنچا۔ یہی نہیں اس کا آج مقصود ارادہ تھا کہ وہ اللہ رکھی کے سلسلے میں بات پکی کر کے اٹھے گا اور اس مد میں وہ اپنے ساتھ

جبکہ دودا خان کی دوسری بیوی جو حیات تھی، اس سے ایک بیٹا محرم خان اور دوسری بیٹی شمع تھی جو پاس کے کسی گوٹھ میں کافی عرصہ پہلے بیاہی جا چکی تھی۔ جب دودا خان نے ساون سے جھوٹ بولا کہ اللہ رکھی اس کی منگیتر ہے تو ایک لمحے کے لیے ساون خود کو دودا خان کے سامنے بالکل چھوٹا محسوس کرنے لگا۔ کیونکہ گوٹھ کا یہ قدیم رواج تھا کہ جو لڑکی یا عورت اگر کسی مرد سے منسوب کی جا چکی ہو تو پھر کوئی مرد اس عورت کی طرف آنکھ اٹھانا اپنی بے عزتی سمجھتا تھا..... لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بھی چلن عام تھا کہ اگر کوئی مرد کسی لڑکی سے شادی کا خواہشمند ہوتا مگر بات ابھی تک پکی نہ ہوئی ہو تو تب بھی بعض مرد اس ”لڑکی“ کو ”اپنا“ سمجھ چکے ہوتے تھے اور ضرورت پڑنے پر اس کا اظہار بھی کر ڈالتے تھے جیسا کہ آج دودا خان نے اپنے اور اللہ رکھی کے ”خود ساختہ“ تعلق کا اعلان کیا تھا لیکن اس ”خود ساختہ“ تعلق کی کوئی حیثیت نہ تھی اور یہی بات لڑائی جھگڑے کی بنیاد ڈالتی تھی لہذا ساون اللہ رکھی کے اس انکار سے کہ اس کا دودا خان سے کوئی تعلق نہیں ہے، مطمئن ہو گیا تھا تاہم اسے دودا خان جیسے بوڑھے گدھ کی اس ڈھٹائی پر طیش بھی آ رہا تھا کہ وہ کس طرح دھڑلے کے ساتھ بے چاری اللہ رکھی جیسی معصوم لڑکی کو اپنی ملکیت تصور کر رہا تھا۔

”ساون اب کیا ہوگا.....؟“ اللہ رکھی نے اچانک پوچھا۔ اس کے لہجے میں تشویش

نمایاں تھی۔

ساون نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ ”تو فکر نہ کر..... یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا..... پر تو مجھے یہ بتا کہ پہلے کبھی تیرے گھر..... یعنی تیرے ماں پونے تجھ سے کوئی ایسی بات تو نہیں کی یا تو نے خود سنی ہو کہ اس مرد سے تیرا.....“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اللہ رکھی کی آنکھوں سے ایک دم جھیر جھیر آنسو بہہ نکلے اور ساون اپنی آدھی بات کاٹ کر متحیر اور قدرے چونکتے ہوئے بولا۔ ”کیا ہوا؟ اللہ رکھی! تو کیوں رو رہی ہے ٹی؟“

تب اللہ رکھی نے مختصر اپنے بارے میں ساون کو سب سے پہلے بتا دیا کہ وہ ایک یتیم دیسیر لڑکی ہے، اپنے چچا چچی کے ہاں کن حالات میں زندگی کی گاڑی کو سنبھال رہی ہے۔

یہ سنتے ہی ساون کے ذہن رسا میں لالچ میں گندھی ہوئی ایک ایسی مذموم سازش کا خیال آیا کہ ہو سکتا ہے بالابالا ہی اللہ رکھی کے چچا سوڈھل نے خفیہ طور پر یہ طے کر لیا ہو کہ اللہ رکھی کو دودا خان کے ساتھ بیاہ کر سکے کھرے کر لئے جائیں۔ اس نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ سردست اللہ رکھی کو اس مذموم ”سودے“ کی ہوا بھی نہیں لگائی گئی ہے۔

بہر طور..... ساون نے اللہ رکھی سے تو کچھ نہ کہا تاہم اسے یہ ہدایت ضرور دیں کہ

خدمتیں لے رہے ہو۔ دیکھ سوڈھل میں پھر کہہ رہا ہوں مجھ سے صاف بات کر..... بہت بچہ پھر کر لی تو نے..... اب اللہ رکھی کو بیاہ دے میرے ساتھ۔“

سوڈھل کو اس کی بات پر غصہ تو آیا مگر وہ جانتا تھا غصہ دکھانے سے اللہ رکھی کے ذریعے جو مال ہاتھ آنے والا تھا اس سے محروم ہو جائے گا لہذا وہ جلد ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور کھسائی نہی ہنسنے ہوئے بولا۔ ”نہیں سائیں! ایسی بات نہیں..... اللہ رکھی تمہاری ہی چیز ہے، جو ہمارے پاس امانت ہے۔ یہ فیصلہ تو ہو چکا ہے۔ اسی لئے ہم اب اللہ رکھی کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھتے ہیں۔“

”اچھا چل رہے دے..... سب جانتا ہوں میں۔“ دودا خان بے تکلفی سے بولا پھر اپنی لاگ کی گٹھ سے دس ہزار کے میلے کیلے نوٹ جو دھاگے سے بندھ ہوئے تھے سوڈھل کے سامنے لہرائے اور لالچی سوڈھل کے دیدے نوٹوں کے ساتھ ہی متحرک ہونے لگے۔ اس نے یکدم دودا خان کے ہاتھ سے نوٹ یوں جھپٹ لئے جیسے اسے ڈر ہو کہ کہیں یہ رقم دودا خان واپس اپنی لاگ میں نہ باندھ لے۔

”بس پھر منظور ہے نا تجھے..... چل اب مجھے تکرار کنٹرا تارخ بھی دے دے..... میں ”جج“ (بارت) لے کر آ جاؤں گا اور باقی کے چالیس بھی بعد میں تو کھرے کر لینا۔ ٹھیک ہے پھر.....“ دودا خان نے فیصلہ کن لہجے میں اسے بخود دیکھتے ہوئے کہا تو سوڈھل چند نکلنے کے لیے متذبذب سا نظر آنے لگا۔ دس ہزار کے نوٹ ہنوز اس کے ہاتھ میں تھے۔ اسے دودے خان کو اللہ رکھی کا رشتہ دینے پر کوئی تامل نہ تھا لیکن وہ اپنی گندم کی بوری نما بیوی کی جانب سے متامل تھا کیونکہ وہ ابھی اور اتنی جلدی اللہ رکھی کو گھر سے دوسرے لفظوں میں اپنے چرنوں سے دور نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ابھی وہ اس سے خدمت کروانا چاہتی تھی اور یہی بات عیار دودا خان نے اچھی طرح سے بھانپ لی تھی وہ جانتا تھا کہ اللہ رکھی اس گھر میں کس طرح بچی کے دوپائوں کی طرح پس رہی تھی۔ اسی لئے دودا خان جلد سے جلد اللہ رکھی کو بیاہ کر لے جانا چاہتا تھا تاکہ اللہ رکھی کا نوخیز حسن مر جھانہ جائے۔

سوڈھل کو چپکا دیکھ کر دودا خان نے پھر تیر پھینکا۔ ”اچھا..... پھر مجھے یہ دس ہزار واپس دے..... اور اللہ رکھی کو بٹھائے رکھ اپنی بیوی کے چرنوں میں..... کوئی بات نہیں..... ساری عمر تم دونوں کی خدمت کرتی رہے گی۔“

”اڑے..... نہیں یار دودا..... ایک تو تو ناراض بہت جلدی ہو جاتا ہے۔ یہ بھلا بات ہوئی کوئی..... دے دوں گا تاریخ بھی تجھے۔“ سوڈھل یکدم اس کے تیور بدلتے دیکھ

دس ہزار کی رقم بھی اپنی لاگ میں باندھ کر لایا تھا۔ سوڈھل اور اس کی بیوی عنایتاں دودا خان کو یوں اچانک لدا پھند اپنے دروازے پر دیکھ کر اس کے سامنے بچھ بچھ گئے..... تاہم اللہ رکھی کو اس کا آنا انتہائی برا لگا تھا۔ یہی نہیں اسے یہ بھی برا لگا تھا کہ اس کے چاچا چاچی نے بڑے دھڑلے کے ساتھ کچے صحن میں رلی بچھی چار پائی پر دودے خان کو بٹھا دیا اور اللہ رکھی خاموشی کے ساتھ اپنا چہرہ اجرک میں لپیٹنے کو شہری میں آگئی۔

”دودا سائیں!..... آج تو تو نے میرے غریب خانے کو رونق بخش دی۔ پر جو تو نے اتنی تکلیف کی ہے نا..... یہ تو نے صحیح نہیں کیا ہے۔“ سوڈھل سر کندوں کے ایک بوسیدہ سے مونڈھے کو کھسکاتے ہوئے بولا۔ اس کا اشارہ اناج وغیرہ کی بوریوں اور پھلوں کے ٹوکروں کی طرف تھا۔ جن پر سے اس کی حریصانہ نظریں نہیں ہٹ رہی تھیں۔ اس کی بیوی عنایتاں بھی سلام دعا کے بعد ایک ٹوٹے پھونے لکڑی کے اسٹول پر بیٹھ گئی تھی۔

”ادا خوش ہے نا تو.....“ اس نے پوچھا۔

”ہاؤ..... بھاجائی! میں ٹھیک ہوں تو تو چاک ہے نا.....“ دودا خان نے کرخت سی آواز میں جواب دیا۔

”مڑی عنایتاں! جا کچھ مانی ٹکر پاڑیں کا انتظام کر۔“ سوڈھل نے اپنی بیوی سے کہا اور جب عنایتاں اپنے گفتگوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے لگی تو دودا خان فوراً ہاتھ کے اشارے سے اسے روک کر بولا۔

”نہیں..... اس کی لوڑ نہیں..... رہنے دے..... میں کھاپی کر ہی آیا ہوں بھاجائی.....“

”اچھا چل..... چائے ہی لے آ جا کر.....“ سوڈھل جیسے اپنی بیوی کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گیا تھا۔

بالآخر عنایتاں..... بڑبڑاتے ہوئے اٹھی۔ ”ایک تو مردار اس جوڑوں کے درد نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔“

”یار سوڈھل کیوں بھاجائی کو تکلیف دیتا ہے۔“ دودا خان مروٹا بولا۔

”ارے سائیں تکلیف کیسی، کون سا یہ خود کام کرے گی۔ اللہ رکھی جو ہے۔“ سوڈھل نے کہا اور پھر اچانک وہ تھوک نکل کر چپ ہو رہا اور نظریں چرانے لگا۔ مگر دودا خان بھی ایک کانیاں تھا بھانپ کر بولا۔

”ہوں..... اسی لئے تو اللہ رکھی کو گھر سے رخصت نہیں کر رہا، اس سے خوب اپنی

کر بولا۔ ”اچھا..... پھر میں کل شام تیرے ہوٹل آؤں گا۔ ایک کپ کڑک چائے اور بیڑی بھی پیوں گا اور تجھے تاریخ بھی دے دوں گا۔ بس اب تو خوش ہے نا.....“

اسی اثناء میں اس کی بیوی عنایتاں اپنے بھاری وجود کے ساتھ چائے کے دو پیالے لے آئی۔ مگر دودا خان چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اڑے بابا..... چائیں وائیں تو پیتا جانا..... اتنی تکر کا ہے کو بھلا.....“ سوڈھل اسے اٹھتا دیکھ کر بولا۔

”میری چائے تیرے پر ادھار ہی سوڈھل پھر کبھی آکر پی لوں گا۔ چلتا ہوں..... اور کل اپنے ہوٹل پر انتظار کروں گا۔“ دودا خان یہ کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اندر کچی کوٹھڑی کے سرکنڈوں والے دروازے کے ساتھ لگی آنسو بہاتی اللہ رکھی پر آج یہ بات پوری طرح سے عیاں ہو چکی تھی کہ جسے وہ اپنا چاچا سمجھ رہی ہے درحقیقت وہ دولت کا ایک ایسا پجاری ہے جو محض روپوں کی خاطر اسے..... یعنی اپنی بیٹی کو ایک ایسے شخص کے ساتھ بیاہ رہا تھا جو اس سے گنی نہیں بلکہ تگنی عمر کا تھا۔ سکتی ہوئی اللہ رکھی کو آج بڑی شدت سے اپنا باپ یاد آنے لگا اور اسی تو اتر سے اس کی گہری آنکھوں سے آنسو بھی چھم چھم برسنے لگے۔ وہ روتے ہوئے دل کے ساتھ سوچ رہی تھی کہ اگر آج اس کے لالچی اور خود غرض چاچے کی جگہ پر اس کا باپ ہوتا تو وہ اس بڑھے دودا خان کے منہ پر نوٹوں کی گڈی مار کر اسے سخت بے عزت کر کے گھر سے نکال دیتا..... لیکن یہاں تو اس کے سوڈھل بچانے بالا ہی بالا اس کا سودا کر دیا تھا۔ اچانک، اللہ رکھی کے تصور میں اپنے محبوب ساون کا چہرہ گھوم گیا۔ اسے یکنخت یوں لگا جیسے وہ اب دنیا میں تنہا نہیں ہے۔ چچا اور چاچی جیسے خونی رشتوں پر اس کا اعتبار اٹھ چکا تھا۔ اب خدا کے بعد ساون اللہ رکھی کو اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ساون کی شبیہ تصور خیال میں آتے ہی اسے ایک گونہ سکون اور ایک حوصلہ سا مل رہا تھا..... ورنہ تو اللہ رکھی زندہ درگور ہوتا خود کو محسوس کرنے لگی تھی۔ دودا خان بھلا اسے کیا پسند آتا تھا اسے تو اب اپنے چاچا چاچی بھی بُرے معلوم ہو رہے تھے..... جنہوں نے اس کی بے لوث خدمتوں کا یہ صلہ دیا تھا..... معاً اسے پھر باہر چاچا سوڈھل اور چاچی عنایتاں کی آپس میں زور زور سے بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ شاید کسی بات پر آپس میں الجھ رہے تھے۔

”اتنی جلدی کا ہے کی ہے۔ اس بڑھے دودے کو تاریخ دینے کی.....“ چاچی عنایتاں اپنے شوہر سے ہاتھ نچا کر کہہ رہی تھی۔ ”ذرا مجھے کچھ دن تو سکھ کے ساتھ گزار لینے

دے..... پر تجھے کیوں میرے آرام کا خیال آنے لگا۔ تجھے تو روپے ملنے چاہئیں بس..... میں جاؤں بھاڑ میں ہونہ.....“

اللہ رکھی نے پھر سوڈھل چاچا کی آواز سنی جو اپنی بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”اڑی..... چری نہ بن..... دیکھ..... جب ہمارے پاس بہت سا روپیہ آجائے گا نا تو میں تجھے نوکرانی رکھ دوں گا۔ ایک بار اللہ رکھی کو دودا خان کے حوالے کر کے اس سے مجھے پیسے اینٹھ لینے دے..... پھر ان پیسوں سے میں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کروں گا۔ وہ تو نے نہیں سنا کہ پیسہ پیسے کو کھینچتا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے پھر..... دودے کو لمبی تاریخ دے دینا۔“ عنایتاں بولی۔

”اپنی بات ہی کہے جائے گی سمجھے گی نہیں میری بات.....“ سوڈھل زچ ہو کر بولا۔ ”وہ بھی چالاک ہے۔ سمجھ جائے گا کہ کیوں تاریخ اتنی دور کی دے دی ہم نے۔ بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے..... اسی مہینے چاند کی اٹھارہ تاریخ دے دوں گا دودا خان کو..... آج چوتھے پر ہے چاند..... باقی چودہ دن کروالے اپنی خدمت اللہ رکھی سے.....“ پھر اللہ رکھی کو سوڈھل چاچا کے باہر جاتے قدموں کی آواز کے ساتھ ہی عنایتاں چاچی کی بھی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

”اللہ رکھی.....!“ معاً اللہ رکھی کو باہر سے عنایتاں چاچی نے پکارا اور وہ یکدم اپنی چادر کے میلے چیکٹ کنارے سے اپنا آنسوؤں بھرا چہرہ پونچھنے لگی اور پھر باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

☆=====☆=====☆

”سائیں بھوتارا! موگو ہاری کا بیٹا..... ساون منہ کو آنے لگا ہے..... اور اس کی دیکھا دیکھی دوسرے ”ہاری زادے“ بھی ہمت پکڑنے لگے ہیں منہ کھولنے کی.....“ منشی میرل منگن ہارنے اپنے سر پر شیشوں جڑی سرخ دھاگوں والی سندھی ٹوپی درست کرتے ہوئے سرکنڈوں کے موٹے پربراجمان وڈیرے میر لکھ میر خان سے کہا۔

جواباً وڈیرا اپنی خضاب لگی مونچھوں کے کونوں کو مروڑیاں دیتے ہوئے آنکھیں سکینٹے کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے پر خیال انداز میں سر ہلانے لگا۔ پھر چند ٹاپے خاموشی کے بعد اوطاق کی بوجھل فضا میں وڈیرے کی بلفی آواز گونجی۔ ”موگو ہاری پر کتنا قرض ہے، اس وقت.....“ اس نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”سائیں وڈا.....! پورے پندرہ ہزار آٹھ سو روپے۔“ منشی میرل نے زبانی بتایا۔

”ہوں..... اسے قرض دیتے رہو۔ اتنا دو کہ وہ بجائے اصل رقم کے سود ہی اتار تا رہے ساری عمر..... دیکھو میرل..... ان لوگوں کو کبھی سوکھی روٹی کھانے نہ دو، انہیں قرض کا سالن دو۔ اس میں بھگو کر روٹیاں کھائیں یہ۔ پھر کوئی آواز نہیں ابھرے گی۔“ وڈیرے کی بات پر منشی دھیرے دھیرے اثبات میں اپنا سر ہلانے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ رقصاں ہو گئی تھی جیسے وہ اپنے سائیں ”وڈے“ کی بات کی تہہ تک پہنچ گیا ہو۔ پھر بے اختیار اس کے منہ سے ”برابر سائیں وڈا..... برابر“ نکلا۔

☆=====☆=====☆

وہ دونوں روشنی کی رفتار سے بھی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کے نہ صرف قریب آتے چلے گئے بلکہ یک قالب دو جان بھی ہو چکے تھے۔ ساون سے ملاقات کرتے ہی اللہ رکھی نے اسے اپنے لالچی اور خود غرض چاچا سوڈھل اور بوڑھے دودا خان کے بیچ، اسے شادی کی آڑ میں فروخت کرنے کی جو کچھڑی پک رہی تھی، وہ ساری گوش گزار کر دی۔ ”اب کیا ہوگا ساون! میں..... میں تو جیتے جی مر جاؤں گی اگر میری شادی دودا خان.....“ اللہ رکھی اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی اور بے اختیار ہو کر سکنے لگی۔

وہ دونوں اس وقت شام کے ملگجے میں جو اور منگ کی کھڑی فصلوں کے درمیان موجود تھے۔ ساون اللہ رکھی کے منہ سے یہ سن کر کہ اس کا چاچا پچاس ہزار کے عوض بڑھے دودا خان کے ہاتھ اسے بیاہ کی آڑ میں فروخت کر رہا ہے۔ وہ ایک ایسی متفکر سا ہو گیا تاہم سسکتی ہوئی اللہ رکھی کو تسلی دیتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولا۔ ”اللہ رکھی! تو فکر کیوں کرتی ہے۔ میں ہوں نا..... سنہال لوں گا سب..... اور اس دودے خان سے بھی منٹ لوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے ساون کی آنکھوں میں خون سا اتر آیا اور وہ دانت پیٹتے ہوئے دودے خان کے متعلق سوچنے لگا کہ اسے اب سبق سکھانا ہی پڑے گا۔

ساون کے خطرناک تیور دیکھ کر اللہ رکھی تڑپ کر فکر مند لہجے میں بولی۔ ”ساون..... دودا خان سے نہ الھٹنا۔ وہ بہت پیسے والا ہے، کہیں تجھے نقصان نہ پہنچا دے۔ دیکھ ساون میرا تیرے سوا کوئی نہیں۔“ اللہ رکھی کے لہجے کی بے چارگی نے ساون کو ہلا کر رکھ دیا وہ بولا۔

”نہیں اللہ رکھی..... میرا یہ مطلب نہیں کہ میں دودا خان سے الھ پڑوں۔ میں کسی اور طریقے سے اس کے ساتھ نمٹوں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہمارے گوٹھ میں غربت کتنی بڑی کمزوری اور دولت مندی کتنی بڑی طاقت جانی جاتی ہے پر تو حوصلہ رکھ..... اللہ ہمارے

ساتھ ہے۔“ ساون نے آخر میں اسے تسلی دیتے ہوئے کہا اور پھر ملاعنت سے مسکرا کر اس کی سرگیں آنکھوں میں اپنی محبت پاش نظروں کا جام الفت اٹھالیتے ہوئے مزید بولا۔ ”اللہ رکھی! ہماری محبت بھی تو ایک طاقت ہے..... ناقابل تسخیر طاقت..... بھلا کوئی بیری ہماری اس طاقت کو ختم کر سکتا ہے۔“ ساون کی بات پر اچانک اللہ رکھی نے اپنی گھنیری پلکوں کی چلن اٹھا کر اس کی سرمدی نظروں میں دیکھا تو وہاں اسے الفت کا ایک ایسا بحر بیکراں ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دیا، جہاں ان کی معصوم محبت کا سفینہ بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرتا ہوا اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔

☆=====☆=====☆

ساون نے دودا خان سے نمٹنے کا جو طریقہ سوچا تھا یہ ظاہر وہ سیدھا سادہ تھا لیکن اس میں ایک مشکل آڑے آرہی تھی اور وہ تھی روپوں کی..... لیکن اس سلسلے میں بھی اس نے روپوں کے بندوبست کا خاطر خواہ حل سوچ رکھا تھا..... لہذا ساون ایک دن پہلے اپنی ماں سے بولا۔ ”امڑ! گودی.....! مجھے بات کرتے ہوئے اچھا تو نہیں لگ رہا لیکن.....“ ساون ذرا الھ کر رکھ کر اس کی ماں متا بھری حلاوت سے بولی۔

”ہاؤ پٹ! بول رک کیوں گیا۔ بھلا اپنی امڑ سے کیا ڈرنا راضگی کا۔“ ”امڑ! جھجیل! وہ ایک لڑکی ہے بے چاری غریب اور یتیم۔ وہ مجھے اچھی لگی ہے لیکن.....“ پھر ساون نے ماں کو اللہ رکھی سے متعلق ساری رام کہانی سنا ڈالی کہ..... وہ اللہ رکھی جیسی معصوم اور دکھیاری لڑکی کو اس کے لالچی چچا اور بڑھے دودے خان سے جلدی نجات دلانا چاہتا ہے..... جس کا طریقہ یہی ہے کہ وہ فوراً اللہ رکھی سے شادی کر لے۔

اس کی ماں نے یہ سب بغور سنا..... پھر چند ٹائیے کچھ سوچتے رہنے کے بعد ساون کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ”پٹ! یہ بات ہے تو..... پھر تو گزرتی نہ کر میں آج ہی تیرے باپ سے بات کروں گی۔ مجھے یقین ہے اسے بھی اعتراض نہیں ہوگا اس بات پر..... لیکن.....“ وہ اچانک کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

اس کی وجہ ساون فوری بھانپ گیا بولا۔ ”امڑ! تو پیسوں روپوں کی گڑنی نہ کر..... اس کا میں کہیں نہ کہیں سے انتظام کر لوں گا..... بلکہ پچاس ہزار سے دس بیس اوپر ہی گزروں گا..... اور مجھے یقین ہے اللہ رکھی کا حریص چاچا سوڈھل دودے خان کو چھوڑ کر اپنی بھیتھی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دے گا۔“

”لیکن پٹ ساون! اتنے روپوں کا تو بندوبست کرے گا کدھر سے.....؟“

ماں کی اس بات نے اسے فوراً جواب کر دیا تھا جس کا وہ فوری جواب تو نہیں دے سکا تھا مگر اس کے اندر کہیں اتنے سارے روپوں کے بندوبست کرنے کا حل موجود تھا..... لیکن جب یہی سوال اس کے باپ موگو نے ساون سے کیا تو..... ساون کو مجبوراً بتانا پڑا بولا۔

”وہ منشی..... مم..... میرل ہے نا..... وہ قرض.....“

”اس کا باپ کرجا (قرضہ) دے گا تجھے اپنی جیب سے ہیں.....“ موگو جل کر بیٹے سے بولا۔ ”ظاہر ہے منشی میرل وڈیرے بھوتار سائیں سے لے کر تجھے دے گا اور ایک بڑے سے رجسٹر پر تجھ سے انگوٹھا لگوائے گا..... اور مجھے یقین ہے تو ساری عمر تک اتنی بڑی رقم وڈیرے کو نہیں لوٹا سکے گا۔ ہاں یہ ہوگا کہ عمر بھر کی غلامی کا طوق تو ہماری گردنوں پر لگوا کر ہمیں حویلی کے قیدیوں میں شامل کرادے گا..... اور تب بھی وڈیرے کا صرف سود ہی ادا ہو گا سمجھتا تو.....“

ساون باپ کی جلی کٹی گفتگو پر بڑی طرح زچ ہونے لگا مگر پھر پُر عزم لہجہ اختیار کرتے ہوئے باپ کو جیسے قائل کرنے والے انداز میں بولا۔ ”پپو! میں جوان ہوں مگر ہوں..... میں خود اکیلا محنت کروں گا اور آہستہ آہستہ وڈیرے کا سارا قرض اتار دوں گا۔“

”نیسٹھ سالہ موگو بیٹے کی اس خطرناک معصومیت بلکہ ”بے خبری“ پر دہل سا گیا بلکہ اسے ترس آنے لگا اپنے بیٹے ساون پر۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس عشق کے بھوت کی زد میں آئے ہوئے ساون کو یہ کیسے سمجھائے کہ اس نے اتنی عمر وڈیرے کی حویلی میں صرف ”حاضر سائیں وڈا“ ”براہر سائیں بھوتار“ کرتے ہوئے نہیں گزار دی ہے بلکہ وہ حویلی کے بلند و بالا دروہام کو نجات دہندہ سمجھ کر اس میں گم ہو جانے والے اپنے جیسے ان غریب اور معصوم ہاریوں کے عبرتناک انجام سے خوب واقف تھا۔ جو قرض کی زنجیریں اپنے گلے پر باندھے قیدیوں سے بھی بدتر زندگی گزار رہے تھے۔ موگو..... نے جست کے میڑھے میڑھے کٹورے میں پانی لے کر کٹورے سے چند گھونٹ بھرے..... اس کے بعد ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بیٹے سے بولا۔

”دیکھ میڈا پٹ ساون.....! وڈیرے سائیں کا کرجا اتارنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا تو سمجھتا ہے۔ میں مانتا ہوں تیری بات کہ تو سخت محنت مجدوری کر کے کرجا لوٹا سکتا ہے لیکن..... لیکن..... یہ جو وڈیرے سائیں کا کھاتا ہے نا..... جس میں اس کا منشی میرل انگوٹھے لگواتا ہے..... شیطان کی آنت ہے۔ تو کرجے کی اگر دگنی رقم بھی لوٹا دے گا تو تب بھی اس منحوس رجسٹر میں تیرے ادا کئے ہوئے ایک پیسے کا بھی اندراج نہیں ہوگا اور بعد میں

تجھے پتہ چلے گا کہ تو تو ابھی سود ہی لوٹا رہا ہے..... اصل رقم تو ابھی تک رجسٹر میں کرجے کے طور پر تیرے نام درج ہے سمجھا.....“ بیٹے ساون کو اتنی صراحت کے ساتھ سمجھاتے ہوئے بے چارے موگو کا دم منہ کو آنے لگا اور فوراً قریب کھڑی اور جھلنگا چارپائی پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ اسے اب خشک کھانسی بھی شروع ہو گئی تھی۔ اسی اثناء میں ساون کی ماں اپنے شوہر کے لیے جست کے کٹورے میں پانی لئے بڑھی جو کافی دیر سے چپ کھڑی دونوں باپ بیٹوں کی گفتگو خاموشی سے سن رہی تھی۔ ساون خود کو جھل سا محسوس کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔

☆=====☆

دودا خان ساون کو دھمکانے کے بعد اس واقعے کو تقریباً بھول چکا تھا۔ وہ اس وقت اجرک کو بڑے سے رومال کی طرح کاندھوں پر رکھے..... اپنے گھر میں داخل ہوا۔ اس کا مکان کچی کی اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ جس میں ایک بڑا اور دو چھوٹے کمرے تھے جبکہ کچا صحن خاصا وسیع تھا۔ جہاں ایک جانب پھونس کے چھپر نما سا مہبان تلے دو بھینسیں کھڑی کے قریب کھڑی جگالی کر رہی تھیں اور ایک قدرے فربہ بی مائل کچی عمر کی عورت ذرا فاصلے پر نصب چارہ کاٹنے والی مشین کا گول بڑا سا پیہ چلا رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے ہری ہری تازہ گھاس کا گٹھا مشین میں ڈال رہی تھی۔ دودا خان نے ایک اچھتی سی نظر کام میں مگن اپنی بیوی خیراں پر ڈالی پھر صحن میں کھجور چارپائی پر دھم سے بیٹھ گیا۔ وہ کچھ زیادہ ہی تھکا ہوا معلوم ہوا رہا تھا۔ خیراں نے بھی اپنے شوہر کو دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنا کام ختم کر کے شوہر کی طرف آتے ہوئے بولی۔ ”آج پھر میرے محرم کو ہوٹل میں چھوڑ آئے۔“

”ہاں..... آج میں تھکا ہوا تھا سو چا آج گھر ہی جا کر روٹی کھاؤں اور ذرا آرام بھی کر لوں۔“ وہ سرسری سے لہجے میں بولا۔

اس کی بات پر خیراں نے ذرا منہ بسورا اور سامنے ہی بنی رسوئی میں چلی گئی..... تھوڑی دیر بعد اس نے ایک بڑے سے چھابے میں جوار کی روٹی اور دیسی گھی میں ساگ لا کر شوہر کے آگے رکھ دیا ایک چھوٹی سی تانبے کی کٹوری میں مکھن بھی تھا۔

”میرا پٹ! ہوٹل کی مانی نہیں کھاتا، پہلے بھی ایک دن تو اسے چھوڑ آیا تھا وہاں تو تیرے ہوٹل کی مانی کھا کر اسے تین دنوں تک دست لگے رہے تھے۔“

”کوئی قیامت تو نہیں آجائے گی ڈی..... اگر تیرا محرم خان ذرا دیر کو ہوٹل سنبھال لے گا تو اور ہاں..... میرے ہوٹل کی روٹی کی برائی مت کیا کر..... پورے داد پور میں

مشہور ہے میرے ہوٹل کا کھانا..... تیرے محرم کا معدہ ہی نازک ہے۔“ دودا خان نے قدرے چڑکریوی سے کہا اور چھابے سے روٹی کا نوالہ توڑنے لگا۔ خیراں ایک بلہ پھر منہ بناتی ہوئی قریب رکھی گھڑونچی کی طرف بڑھ گئی اور جست کے ایک بڑے سے کھلے منہ والے گلاس میں پانی لے کر دودا خان کی چارپائی کے قریب ہی زمین پر رکھ دیا اور پھر اس کے سامنے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”آپریں..... علی بخش کو بھی تو ذرا ہوٹل میں بٹھالیا کر..... ایک تجھے میڈاپٹ ہی نظر آتا ہے ہوٹل میں پھنسانے کو.....“ خیراں کا لہجہ احتجاج والا ہو گیا تھا۔

دودا خان کو اگرچہ اپنی بیوی کا لہجہ تاؤ دلارہا تھا مگر اس نے خود پر قابو پا کر رکھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ گرمی دکھانے کا کوئی فائدہ نہیں الٹا اپنی بھوک ہی مارے گا اور جب پیٹ بھر کر روٹی نہیں کھائے گا تو پرسکون نیند بھی نہیں لے سکے گا لہذا اپنے لہجے کو نرم رکھنے کی سعی کرتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”دیکھ ڈی خیراں! محرم شروع سے میرے ساتھ ہوٹل سنبھالتا آیا ہے..... وہ سیانا ہے ذرا پھر پٹ علی بخش بے چارے کا تو تجھے پتہ ہی ہے..... جب سے اس کی ماں مری ہے، وہ خود کو بہت اکیلا اکیلا محسوس کرنے لگا ہے اسی لیے میں اس پر زیادہ سختی نہیں کرتا۔“

”میڈاپٹ محرم جو تجھے مل گیا ہے سختی کرنے کے لیے۔“ خیراں ترنت بولی۔

”کیا مطلب ہے تیرا..... کیا محرم خان میڈاپٹ نہیں ہے، مجھے اس سے پیار نہیں۔“

دودا خان نے نوالہ نگلتے ہوئے اپنی بیوی کو گھور کر قدرے درشت لہجے میں کہا اور مزید بولا۔ ”ایک باپ کے لیے دونوں اولادیں سنبھلی ہوتی ہیں..... علی بخش نے اگر تیری کوکھ سے جنم نہیں لیا تو کیا تیری کوکھ سے پیدا ہونے والی اولاد مجھے کم عزیز ہوگی..... بے وقوف۔“ شوہر کے بگڑتے تیردیکھ کر یکدم خیراں نے پانسہ پلانا اور معتدل لہجے میں بولی۔

”سائیں! اب ایسی بات بھی نہیں کہ پٹ علی بخش نے اگر میری کوکھ سے جنم نہیں لیا تو مجھے اس سے پیار نہیں..... میں بھی اس بے چارے کا دکھ سمجھتی ہوں مگر میرے لیے جیسے میرا پٹ محرم خان ہے ویسا ہی علی بخش..... میں نے کبھی اسے اپنا سوتیلہ پٹ نہیں سمجھا، سگا ہی سمجھتی ہوں پر میں ذرا چاہتی ہوں کہ وہ مصروف رہے، کسی نہ کسی کام میں تاکہ اس کا دل لگا رہے اور اکیلا پن محسوس نہ کرے۔“

اس کی بات سن کر دودا خان کے چنٹ دار اور سیاہی مائل چہرے پر متاثر کن لہریں سی ابھری تھیں اور وہ ازراہ تفنن بیوی سے بولا۔ ”ہے تو تُو سیانی پر بھی کبھار عقل تیری دماغ

سے سرکنے لگتی ہے۔ ویسے کبھی تو ٹھیک ہی ہے کہ علی بخش کو واقعی کسی کام میں مصروف رہنا چاہئے..... پر کیا کروں تجھے تو پتہ ہی ہے کہ کام میں لگ کر بیٹھتا ہی نہیں..... اٹھ کر یکدم پتہ نہیں کدھر نکل جاتا ہے۔“ دودا خان نے اپنی بات ختم کی اور خیراں نے زبردستی اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائی تھی جو اس بات کی غماز تھی کہ ابھی ذرا دیر پہلے اس نے شوہر سے اپنے سوتیلے بیٹے علی بخش کے لیے جن جذبات کا اظہار کیا تھا، وہ محض تصنع پر مبنی تھے۔

☆=====☆=====☆

وہ بادی النظر میں ایک نیم پاگل اور لاوارث سانو جوان لڑکا دکھائی دیتا تھا مگر ایسا تھا نہیں البتہ اس نے شروع سے ہی جس ماحول اور جن حالات میں پرورش پائی تھی، وہ کچھ ایسے دیگرگوں اور نامساعد رہے تھے جو بچپن سے ہی کسی انسانی نفسیات کو اس قدر حساس بنا دینے کے لیے کافی تھے جن میں خطرناک حد تک پیچیدگیوں کی گانٹھیں پڑ جانا ایک لازمی امر بن جاتا ہے..... ایسا انسان اپنے خول میں مقید ہو جاتا ہے، نفسیات کی رو سے ایسے افراد معاشرے کو اپنا مجرم گردانے لگتے ہیں اور کسی بھی وقت اپنی خطرناک الجھی ہوئی نفسیاتی گرہ گزیدگی کا شکار ہو کر عام آدمی کو گزند پہنچانے سے بھی نہیں چوکتے اور ایسے ہی نفسیاتی مجرم جب کسی بڑے جرم کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں تو پہلے پاگلوں کی طرح ہنستے پھرتے تھکے لگاتے اور بعد میں رونے لگتے ہیں۔ یہ علی بخش تھا جو دودا خان کی پہلی مرحومہ بیوی حضوراں بی بی کے بطن سے تھا، تیس چوبیس سالہ اور قدرے دبلا پتلا سانولی رنگت کا یہ نوجوان علی بخش جس نے آنکھ کھولتے اور شعور سنبھالتے ہی اپنے گھر میں ہر سے ایک عجیب ہنگامہ ہی پیدا دیکھا تھا، ماں باپ کا آپس میں ہر وقت جھگڑا اور ہر سے اٹھا بٹھا، چیخ و پکار ان سب عوامل نے اس کی زندگی میں ایک نفسیاتی باجھل مچا دی تھی، اس نے ہمیشہ اپنی ماں کو باپ کے ہاتھوں پٹنے ہی دیکھا تھا، اس وقت علی بخش ایک معصوم بچہ تھا لیکن وہ ماں کے دکھ اور باپ کے مظالم کو سمجھتا تھا، جب اس کی ماں حضوراں بی بی تنہائی میں روتی تھی تو علی بخش اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اپنی ماں کے آنسو پونچھتے ہوئے کہتا۔ ”آمز جی جی! پیو برا انسان ہے..... تجھے مارتا ہے بہت۔“ لیکن جب خلاف توقع اس کی ماں الٹا علی بخش کو ہی سرزنش کرتی۔

”ناپٹ! آپریں بیو کو ایسا مت آکھ، بُری بات ہے یہ!“ تو علی بخش کا ننھا ذہن سخت حیرانگی کا شکار ہو کر رہ جاتا تھا شاید ماں کے اسی ایثار نے اسے ہاں..... نا..... برا اور بھلا کے بیچ جھلا کر رکھ دیا تھا..... وہ حیران ہو کر سوچتا تھا کہ باپ آخر ہے کیا شے..... جو ماں کو اتنا مارتا ہے، پیتا ہے لیکن پھر بھی ماں اسے برا نہیں کہتی اگرچہ دوران جھگڑا اس کے منہ



ہے، کیا ان کے دل اور ذہن اپنے سے کم عمری ”لڑکی“ کو ”ماں“ تسلیم کر لیں گے۔ شاہ لطیفؒ نے سچ کہا ہے۔

مشل مردار ہے جہاں کہ یہاں  
ہم نے دیکھی بشر میں خوئے سگال

☆=====☆=====☆

علی بخش گوٹھ کی شکستہ اور گرد آلود گلیوں میں آوارہ گردی کرنے کے بعد جب گھر پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ اندر کمرے میں اس کی سوتیلی ماں خیراں اور بھائی محرم خان چارپائی پر بیٹھے ایک ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ علی بخش چند ٹائیپے گھر کے کچے صحن میں کھڑے تاثری نظروں سے اندر کمرے میں دیکھتا رہا پھر ہولے سے کھنکارا۔ دونوں ماں بیٹے کھانا کھاتے ہوئے اسے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے ذرا چونکے۔ مگر انہوں نے اس پر خاص توجہ نہ دی۔ آج سردی قدرے کم تھی۔ علی بخش نے صرف اجرک ڈال رکھی تھی اپنے جسم پر۔۔۔۔۔ جسے یونہی سنبھالتا ہوا وہ اپنے دوسرے کمرے میں آ گیا۔ ویسے بھی علی بخش پر بیرونی موسموں کا کم ہی اثر ہوتا تھا پوری سردیاں وہ ایک اجرک لپیٹے ہی گزار دیا کرتا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ اس کا وجود شروع ہی سے اپنے اندرونی تیز و تند موسموں کی زد پر رہتا تھا۔ جن کی شدت بھی بیرونی موسموں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ ایک بے نام سی پیش اس کے اندر لہریں سی مارتی رہتی تھی۔ ہر سے۔۔۔۔۔ اور اس کے بے تاثر اور پُر سکوت چہرے سے یہی لگتا تھا جیسے وہ اپنے اندر ایک خاموش طوفان بلا خیز چھپائے ہوئے ہے۔

وہ کمرے میں آتے ہی چارپائی پر گر سا گیا۔ چند ٹائیپے یونہی بلب کی پہلی روشنی میں نہائی ہوئی کمرے کی کچی دیواروں کو گھورتا رہا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ اسے کچھ زیادہ ہی بھوک لگی تھی وہ چارپائی کو زور سے چرچراتے ہوئے اٹھا اور باہر نکل کر ساتھ والے کمرے کی چوکھٹ پر دیوار بن کر کھڑا ہوا گیا۔ اس کے چوڑے جتنے نے چوکھٹ کا خلا پُر کر دیا تھا۔ سامنے دونوں ماں بیٹے ہنوز کھانے میں مشغول تھے۔

”مجھے بھوک لگی ہے۔ روٹی کھانی ہے میں نے۔“ وہ عجیب سے کھرکھراتے لہجے میں بولا۔

”صدتے ونجاں۔۔۔۔۔ تیرے حکم تے۔ دوہی تو تیرے کام ہیں۔ سارا دن باہر آوارہ گردی کرنا اور کھانے کے وقت آکر روٹی دینے کا حکم چلانا۔“ اس کی سوتیلی ماں خیراں نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

سے شوہر کے لیے غلط الفاظ نکل جاتے لیکن جب علی بخش تنہائی میں باپ کی برائی کرنے لگتا تو ماں اسے ڈانٹ دیتی، باپ کے خلاف بولنے سے۔ اکثر دونوں کو شیر و شکر اور ہنسنے باتیں کرتے بھی دیکھا کرتا تھا مگر ایسا کم ہی ہوتا تھا۔۔۔۔۔ علی بخش کو پھر اپنی ماں بھی بڑی لگتی جو اس کے باپ کے ہاتھوں اتنی ماستہنے کے بعد بھی اسے برا نہیں کہتی تھی۔۔۔۔۔ اب جب بھی دونوں کے درمیان جھگڑا ہوتا، علی بخش خوف زدہ ہو کر گھر سے بھاگ جاتا اور کئی کئی گھنٹوں بعد لوٹتا ورنہ اکثر حضوراں بی بی کو ہی کسی نہر کے کنارے سے تو کبھی کبھو کے پیڑ تلے بیٹھے گم صم علی بخش کو پکڑ کر لانا پڑتا تھا۔

پھر یوں ہوا اس کی ماں نے چارپائی پکڑ لی۔۔۔۔۔ وہ بیمار رہنے لگی، اس کے چارپائی سے لگنے کی دیر تھی کہ علی بخش نے دیکھا اس کا باپ ایک دن بڑی جج دھج کے ساتھ ایک خوبصورت سی عورت گھر لے آیا اور ننھے علی بخش کو گھور کر بولا کہ یہ تیری چھوٹی ماں ہے، اس کی عزت کرنا۔ اپنے باپ دودا خان کے اس تحکمانہ انداز پر وہ سہم کر رہ گیا۔۔۔۔۔ ادھر اس کی ماں مستقل بیمار رہ کر بالآخر اللہ کو پیاری ہو گئی، اس کا باپ دودا خان نئی نیلی بیوی میں گم رہنے لگا۔۔۔۔۔ اسے ننھے علی بخش کی بھی پروا نہیں رہی تھی، جو ماں کے مرنے کے بعد ”ترخ“ چکا تھا، علی بخش کے ننھے ذہن میں اکثر یہ بات اچنبھے کا باعث بنتی تھی کہ اس کا باپ اس عورت (سوتیلی ماں) کی بہت ناز برداریاں اٹھاتا ہے۔۔۔۔۔ مارنا تو درکنار کبھی سخت لہجے میں اس سے بات بھی نہیں کرتا، اس کے آگے پیچھے گھومتا ہے، وہ معصومانہ حیرت سے سوچتا کہ آخر اس چھوٹی آزم میں ایسی کیا خوبی ہے جو اس کا باپ اس کے اتنے ناز اٹھاتا ہے جبکہ میری ماں سے ہر وقت لڑتا رہتا تھا۔ پھر اس کے بعد علی بخش، سوتیلی ماں کے مشق ستم کا نشانہ بنتا رہا۔۔۔۔۔ ادھر جب علی بخش کے سوتیلے بھائی محرم خان اور سوتیلی بہن شمع نے اوپر تلے جنم لیا تو اپنی ماں کا بقیہ ادھر علی بخش پر اتارنے لگے اور وہ بے چارہ ملغوبہ بن کر رہ گیا، اب دودا خان جو اپنی دوسری اور نوخیز بیوی خیراں کے عشق میں گم تھا، دو بچوں کی پیدائش کے بعد جب اس کی چاہت میں فطری ٹھہراؤ آیا تو اسے احساس ہوا کہ علی بخش جواب مکمل جوان ہو چکا تھا، کے ساتھ بہت زیادتی ہو گئی لہذا تب اس کے دل میں اپنے پہلے بیٹے کا درد جاگا لیکن تب تک وہ خود بوڑھا ہو چکا تھا اور علی بخش بے چارہ نفسیاتی مریض سا بن چکا تھا مگر اب پھر دودا خان کو تیسری شادی کا شوق چرایا تھا اور وہ بھی اللہ رکھی سے جو خود اس کی بیٹی شمع کی عمر کی تھی مگر دودا خان یہ بھول چکا تھا شاید کہ وہ اللہ رکھی نامی جس معصوم لڑکی کو شادی کے نام پر اس کے لالچی چاچا سوڈھل سے مبلغ پچاس ہزار میں بیاہ کر اپنے گھر لارہا

خیراں کی تضحیک آمیز نظروں کی طرف علی بخش نے صرف ایک لمحے کے لیے اپنی خاموش سرسراتی نظروں سے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ پھر خاموشی سے جب وہ اپنے کمرے کی جانب لوٹنے لگا تو عقب سے اسے ماں کی بیزار کن آواز سنائی دی۔ ”بیٹھ جازرا جا کر..... روٹی پہلے کھالیں ہم..... بعد میں لاتی ہوں تیرے لیے بھی..... مصیبت..... ہونہ۔“

ایک بار پھر وہ تضحیک آمیز لہجے کا نشانہ بنا تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے اس نے اپنے اندر ایک تاریک قبر بنائی ہو۔ جہاں وہ اپنی سوتیلی ماں کے لہجے کی کڑواہٹ اور طعن و تشنیع کا زہر اتار رہا تھا، لیکن اس کی سماعت سے ٹکرانے والے آخری لفظ ”مصیبت“ پر وہ غور کرنے لگا۔ جو ظاہر ہے اس کے لیے حقارت آمیز انداز میں کہا گیا تھا۔ وہ سوچنے لگا ”مصیبت“ وہ خود تھا یا اس کی سوتیلی ماں خیراں جو بذات خود ایک بڑی ”مصیبت“ بن کر اور اس کی ماں کے حق پر ڈاکہ ڈال کر ان کی ہنسی بستی زندگی پر نازل ہوئی تھی۔ علی بخش کیسے بھول سکتا تھا یہ بات کہ جب سے اس کے باپ نے اس کی مرحومہ ماں حضوراں بی بی پر خیراں جیسی چندال سوتن بٹھائی تھی تب سے وہ بیمار رہنے لگی تھی اور ان دونوں (حضوراں بی بی اور علی بخش) ماں بیٹوں کی خوشگوار زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ گئی تھی۔ جو آخر کار اس کی ماں کی اذیت ناک موت پر منج ہوئی تھی۔ علی بخش اپنی ماں حضوراں بی بی کی موت کا ذمہ دار پہلے اپنے باپ دودا خان اور پھر اپنی سوتیلی ماں خیراں کو سمجھتا تھا۔ کیونکہ وہ اس کی ماں سے ہر وقت لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ نئی نویلی تھی لہذا دودا خان بھی اسی کی حمایت کرتا تھا۔ وہ کافی دیر تک بھوکے پیٹ چار پانی پر لیٹا کھانے کا منظر رہا۔ کچھ دیر کے بعد اس کی ماں خیراں بڑبڑاتی ہوئی ایک بڑا سا چھابہ اٹھائے اندر داخل ہوئی اور اس کی جانب اس طرح بڑھایا جسے اگر علی بخش یکدم اٹھ کر فوری تھام نہ لیتا تو وہ چھابہ خیراں نے اس پر اچھال ہی دیا ہوتا۔

”لے کھامر لے اور سن، روٹی کے وقت سے ذرا پہلے آکر۔ نوکرانی نہیں ہوں تیرے باپ کی کہ تیرے لئے بعد میں روٹی چنتی پھروں۔“ پھر وہ بھناتی ہوئی واپس لوٹ گئی اور علی بخش خاموشی سے روٹی کھانے لگا۔

چاولوں کی روٹی پر ساگ رکھا ہوا تھا۔ علی بخش جانتا تھا کہ گھر میں دیسی گھی اور مکھن وافر مقدار میں موجود ہے اور وہ دونوں ماں بیٹے چیزیں کھاتے تھے جبکہ اسے سوکھی دیا کرتے۔ اس پر بھی وہ خاموش ہو رہتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ جب کبھی اتفاق سے اس کا باپ دودا خان اور یہ خود ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہے ہوتے تو اسے بھی چیزیں مل جایا کرتی

تھی، لیکن اس وقت بطور احتجاج وہ بغیر چڑی روٹی کھاتا۔

ابھی اس نے روٹی کے چند ہی نوالے حلق سے اتارے ہوں گے کہ کمرے میں اس کا سوتیلہ بھائی محرم خان داخل ہوا۔ وہ علی بخش سے جھوٹا تھا۔ جسم خاصا گٹھا ہوا اور قد قدرے کوتاہ تھا۔ چہرے پر مروڑیاں دی ہوئی مونچھوں نے اس کی سیاہ آنکھوں میں درشتگی اور چہرے کی نخوت میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ بھراٹے دار لہجے میں بولا۔ ”مجھے ابانے کہا تھا کہ روٹی کھا کر بعد میں ہوٹل آ جانا۔ پر میں نہیں جاؤں گا مجھے نیند آرہی ہے۔ تم روٹی کھا کر ہوٹل چلے جانا۔“ وہ گویا حکم صادر کر کے چلا گیا۔

علی بخش کھانے میں مشغول رہا لیکن محرم کی بات اسے قدرے ناگوار گزری تھی۔ تاہم کھانے سے فارغ ہو کر اس نے ہوٹل جانے کا قصد کیا اور اجرک اوڑھے باہر نکل آیا۔ سردیوں کے موسم میں گھٹھ کے کچے پکے گلیارے سنانا ہوجاتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ہوٹل پہنچا تو وہاں لوگ باگ خاصی تعداد میں ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھے۔ ٹی وی بلیک اینڈ وائٹ تھا کوئی پروگرام ہونہ۔ مگر لوگ ٹی وی کے آگے بیٹھے ضرور رہتے تھے اور پورے بارہ بجے ہوٹل بند ہو جایا کرتا تھا۔ علی بخش نے دیکھا اس کا باپ ”دغل“ پر بیٹھا روپے گن رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے قریب رکھے ایک اونچے سے چوٹی اسٹول پر جا بیٹھا۔ دودا نے اس کی آمد پر چونک کر اسے دیکھا اور بولا۔ ”محرم..... نہیں آیا؟“

جواباً علی بخش نے محرم خان کی بات دہرا دی۔ جسے سن کر دودا خان کے چہرے پر قدرے ناگواری کے آثار پھیلے۔ پھر وہ اس کے چہرے کی طرف تکتے ہوئے بولا۔ ”پٹ علی بخش تو بھی ذرا کام کاج کیا کر اور کچھ نہیں ہوٹل میں ذرا آ جایا کر..... تیرے بھائی محرم پر بھی کام کا بوجھ ذرا بٹ جایا کرے۔“

جواباً علی بخش نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”یہ تو ہر وقت اپنے چہرے پر چپ کیوں سجائے رکھتا ہے۔ کچھ بات چیت کیا کر۔“ دودا خان نے اچانک کہا اور علی بخش نے ایک بے نام سی نظر سے باپ کو دیکھا۔ اس کی باریک مگر چھدری مونچھوں تلے لبوں میں ارتعاش سا پیدا ہوا پھر جب وہ بولا تو یوں لگا جیسے سنائے چیخ رہے ہوں۔

”بابا..... مجھ سے ایسی گہری باتیں نہ پوچھا کر۔ ایسا نہ ہو کہ میرا کوئی گہرا جواب تجھے برا لگے۔ ویسے تو جانتا ہے اس طرح میرے لب کیوں سل گئے ہیں۔“

بیٹے کی بات پر دودا خان ذرا گومگوسا ہو گیا۔ اسے جانے کیوں اپنے بیٹے علی بخش کے لہجے میں عجیب صوفیانہ سا جلال محسوس ہوا۔ تاہم وہ آپس کے بوجھل پن کو رفع دفع کرنے کی نیت سے بات بدل کر بولا۔ ”دیکھ..... میڈاپٹ..... میں چاہتا ہوں تو مصروف رہے۔ منسے بولے۔ خیر اچھا..... تو بیٹھ..... دخل سنبھال۔ میں چلتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے دودا خان اپنے اونچے اور قدرے چوڑے لکڑی کے اسٹول سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر بلند آواز سے ہوٹل میں چائے وغیرہ سرو کرنے والے ایک پیش گار چھو کرے کو پکارا۔ ”اڑے منٹھا..... ادھر آؤ۔“

اگلے ہی لمحے ایک وبلا پتلا لڑکا کاندھوں پر میلی چیکٹ صافی رکھے قریب آ گیا۔ ”اڑے بابا..... سن میں جا رہا ہوں۔ علی بخش یہاں موجود ہے باقی گاہکوں کا حساب کر کے علی بخش کو دے دینا اور سن ہوٹل بند نہ کرنا آج رات۔ باقی چھو کروں کو جانے دینا۔ تو ادھر ہی سو جانا۔“

”خیر تو ہے سائیں..... کیا آج وزن پاڑیں (شراب، جو وغیرہ) کا ارادہ ہے؟“ منٹھا راہی ایک آنکھ میچ کر معنی خیز لہجے میں قدرے بے تکلفی سے بولا تو دودا خان خود کو بیٹے کے سامنے نجل سامحوس کرنے لگا اور چور نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے منہ پھٹ پیش گار چھو کرے منٹھا کو جھڑک کر بولا۔

”زیادہ بکواس نہ کر۔ جادفع ہو جو کہا ہے وہ کرنا چل جا۔“ وہ اپنا سر کھچاتا ہوا چلا گیا۔

علی بخش غیر محسوس انداز میں مسکرایا تھا۔ دودا خان چلا گیا۔ علی بخش دخل سنبھال کر بیٹھ گیا۔ اندر ہوٹل کے احاطے میں لکڑی کی بنجوں پر گونٹھ کے لوگ ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ سامنے ایک گارے مٹی کے اونچے سے چبوترے پر مختلف دیگچے چولہوں پر رکھے ہوئے تھے۔ جن میں انواع و اقسام کا سالن موجود تھا۔ اس کے ساتھ ہی تنور بھی تھا۔ جدھر ایک اکہری جسامت والا۔ ”تھپا تھپ“ روٹیاں لگا رہا تھا۔ ٹی وی میں آخری وقت کی خبریں نشر ہو رہی تھیں جس کی آواز بہت بلند تھی۔ علی بخش نے کاؤنٹر پر لگی گھنٹی بجائی۔ اسے ٹی وی کی اس قدر بلند آواز بُری لگ رہی تھی۔

”جی سائیں.....؟“ ایک پیش گار چھو کر قریب آ کر بولا۔ اس نے روٹی کی چھابی تھام رکھی تھی۔

”ٹی وی کی آواز آہستہ کرو جا کر۔“

”اچھا سائیں.....!“ کہتا ہوا وہ چلا گیا پھر علی بخش کاؤنٹر نما شوکیس کے نیچے خانے کی جانب جھکا اور اپنی پسند کی ایک آڈیو کیسٹ نکالی۔ یہ ایک بہت مشہور گلوکار سرد سندھی کے گانوں کی کیسٹ تھی۔ علی بخش نے ٹیپ ریکارڈر میں لگا دی۔

”جب اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے..... ہم بھی بہتیروں کو۔ بہتیروں کو ہم بھی۔ اشکوں میں بھگو چلیں گے۔ جب اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ جب اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔“

سرد سندھی کی پُرسوز آواز میں گیت جاری تھا اور علی بخش گانے کے دل سوز بول میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک کسی نے اسے پکارتے ہوئے چونکا دیا۔ یہ ساون تھا۔ ”اڑے آیار..... ساون کیا حال چال ہے بھئی۔“ علی بخش اسے پہچان کر دوستانہ لہجے میں بولا اور ساتھ ہی اسٹول سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں نے بھرپور طریقے سے معافہ اور بعد میں مصافحہ کیا اس کے بعد علی بخش نے ساون کو اپنے قریب ہی ایک دوسرے اسٹول پر بیٹھنے کو کہا۔ ساتھ ہی اس نے ٹیپ ریکارڈر کی آواز بھی کم کر دی۔

”اور سناؤ علی بخش کیسے ہو۔“ ساون نے رسماً احوال پوچھا۔

”میں چاک ہوں..... ٹوٹنا۔“ علی بخش خوشدلی سے بولا پھر اس نے ایک پیش گار کو چائے لانے کا کہا۔

گودہ دونوں کم ہی یوں ساتھ بیٹھتے تھے، لیکن باوجود اس کے ان کی دوستانہ گرمجوشی میں کمی نہیں آئی تھی۔ تاہم علی بخش کے لئے ساون کا اتنی رات گئے اس کے ہوٹل آنا اچنبھے کا باعث بنا تھا اس نے بغور ساون کا جائزہ لیا۔ وہ اسے کچھ الجھا ہوا نظر آیا۔ جیسے کچھ بتانا چاہ رہا ہو، لیکن قاصر ہے۔ بہر طور علی بخش نے یوں ہی بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”یار ساون! خیریت تو ہے نا..... یوں رات کو کوئی کام ہے تو بول۔“

اس کی بات پر ساون نے ایک لمحے کو پُر خیال نظروں سے اس کی جانب دیکھا پھر بولا۔ ”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں بس گزر رہا تھا۔ تو تیرے ہوٹل سے سرد سندھی کے گیت کی آواز سنائی دی۔ قریب آیا تو ”دخل“ پر تو موجود تھا مجھے حیرت ہوئی سو چلا آیا۔ میں نے سوچا مل بھی لیتے ہیں۔“

”اچھا کیا۔“ علی بخش دوستانہ خوشدلی سے بولا۔ اس دوران پیش گار چھو کرے نے دودھ پتی چائے کی کیتلی اور کپ رکھے تو علی بخش نے گلے سے بیس روپے نکالے اور پیش گار چھو کرے سے بولا۔ ”ڑے چھورا..... جا..... شمن بھنگ موالی کی مانڈلی سے گولڈ لیف کا

علی بخش اسے بغور دیکھ رہا ہے۔ تور کی آگ کی تپش دونوں کے وجود کو گرم کر رہی تھی۔  
 ”اب بھی تو نے پوری بات نہیں کی دوست۔“ علی بخش سگریٹ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے پُر خیال لہجے میں بولا۔ اس کے پُر اسرار لہجے پر ساون نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک رنگ سا آکر محو ہو گیا۔  
 ”ہاں..... تو سچ کہہ رہا ہے۔ تجھ سے کوئی اور ہی بات کہنی ہے۔ مگر.....“ ساون کہتے کہتے رک گیا۔

”دوستی کے درمیان ”مگر“ کی گنجائش مت رکھ ساون۔“ علی بخش بولا۔  
 ”معاف کرنا علی بخش..... ہماری دوستی زیادہ پرانی نہیں۔ ہو سکتا ہے ابھی ہمارے اندر اتنی دوستانہ وسعت نہ پیدا ہو سکی ہو اور میری کوئی بات تمہیں بری لگ جائے۔“ ساون نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اسے پرے اُچھال کر متانت سے کہا۔  
 ”ساون!..... شاید تیری بات ٹھیک ہو لیکن میں آج تک جن حالات سے گزرتا آیا ہوں انہوں نے ضرور میرے اندر ہر ناگوار بات سن کر اسے گوارا کرنے کا بھی حوصلہ پیدا کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے تم کہہ دو مجھ سے جو کہنا ہے۔“

ساون نے اس کی بات پر سوچتی ہوئی نگاہوں سے چند لمحے اسے دیکھا پھر بتانے لگا۔ ”علی بخش..... پیہ نہیں تم کیا سمجھو لیکن.....“ ساون پھر اٹکنے لگا۔ مگر علی بخش کو خاموش پا کر بالآخر اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا باپ دودا خان..... تیسری شادی کر رہا ہے۔“ یہ بتا کہ ساون علی بخش کا چہرہ تنکنے لگا۔ جہاں گہرے سناٹوں کا راج تھا۔  
 ”یہ میرے باپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ ویسے میں ابھی تک تیری بات نہیں سمجھ سکا ہوں۔“ علی بخش گونجیلی آواز میں بولا تو ساون بھانپ گیا کہ یہی نازک لمحہ ہے پوری بات کہنے کا۔ لہذا بولا۔

”علی بخش..... میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر وہ جس لڑکی سے شادی کر رہا ہے اس کی عمر بمشکل پندرہ سولہ سال ہے اور..... اور اس لڑکی سے میں خود شادی کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔“

ساون رکا تو علی بخش سناٹے دار لہجے میں بولا۔ ”بولتے رہو ساون رکو نہیں..... میں سن رہا ہوں۔“

ساون نے دوبارہ کہنا شروع کیا..... ”وہ لڑکی بہت معصوم اور حالات کی ستائی ہوئی

آدھا پکیٹ لے آ، کھلا ہوگا ابھی تک جاٹکڑا۔“ پھر ساون سے مخاطب ہوا۔ ”یار لے چائے پی۔ آج تو لگتا ہے جاڑا اچانک ہی اتر آیا ہے سگریٹ تور کے پاس بیچ رکھ کر پیش گے۔“  
 سردی واقعی ایک دم بڑھ گئی تھی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہوٹل بند ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ کچھ لوگ گھر جانے کے لیے پرتول رہے تھے تو کچھ مزید ٹی وی دیکھنے کے بہانے اور چائے وغیرہ کا آرڈر دے رہے تھے۔ ساون خاموشی سے چائے پینے لگا۔ اتنے میں چھوکر اسگریٹ کا آدھا پکیٹ لے آیا۔ دونوں اپنی چائے ختم کر چکے تھے۔  
 ”چل آ..... ساون آگ کے پاس سگریٹ پیتے ہیں۔“ علی بخش نے ”دغل“ چھوڑتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دونوں دوست تور کے قریب رکھی لکڑی کی بیچ پر آ بیٹھے۔ یہ حصہ ہوٹل کے چھپرے تلے تھا علی بخش نے ایک سگریٹ ساون کو پیش کی۔ دوسری اپنے ہونٹوں میں دبا کر ماچس سے اس نے سلگائی۔ پھر وہی دیا سلائی ساون کے قریب کی۔ جب ساون بھی اپنی سگریٹ سلگا چکا تو دونوں نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا۔  
 ”سردی کے موسم میں چائے کے بعد سگریٹ پینے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔“ علی بخش ایک ترنگ میں بولا۔ اب اس کے کھلے کھلے چہرے سے ذرا بھی یہ محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے یہی لڑکا چپ چپ تھا، لیکن یہ بھی کوئی خاص بات نہ تھی۔ وہ سوائے اپنے گھر والوں کے باہر کے لوگوں کے ساتھ نازل انداز میں ہی پیش آتا تھا اور ساون سے تو اپنے دل کا حال کہہ کر اسے زیادہ سکھ نصیب ہوتا تھا۔ گوان کی دوستی اتنی پرانی نہیں تھی، لیکن بہر کیف اتنی پرانی ضرور تھی کہ دونوں ایک دوسرے سے اپنے دل کا حال کہہ سن لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ علی بخش کے گھریلو حالات، سوتیلی ماں اور بھائی کا ناروا سلوک۔ باپ کی طرف سے بے توجہی، ان سب باتوں سے ساون آگاہ تھا اور یہ بھی واقعی امر تھا کہ اب جب کہ ساون نے علی بخش کو اپنے دل کا حال سنانے کا ارادہ کیا تھا تو اس کی زبان پر چپ سی لگ گئی تھی مگر علی بخش اس کے چہرے کے کھنچاؤ سے بخوبی اندازہ لگا چکا تھا کہ ساون آج اس سے کوئی خاص بات کرنے آیا ہے۔

”چل بول۔ اب جھجک چھوڑ۔ نہ تیری مجھ سے چھپی ہوئی ہے نہ میری تیرے سے۔ بول کیا بوجھ ہے تیرے سینے میں۔“ بالآخر علی بخش سگریٹ کا ایک کش لگاتے ہوئے ساون سے بولا۔ ساون جان گیا اب چپ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تاہم پھر بھی وہ محتاط ہو کر بولا۔  
 ”یار..... علی..... بس یوں سمجھ کہ مجھے ایک لڑکی پسند آگئی ہے۔“

ساون کا خیال تھا کہ علی بخش اس کی بات پر ہنسے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس نے محسوس کیا

ہے۔ اپنے ظالم اور لالچی چاچا کے پاس رہتی ہے جو اسے پچاس ہزار کے عوض۔  
 ”بس ساون!“ علی بخش اس کی بات کاٹتے ہوئے جھٹکے دار لہجے میں بولا۔ ”تو  
 اب جا۔۔۔۔۔ میں سب سمجھ گیا ہوں۔“

ساون نے دیکھا علی بخش کا چہرہ عجیب سے ارتعاش کا شکار تھا۔ ساون نے بھی  
 مزید رکنا پسند نہ کیا اور وہاں سے فوری چلا آیا۔ واپسی میں جانے کیوں اسے رہ رہ کر ایک  
 کسک سی ہونے لگی، وہ سوچنے لگا کہ اسے یہ بات علی بخش سے نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ یقیناً  
 دونوں باپ بیٹوں کے بیچ فساد کا سبب بنے گی مگر پھر اس کا دل کہتا کہ اس نے جو کیا درست  
 کیا۔۔۔۔۔ محبت انسان کو خود غرض بنادیتی ہے۔۔۔۔۔ بے شک اس میں خود اس کی اپنی غرض شامل  
 تھی، لیکن بہر طور ایک معصوم اور سادہ لوح لڑکی کی زندگی کا بھی سوال تھا جو بوالہوسی کا شکار ہ  
 کر زندہ درگور ہونے جا رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

سہ پہر کا وقت تھا۔۔۔۔۔ اللہ رکھی بے دلی کے ساتھ اپنے دونوں بیٹوں، سانولے اور  
 ہیرے کے لیے کھری میں ”کتر“ کیا ہوا چارہ ڈال رہی تھی۔۔۔۔۔ درحقیقت اسے کام نہمانے  
 کی عجلت تھی۔۔۔۔۔ وہ غمزدہ بھی نظر آ رہی تھی۔۔۔۔۔ چاچا سو ڈھل باہر گیا ہوا تھا۔۔۔۔۔ اور چاچی  
 عنایتاں اندر کوٹھڑی میں حسب معمول انوائی کھٹوائی لے کر پڑی ہوئی تھی۔ اللہ رکھی کو آج  
 کل ساون سے ملنے کی بڑی جلدی ہوتی تھی اور وہ تقریباً روز ہی اس سے ملاقات کرتے  
 ہی سب سے پہلے یہی پوچھتی تھی کہ ”اب کیا ہوگا۔۔۔۔۔؟“

بے چارہ ساون کیا جواب دیتا۔۔۔۔۔ بجز سیدہ خاطر ہونے کے۔۔۔۔۔ اللہ رکھی روزانہ  
 اس امید کے ساتھ اس سے ملتی کہ شاید اس نے کوئی ”حل“ ڈھونڈ لیا ہو۔۔۔۔۔ بے چاری اللہ  
 رکھی کو جب سے اپنے لالچی چاچا کے ”عزائم“ کا پتہ لگا تھا اس کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔  
 مگر وہ ایک مجبور، سادہ لوح معصوم سی لڑکی تھی۔۔۔۔۔ بڑوں کے فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم  
 کرنے والی۔۔۔۔۔ اس میں اپنے چاچا کی سرتابی کرنے کی ہمت نہ تھی اور نہ ہی وہ اس ظلم پر  
 صدائے احتجاج بلند کر سکتی تھی کہ اسے کیوں ایسے شخص کے ساتھ بیاہا جا رہا ہے جو اس سے  
 دگنی نہیں بلکہ تگنی عمر کا ہے۔ بہر طور اللہ رکھی کو آج بھی ساون سے ملنے کی جلدی تھی۔ لہذا اس  
 نے جلدی جلدی کام نہمایا۔ صحن کے ایک کونے پر رکھی گھڑوچی سے خالی گھڑے اٹھائے  
 اینڈ وائس پر دھرا بعد میں اوپر تلے دو مٹکے رکھے اور تیسرا کر پر رکھ کر گھر سے باہر نکل آئی۔  
 باہر کچے کچے مکانوں کی منڈیوں پر ٹھہرتی شام پر تو لے کھڑی تھی۔۔۔۔۔ ماسٹر محمد حسین کی

آنے کی بجلی کی مخصوص آواز اب ماند پڑ چکی تھی۔ اللہ رکھی تیز تیز قدموں سے گوٹھ کی چکی  
 چکی اور نیزھی میٹھی گلیوں میں سے ہوتی ہوئی لہلہاتے کھیتوں کے درمیان سے گزرتی  
 سانپ کی طرح بل کھاتی پگڈنڈی پر ہوئی۔۔۔۔۔ اب اس کے دائیں بائیں سرسوں اور تلوں  
 کے کھیت تھے۔۔۔۔۔ گوٹھ کی گلیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ پھر جب پگڈنڈی کے سرے پر ایستادہ  
 آسریں۔۔۔۔۔ کے ایک چھتار پیڑ تلے سے گزری تو مذکورہ پیڑ کے تنے کی اوٹ سے دودا  
 خان شکرے جیسی نظروں سے اللہ رکھی کو جاتے دیکھنے لگا۔۔۔۔۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ موٹے تنے  
 والے پیڑ کے عقب سے نکلا اور محتاط روی سے اللہ رکھی کے تعاقب میں ہولیا۔

ادھر اللہ رکھی اپنے تعاقب سے بے خبر تیز تیز چلی جا رہی تھی۔۔۔۔۔ اب اسے ذرا ہی  
 فاصلے پر سامنے نہر کا کراڑ دکھائی دینے لگا تھا۔ جدھر کانٹے دار خود رو پودوں کی بہتات تھی  
 وہاں اسے کچھ عورتیں اور لڑکیاں بھی پانی سے بھرے مٹکے سروں پر کرپراٹھائے لٹوتی نظر  
 آئیں۔۔۔۔۔ اللہ رکھی دانستہ ایسے وقت میں پانی بھرنے جاتی تھی جب دوسری لڑکیاں اور  
 عورتیں واپسی لوٹ رہی ہوں۔۔۔۔۔

”اڑی۔۔۔۔۔ اللہ رکھی۔۔۔۔۔ تجھ پر روز دیر ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ خیر تو ہے نا۔۔۔۔۔ کوئی ”راز“ تو  
 نہیں۔۔۔۔۔“ اس کے قریب سے گزرتی ہوئی من چلی حسنہ نے معنی خیر انداز میں لفظ ”راز“ پر  
 زور دیتے ہوئے اللہ رکھی سے کہا تو اللہ رکھی ایک ٹائپے کو گڑ بڑا سی گئی۔۔۔۔۔ اس کی نظروں کا  
 چور عیاں ہونے لگا۔ تاہم وہ بمشکل مسکرا کر رہ گئی۔۔۔۔۔ اللہ رکھی اب کراڑے پر چڑھ چکی  
 تھی اور ساتھ کن آنکھوں سے اپنے اطراف میں بھی دیکھنے لگی۔۔۔۔۔ جہاں آس پاس نہ صرف  
 قد آدم خود رو جھاڑیوں کے جھنڈ تھے بلکہ کہیں کہیں لئی اور ببر کے پیڑ بھی تھے۔۔۔۔۔ اللہ رکھی  
 اب نہر کے کنارے بیٹھ کر مٹکوں میں پانی بھرنے لگی۔۔۔۔۔ تب اسے نہر کی شفاف سطح پر کسی کا  
 ہیولا لہریں مارتا نظر آیا۔۔۔۔۔ اللہ رکھی نے یکدم اپنے عقب میں دیکھا اور غیر متوقع طور پر  
 سامنے دودا خان کو پا کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ عالم اضطراب میں مٹکے چھوڑ کر  
 کھڑی ہوئی۔۔۔۔۔ دو مٹکے تو گیلی مٹی میں دھنسنے لگے جبکہ تیسرا مٹکا پانی کے ساتھ بہہ گیا۔۔۔۔۔  
 انجانے خوف سے اللہ رکھی کا دل بے تحاشہ دھڑکنے لگا۔۔۔۔۔ وہ بے اختیار دودا خان سے ذرا  
 چند قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔۔۔۔۔ دودا خان اسے خشگیں نظروں سے گھور رہا تھا۔۔۔۔۔ اس کے  
 ایک ہاتھ میں بارہ بور کی بندوق دبی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ اللہ رکھی پر سخت گھبراہٹ سی طاری تھی  
 اسے اور کچھ تو نہ سوجھا۔۔۔۔۔ نیچے جھکی۔۔۔۔۔ زمین پر رہے اینڈ وائس کو سر پر رکھا پھر دونوں مٹکے  
 سنبھالتی ہوئی اٹھنے لگی تو اس کی سماعت سے دودا خان کی آواز نکل گئی۔۔۔۔۔ ”اللہ رکھی!“

دودا خان کی طرف ترحم آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”نہیں دودا خان..... تیکوں رب دادا واسطہ..... خون خرابہ نہ کر..... ساون بے قصور ہے۔“

”اللہ رکھی آگے سے ہٹ جاؤ..... آج اس بات کا فیصلہ ہو لینے دے..... یہ تجھے اپنی ملکیت کب سے سمجھنے لگا ہے۔“ ساون غیظ آلود لہجے میں دودا خان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا..... اور ساتھ ہی اس نے اللہ رکھی کو ایک ہاتھ سے اپنے سامنے سے پرے ہٹا دیا۔

ساون کی ”ملکیت“ والی بات پر دودا خان کی آتش ناک آنکھوں میں ایک لمحے کو الجھن سی تیر گئی..... تاہم وہ کھرکھراتے ہوئے لہجے میں بولا..... ”اللہ رکھی کو میں اس کے وارثوں سے اپنے نام کراچکا ہوں..... یقین نہیں آتا تو پوچھ لے اس کے چاچا سوڈھل سے..... لیکن اگر اس کے مالکوں سے پوچھنے کے بعد بھی تو اللہ رکھی کے سامنے آیا تو..... تو سمجھ جائیں تیرا کیا حشر کروں گا.....“ آخری جملہ اس نے قدرے توقف سے ادا کیا اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ ساون کے وجود میں ایک ایسی مزاحمتی جنبش ابھری لیکن اللہ رکھی نے اس کے جسم کا ارتعاش محسوس کرتے ہوئے اسے روک دیا۔

”نہیں ساون! دھڑیں واسطے جانے دے اس مردودے کو.....“

”اللہ رکھی! بس اب بہت ہو گیا..... مجھے اس کا کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا پڑے گا.....“ ساون فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

اللہ رکھی بے چاری زمین پر ٹوٹ کر بکھرے ہوئے منکوں کو دیکھنے لگی تو ساون کا دل بے اختیار اس کی معصوم اداسی پر بھر آیا..... ”اللہ رکھی.....! چل میں تجھے ابھی ساگی کی ہٹی سے منگے لے دیتا ہوں..... ورنہ چاچا تیری خفا ہوگی تجھ پر۔“

اللہ رکھی ساون کے ملائمت بھرے لہجے پر مسرور سی ہو گئی اور وہ معصومیت سے سوچنے لگی کہ اس کے ساون کو اس کا کتنا خیال ہے۔

”کیا سوچنے لگی اللہ رکھی.....؟“ اسے خاموش پا کر ساون اس کے صبح چہرے کو دیکھتے ہوئے محبت پاش لہجے میں بولا..... تو اللہ رکھی کا دل جانے کیوں تپج گیا..... اور وہ بے اختیار لہجے میں بولی۔

”ساون“ میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتی..... مجھے اس دودا خان سے بچا لو..... وہ مجھے خریدنا چاہتا ہے۔ کیا..... ساون..... تمہارے پاس اتنے بھی پیسے نہیں ہیں کہ تم اس مردودے خان سے بڑھ کر بولی لگا کر مجھے میرے چاچا سے خرید لو.....؟“

ساون اللہ رکھی کی بات سن کر دنگ رہ گیا..... اللہ رکھی کے لہجے کی بے بسی و بے چارگی

تو پاڑیں بھڑاں نہ آیا کر.....“ اللہ رکھی نے صرف ایک لمحے کے لیے اس کی بات پر ٹھکتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر خاموشی سے تیز تیز چلتی ہوئی آگے ہوئی۔ وہ اتنی ہراساں ہو گئی تھی کہ اس نے اپنے عقب میں بھی دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ آیا دودا خان اس کے تعاقب میں ہے یا نہیں..... معاً پھر جب وہ آگے ایک آسریں کے پیڑ کے نزدیک سے گزرنے لگی تو ٹھٹھک کر رک گئی..... سامنے ساون اجرک اوڑھے کھڑا مسکرا رہا تھا..... اس کے کاندھوں پر کلہاڑی بچی ہوئی تھی..... ساون نے جب اللہ رکھی کے بھولے بھالے حسین چہرے پر گہرا ہٹ اور وحشت کی لہریں محسوس کی تو اسے تشویش ہوئی۔

”کیا بات ہے اللہ رکھی!..... تو اتنی پریشان کیوں ہے.....؟“ اللہ رکھی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور مضطرب سی نگاہوں سے اپنے عقب میں دیکھا تو وہ مزید ہراساں نظر آنے لگی..... ساون نے بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو اسے دودا خان نظر آ گیا۔ تب اسے خود ہی اپنے سوال کا جواب مل گیا کہ اللہ رکھی کیوں اتنی ہراساں ہو رہی تھی۔

”س..... ساون تو چلا جا..... یہ تجھے مار نہ دے.....“ معاً اللہ رکھی پر تشویش لہجے میں ساون کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

دودا خان کو اللہ رکھی کے تعاقب میں آتے ہوئے دیکھ کر ساون کی آنکھوں میں ایک ایسی خون کی سرخی اتر آئی تھی پھر یونہی اس کا ہاتھ اپنے کاندھوں پر بچی کلہاڑی کے دسے پر رینگ گیا..... اسی اثناء میں دودا خان بھی دور سے ہی ساون کی جانب گھورتا ہوا قریب آ گیا اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بندوق کو دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے گرجدار آواز میں ساون سے بولا۔ ”اللہ رکھی کا راستہ کیوں روک رکھا ہے تونے.....“

اس کے غصیلے لہجے نے ساون کے تن بدن میں جیسے آگ بھردی۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ بھی بلند آواز میں گرج کر بولا تو اس کے لہجے سے شعلے لپکتے محسوس ہونے لگے۔ ”دودا خان..... میں اس لہجے کا عادی نہیں ہوں لیکن..... تیری پیرسنی کا خیال آتا ہے..... مجھے ورنہ.....“

ساون کے لہجے کی دھمکی پر دودا خان جیسے آگ بگولہ ہو گیا..... اور اس نے اپنی بندوق ساون پر سیدھی کر لی یہ دیکھ کر اللہ رکھی دھک سے رہ گئی..... ساون اپنی جگہ ”کیل“ بنا دودا خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے شعلے بار نظروں سے تک رہا تھا..... اللہ رکھی کے حلق سے ایک چیخ نکلی اس نے پانی سے بھرے منگے پھینک دیئے اور یکدم ساون کے آگے آ کر

پراس کا دل کٹنے لگا..... وہ بے اختیار ہو کر محبت بھرے جذبات سے لبریز..... مگر مضبوط لہجے میں بولا..... ”اللہ رکھی تو فکر نہ کر میرے جیتے جی تو کسی ”کالے پیری“ کے ہتھے نہیں چڑھ سکتی۔ تجھے پانے کے لیے تو میں ساری دنیا کی دولت لاکر تیرے چچا کے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا اور تجھے اپنا بنالوں گا..... لیکن اللہ رکھی..... اس کا یہ مطلب نہیں کہ تیرا مول یہ روپے ہیں..... تو تو ان مول ہے اللہ رکھی..... ساری دنیا کی دولت تیرے آگے بیچ ہے۔“

”ہاں ساون! میں جانتی ہوں..... مگر میرا چاچا ایک نہایت حریص انسان ہے..... مجھے یقین ہے ساون..... اگر تو نے اس مردود و دودے خان سے دس بیس ہزار زیادہ دے دیے تو وہ فوراً میرا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دے گا.....“ اللہ رکھی نے جیسے اسے گراں قدر مشورے سے نوازا..... اور ساون اس کی بات پر دھیرے دھیرے پُر خیال انداز میں اپنے سر کو تھپی میں جنبش دینے لگا۔

اللہ رکھی سے ملنے کے بعد اب ساون نے مصمم ارادہ باندھ لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، وہ اللہ رکھی کو حاصل کرنے کے لیے وڈیرے سے قرض ضرور مانگے گا..... یہ فیصلہ کرتے ہوئے اس کے دماغ میں باپ کی تنبیہ بھی گونجنے لگی کہ جو ایک بار وڈیرے کا قرض دار ہو جاتا ہے تو وہ ساری عمر قرض کے ”پٹے“ سے اپنی گردن نہیں چھڑا سکتا۔ لیکن اس نے اس کی بھی پروا نہیں کی اور سیدھا وڈیرے کی اوطاق میں پہنچا..... حسب توقع اسے منشی میرل منکن ہار..... نظر آگیا۔ وہ سر کندوں کا ایک کشادہ پشت گاہ رکھنے والے مونڈھے پر تانا ہوا بیٹھا رجسٹر گود میں پھیلائے اندراج میں مگن تھا۔ سامنے اس کے چند مجہول اور مفلوک الحال ہاری پکی اینٹوں کے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔

”سلام علیکم منشی سائیں۔“ ساون اس کے روبرو آکر بولا تو منشی میرل نے چونک کر سر اٹھایا اور اپنی چھچھوند جیسی آنکھوں سے مونڈے کا لے فریم والا چشمہ اتار کر ساون کو اپنے روبرو پایا تو اس کے خاکستری مائل باریک ہونٹوں پر مکارانہ مسکراہٹ چھیلی چلی گئی..... اور وہ لہکتی ہوئی آواز میں ساون کے سلام کا جواب دیتے ہوئے مونڈھے پر بیٹھے بیٹھے بولا۔

”آؤ..... آؤ ساون..... بسم اللہ..... کیسے آنا ہوا؟“

وہاں فرش پر بیٹھے دوسرے ہاری ساون کی منشی میرل کے ہاتھوں اس عزت افزائی پر جل سے گئے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ساون کا باپ موگو بھی انہی کی طرح کا ایک عام غریب ہاری ہے۔ یہی نہیں اس نے ساون کو اپنے قریب میں ایک دوسرے مگر قدرے چھوٹے مونڈھے پر بیٹھنے کو بھی کہا..... ساون چپ چاپ بیٹھ گیا..... چند ثانیے منشی میرل

خاموش اور کھوئے کھوئے بیٹھے ساون کو اپنی چندھی آنکھوں سے گھورتا رہا پھر بولا..... ”ساون..... بابا تجھے جلدی تو نہیں ہے نا..... میں پہلے ذرا انہیں فارغ کر دوں پھر تجھ سے بھی حال و احوال کرتے ہیں..... ٹھیک ہے نا بابا۔ ویسے لگتا ہے تو آج کوئی اہم بات کرنے آیا ہے۔“ بالآخر منشی نے دل کی بات ساون سے کہہ ہی ڈالی اور ساون قدرے چونک کر اس کا لمبوتر اچرہ ہٹکنے لگا۔ منشی میرل نے پھر جلدی جلدی سامنے بیٹھے ہاریوں سے کچھ پوچھ تاچھ کر کے ان کے ہاتھ کا ایک ایک انگوٹھا رجسٹر پر لگانے کے بعد..... اپنی بیش قیمت کپڑے کی بنی ہوئی کمری کی اندرونی جیب سے چند بڑے نوٹ نکال کر انہیں تھماتے ہوئے رخصت کر دیا۔

”ہاں بابا..... ساون..... کیا بات ہے..... بولو۔“ وڈیرے کے ساتھ رہ کر منشی میرل منکن بار کا لہجہ بھی اسی جیسا ہو گیا تھا..... یا پھر دانستہ طور پر اس نے ایسا لہجہ اپنالیا تھا۔ ”منشی..... مجھے روپے چاہئیں تھے..... کچھ.....؟“ ساون نے جھجک بولا۔ اس کی بات پر منشی دھیرے سے عجیب انداز میں مسکرایا تھا..... ”کتنے چاہئیں؟“ اس نے بھی بولنے میں دیر نہیں کی تھی۔

”پچاس ہزار۔“ ساون نے کہا تو منشی میرل بھک سے ہو گیا اس کا خیال تھا کہ ساون یہی کوئی دس پندرہ ہزار مانگے گا اس نے ایک نظر بغور ساون کو دیکھا یوں جیسے اندازہ کرنا چاہ رہا ہو..... کہ آیا جتنی مالیت کا وہ قرض مانگ رہا ہے اتنی..... ادائیگی کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

”پچاس ہزار۔“ منشی میرل کے منہ سے نکلا..... ”کیا کوئی زمین خرید رہا ہے؟“ ”شادی کرنی ہے میں نے.....“ ساون بولا۔ ”شادی کے لیے اتنے روپے؟ کیا کوئی پری بیاہ رہا ہے۔“ منشی تحیر آمیز طنز سے بولا تو ساون کو قدرے ناگوار گزری اس کی بات..... یہی وجہ تھی کہ فوراً اسی لہجے میں بولا۔ ”منشی! یہ میرا معاملہ ہے..... تو تفصیل میں کیوں جاتا ہے..... اگر دینا چاہتا ہے تو بات کر..... ورنہ تیری مرضی۔“

”واہ سائیں صدقے و نجاں تیری ڈھٹائی کے..... قرضہ بھی مانگتا ہے تو کلباڑی کی دھار پر.....“ منشی بدستور طنز یہ لہجے میں بولا.....

”مفت میں نہیں مانگ رہا..... سود پر لے رہا ہوں.....“ ساون نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”کب تک چاہیے؟“ منشی بالابولا۔

”جتنی جلدی ہو سکے۔“ ساون جوابا بولا۔

”اچھا ٹھیک ہے..... تو ایسا کرو..... وڈی راسائیں ابھی یہاں نہیں ہے..... میں کل تک اس سے بات کروں گا تو کل اس سے یہاں اوطارے میں آجانا..... کوشش کروں گا تیرا کام کرنے کی.....“ منشی کی بات پر جب ساون اٹھ کر جانے لگا تو منشی میرل نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور بولا۔

”ساون بابے..... میری کمیشن تو دے گا نا.....؟“

”ہاں..... تجھے خوش کروں گا.....“ ساون نے مختصر کہا اور وہاں سے چلا آیا۔

سارے راستے اس کا دماغ بوجھل سا محسوس ہو رہا تھا..... اگرچہ اسے یہ سب عجیب اور مشکل بھی لگ رہا تھا مگر..... جب اللہ رکھی کا معصوم اور خوبصورت چہرہ اس کے پردہ تصور میں ابھرتا اور اس کی نوخیز جوانی کی معصوم مہک اس کے روم روم میں اترتی محسوس ہوتی تو وہ ہر ان خدشات اور اندیشوں سے خود بخود یکسر بے نیاز ہوتا چلا جاتا..... جو اسے اس کے مصمم ارادے سے متزلزل کرنے لگتے تھے.....

وہ گرد آلود راستے پر چلا جا رہا تھا..... پھر تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھر میں داخل ہوا تو شام ہو چکی تھی البتہ موسم میں سردی کی بخ بستی عنقا تھی..... گھر میں اس وقت صرف ایک ماں موجود تھی مگر وہ بھی اس کی منتظر تھی..... وہ رسوئی سے باہر نکل رہی تھی بیٹے کو دیکھتے ہی بولی۔ ”پٹ ساون! چنگا تھیا توں آگیا..... تو گھر میں بیٹھ میں ماسی حلیمیاں سے مل کر آتی ہوں ذرا..... پتہ نہیں بے چاری بیمار شمار ہو گئی ہے.....“

”اچھا آمڑ..... تو جا بے شک.....“ یہ کہتے ہوئے ساون کشادہ مگر کچے صحن میں بچھی کھری چار پائی پر جوتوں سمیت پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا..... ساون کی ماں اتنے میں اندرونی کوٹھڑی سے سفید رنگ کا چٹ دار گھیر والا ٹوپی والا برقع لے آئی اور اسے اوڑھ کر باہر چلی گئی۔

گارے مٹی سے لپٹی ہوئی کچی دیواروں نے صحن کے گرد وسیع احاطہ سا بنایا ہوا تھا..... جس کی ایک جانب بالترتیب تین کمرے نما کچی کوٹھڑیاں بھی بنی ہوئی تھیں..... کمروں کے سامنے رخ پر دیوار کے ساتھ ساتھ باورچی خانہ اور ذرا سا آگے غسل خانہ تھا..... صحن کے وسط میں بیری کا گھنا پیڑ تھا..... دوسری جانب دیوار کے کونے والی جگہ پر پھونس کے چھپرے تلے دو بھینسیں جگالی کر رہی تھیں۔ جبکہ ان کے سامنے کھری کئی سے بھری

ہوئی تھی..... دیواروں پر جا بجا پلے بھی تھپے ہوئے تھے۔

ساون چار پائی پر اپنے دونوں ہاتھوں کے پنچے ملائے سر کے نیچے دیئے چت لینا آسمان کو نکتے جارہا تھا۔ وہ کسی عمیق سوچ میں غلطاں تھا کہ اچانک اس کی سماعت سے ایک کھٹکتی ہوئی شوخ سی ہنسی نکرائی اس نے چونک کر آواز کی سمت گردن موڑ کر دیکھا تو سامنے والی دیوار سے اس کی چچازاد سورتھ کا گورا چہرہ نظر آیا۔ وہ اس کی جانب دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ ”اکیلا ہے گھر میں تو۔ چاچی کہاں گئی؟“

ساون کے چہرے پر بیزاری سی پھیل گئی تاہم جی کڑا کر کے بولا..... ”آمڑ..... ماسی حلیمیاں کے ہاں گئی ہے.....“

”میں بھی آج گھر میں اکیلی ہوں ادا گل محمد اور پیو شہر گئے ہوئے ہیں..... اماں بھی نہیں ہے تو ایسا کر“ کھائے سے آجا میرے پاس، باتیں کرتے ہیں، بڑا مزہ آئے گا.....“ سورتھ نے بتایا تو ساون کو جیسے چپ سی لگ گئی..... اسے کبھی کبھی سورتھ کی ایسی دیدہ دلیری پریشان کرنے لگتی تھی..... بلکہ اکثر تو وہ اس کی آزادانہ روش پر خوف زدہ بھی ہو جاتا تھا۔ تاہم وہ قدرے سخت لہجے میں بولا۔

”دیکھ سورتھ! میں ذرا دوسرے مزاج کا لڑکا ہوں۔ میرے ساتھ زیادہ باتیں بنانے کی کوشش نہ کیا کر جا..... ہٹ یہاں سے.....“ اس کی جھڑکی کا گر ثابت نہ ہو سکی تھی کیونکہ اگلے ہی لمحے سورتھ اس کے درشت لہجے کی پروا کئے بغیر بولی۔

”اسی لیے تو تو مجھے اچھا لگتا ہے کہ تو“ دوسرے مزاج“ کا لڑکا ہے۔“ پھر چند ثانیے توقف کے بعد ساون کا موڈ بنانے کی سعی کرتے ہوئے بولی..... ”اچھا چل تو نہیں آتا تو نہ آ..... میں خود“ کھائے“ (دیوار میں نصب آدم گزار کھڑکی) سے آجاتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے سورتھ کا چہرہ منڈیر سے غروب ہو گیا..... ساون اس کی بات پر بھک سا رہ گیا..... اسے جان چھڑانا مشکل ہو رہی تھی..... وہ فوراً چار پائی سے اٹھا اور دیوار کی جانب بڑھا جہاں آدم گزار کھڑکی نصب تھی۔ اس کے پار دوسری طرف ساون کے چاچا پیرل کا گھر تھا..... عمو نا دیوار میں بنی اس دروازہ نما کھڑکی سے دونوں گھروں کی عورتیں آیا جایا کرتی تھیں..... دوسری جانب پیرل اپنے بیوی بچوں گل محمد اور بیٹی سورتھ کے ساتھ رہتا تھا..... بہت عرصہ پہلے جب دونوں بھائیوں یعنی موگو اور پیرل کے بچے ابھی جوان نہیں ہوئے تھے..... تو یہ دیوار جس میں آدم گزار کھڑکی نصب تھی..... موجود نہ تھی اور یہ سب ایک خاندان کی صورت میں رہتے تھے، لیکن پھر دونوں بھائیوں کے دلوں میں کیا سمائی کہ انہوں



نے درمیان میں دیوار اٹھا دی لیکن اندرونی حصے میں آمدورفت کی خاطر یہ کھار بنادی.....  
 اور اب سرکش سورٹھ ساوان کے پاس آنے کے لئے پر تول رہی تھی..... مگر ساوان ابھی  
 کھڑکی تک پہنچا ہی تھا کہ اندر سے کنڈی چڑھا دے۔ ایک کھڑاکے کی آواز سے کھڑکی کے  
 دونوں پٹ کھلے اور شوخ و چنچل سورٹھ شیشوں کے کام اور کڑھائی کئے ہوئے بھاری بھر کم  
 لباس میں چھم سے اندر کود آئی اور اپنی ہی رو میں آگے بڑھتی ہوئی ساوان سے جانکرائی.....  
 زرق برق لباس کی چھپا چھپ پر خوبصورت پراندے میں گندھی ہوئی کالے بالوں کی چوٹی  
 کی چھنا چھن نے ایک ٹائیے کو کیا بلکہ کئی لمحوں تک ساوان کے ہوش و حواس متزلزل سے کر  
 دیئے اور ساوان نے زور سے سورٹھ کو پرے دھکیل کر خود کو علیحدہ کر دیا..... اور وہ بے چاری  
 گرتے گرتے بچی..... ایک لمحے کو اس کا چہرہ غصے میں سرخ ہونے لگا مگر پھر بتدریج اس کا  
 رنگ معمول پر آ گیا۔ مگر جب وہ تنک کر بولی تو اس میں غصے کی آمیزش ضرور شامل تھی۔  
 ”ہے..... چھوڑا اتنی زور سے ایک کمزور لڑکی کو دھکا دیتا ہے۔ شرم کر مجھے چوٹ  
 لگ جاتی تو.....“

ساوان اس کی ڈھٹائی پر انگشت بدنداں رہ گیا۔ تاہم جواباً وہ بھی غصے سے بولا.....  
 ”تجھے بڑی شرم ہے..... پرائے چھو کرے پر گرتی ہے تو۔ جا واپس.....“  
 ”تو پر اپنا کب ہے ساوان.....“ سورٹھ عالم بے خودی کے زیر اثر بولی، اس کی آواز  
 میں صدیوں پرانی یادوں کی کھنک تھی۔ ”ساوان پتہ ہے..... جب ہم سب ساتھ رہتے  
 تھے..... اور جب یہ دیوار نہیں تھی..... تب سے..... ہاں تب سے ساوان۔ میں نے تجھے  
 اپنے دل میں بسایا ہوا ہے.....“  
 ساوان کو جانے کی بات پر بے اختیار ہنسی آگئی اور بولا۔ ”ہے  
 چھوڑی!..... اس وقت تو اتنی چھوٹی ہوگی تو تجھے بھلا کیا پتہ ان باتوں کا.....“

”ناساوان! مذاق نہ اڑا میری محبت کا..... یقیناً مان..... میرے دل میں شروع ہی  
 سے تیری صورت بسی ہوئی ہے.....“ سورٹھ پھر دھیرے دھیرے اس کے قریب آنے لگی  
 اور ساوان کا جی پھر گھبرانے لگا..... وہ بولا۔  
 ”اچھا بہت باتیں ہو گئی ہیں اب تو جا یہاں سے کوئی آگیا تو یونہی باتیں بنیں گی  
 خاندان میں.....“  
 ”ہماری باتیں کوئی نہیں بنائے گا ساوان..... ہم دونوں..... تو..... مجھے شرم آتی ہے۔“  
 سورٹھ نے یک دم اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لئے اور ساوان پہلے اس انوھی لڑکی کی

جرات رندانہ اور پھر شرم سے سرخ ہونے پر متحیر سا ہوا۔ عجیب سرکش نظر آنے لگتی ہے اور کبھی  
 شرم سے چھوٹی موٹی بننے لگتی ہے۔ وہ حیرت سے سوچنے لگا۔ سورٹھ جواب ساوان کے قریب  
 آچکی تھی بولی..... ”تو اتنا بے خبر کیوں رہتا ہے..... تجھے یہ بات کیوں نہیں معلوم کہ..... میرا  
 باپ گل محمد کے لئے تیری بہن ہدایتاں کا رشتہ لینے آنے والا ہے..... اور..... اور پھر ظاہر ہے  
 کہ..... چاچا، چاچی بھی تیرے لیے میرا ہی ہاتھ..... مانگیں گے۔“ سورٹھ نے جیسے ساوان پر  
 بم گرا دیا..... وہ سورٹھ کی بات سن کر اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا تھا۔

سورٹھ کی دھماکہ خیز اطلاع نے ساوان کو جیسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا..... سورٹھ نے  
 صاف طور پر محسوس کیا کہ ساوان کو اس ”پیشگی اطلاع“ پر خوشی نہیں ہوئی بلکہ وہ الٹا پریشان  
 نظر آنے لگا تھا۔

”کیوں ساوان تجھے خوشی نہیں ہوئی..... تو..... تو مجھ سے شادی نہیں کرنا  
 چاہتا.....!“ وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

”ابھی میں نے شادی کا نہیں سوچا ہے.....“ ساوان نے گڑ بڑاتے ہوئے مبہم سا  
 جواب دیا..... پھر اس سے گویا جان چھڑانے والے انداز میں بولا..... ”سورٹھ! تو اب چلی  
 جا یہ اچھا نہیں کہ کوئی ہمیں اکیلا یہاں دیکھ لے..... میں ذرا اس وقت پریشان ہوں۔“  
 ”آخر ایسی گرتی والی کیا بات ہے..... جو مجھ سے بھی نہیں کرتا۔“ سورٹھ قدرے الجھ  
 کر بولی تو ساوان نے ایک لمحے کو سخت نظروں سے اسے گھورا۔

”تو نہیں جاتی تو کھڑی رہ ادھر..... میں چلا جاتا ہوں اندر.....“  
 یہ کہتے ہوئے ساوان اپنی کونٹھڑی کی جانب بڑھ گیا..... اور سورٹھ در ماندہ دل کے  
 ساتھ چند ٹائیے جہاں کی تہاں کھڑی رہنے کے بعد ایک تکلیف دہ آہ کھینچ کر کھڑکی نما  
 دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

☆=====☆=====☆

”سائیں وڈا.....! پھر کیا خیال ہے..... موگو ہاری کے پٹ ساوان کو قرضہ دے  
 دیں!“ منشی میرل اجازت طلب لہجے میں بولا..... سامنے آسریں کی بنی مضبوط نقشین  
 پایوں والی رلی نکھی چار پائی پر گاؤں کے ٹیک لگائے وڈیرا میرلکھ میرخان حقے کی ٹے  
 تھاے بیٹھا تھا..... اس وقت اوطاق میں دونوں تہا تھے..... میرل چار پائی کے قریب ہی  
 وڈیرے کے سامنے مونڈھے پر بیٹھا تھا۔ وڈیرے نے منشی کی بات سن کر اس کی طرف یوں  
 دیکھا جیسے وہ دنیا کا احمق ترین آدمی ہو..... پھر وہ جھٹکے دار لہجے میں بولا۔

”اڑے نشی تو بالکل بے وقوف ہے..... اڑے بابا..... ترنت قرضہ دے دے ساون کو..... یہ وہی چھوڑا ہے ناجوزیادہ شور مچاتا تھا بٹائی کے وقت.....“

”ہا سائیں.....! وہی ہے.....“ نشی نے اثبات میں جواب دیا۔

”بس تو بابا پھر قرضے کا پٹہ ڈال دے اس کی گردن میں۔ جوانی کی ساری گرمی جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گی اس کی.....“

”مگر سائیں بھوتار..... وہ تو..... دس بیس نہیں پورے پچاس ہزار قرض مانگ رہا ہے.....“

نشی میرل نے انکشاف کرتے ہوئے کہا تو ڈیرا پھر فوراً بولا۔ ”اڑے بابا..... لاکھ مانگے تو لاکھ دے دے..... جتنا قرضہ زیادہ لے گا اتنا اس کی گردن میں پٹہ تنگ ہوتا جائے گا بابا..... پچاس ہزار بھی تھوڑا۔“

”اچھا سائیں برابر..... آج وہ آئے گا پھر..... انگوٹھا لگوا کر..... روپے اس کے حوالے کر دوں گا.....“ نشی میرل جواباً بولا۔

چند ثانیے اوطاق میں گہری خاموشی طاری رہی اس کے بعد ڈیرا لکھ میرخان نے حقے کا ایک طویل کش لے کر فضا میں دھواں اگلا اور کچھ سوچتے ہوئے گہرے لہجے میں نشی سے بولا..... ”ویسے نشی.....“

”حاضر سائیں۔“

”بابا یہ..... ساون اتنا پیسہ لے کس واسطے رہا ہے.....؟“ ڈیرے کی بات پر پہلی مرتبہ نشی میرل کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیلی وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”سائیں..... بھوتار..... چھو کر..... کوئی حور پری بیاہ رہا ہے۔“

”ہالا.....!“ ڈیرے کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”ہاؤ سائیں..... ظاہر ہے..... پچاس میں..... ملنے والا سنگ تو.....“ نشی نے اپنی بات کی معنی خیزی بڑھانے کی غرض سے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”نشی میرل۔“ معاؤ ڈیرا لکھ میرخان گونجیلی آواز میں بولا اور ساتھ ہی تن کر بیٹھ گیا..... اس کی ستونوں جیسی موٹی ٹانگیں اب چار پائی سے نیچے جھول رہی تھیں جس کی وجہ سے اس کی ریشمی لاگ (تہبند) رانوں تک اونچی ہو گئی تھی۔

”حاضر سائیں بھوتار.....“ نشی گڑبڑا کر یکدم بولا۔

”ہماری پوری جاگیر میں دس پندرہ ہزار سے زیادہ بڑھ کر کوئی ایسا سنگ (لڑکی کا

رشتہ) ہے ہی نہیں..... یہ پچاس ہزار والا کدھر سے آگیا..... اور جسے حاصل بھی ایک معمولی ہاری کا بیٹا ساون کر رہا ہے۔“

”اسی بات پر تو میں خود حیران ہوں سائیں وڈا.....“ نشی نے اپنے لہجے میں حیرت سمیٹتے ہوئے کہا۔

”اڑے تو نے کیا بھنگ چڑھا رکھی تھی پھر.....“ وڈیرا دھاڑا..... لیکن پھر فوراً نیچی آواز سے بولا..... ”اچھا سن..... ذرا پتہ کر..... وہ حور پری کون ہے..... کس کی بیٹی ہے..... میری حویلی کی دیواریں کیا اتنی نیچی ہو گئی ہیں کہ مجھے وہ بہر نظر نہ آسکا۔“ وڈیرے کا لہجہ آخر میں پراسرار حد تک گھبر ہو گیا تھا..... اور نشی میرل کی چندھی آنکھوں میں عجیب سی تصور آمیز چمک لہرانے لگی۔

☆=====☆=====☆

آج خلاف توقع سوڈھل دوپہر کا کھانا کھاتے ہی اپنی کوٹھڑی میں آرام کی غرض سے چلا گیا تھا۔ شام کو اٹھا تو اندھیرا پھیلنے کو تھا..... اللہ رکھی اس کے لیے چائے کا پیالہ لے آئی۔

”اللہ رکھی!“ سوڈھل نے اللہ رکھی کو پکارا..... جو چائے کا پیالہ رکھنے کے بعد لوٹ رہی تھی۔ چاچا کے پکارنے پر وہ رک گئی۔

”جی چاچا.....“ وہ مدہم لہجے میں بولی۔

”تجھے کوئی کام تو نہیں ہے نا..... میرا مطلب ہے چاچی کا تو کوئی کام نہیں کرنا ہے تو نے.....“ سوڈھل نے کسی خیال کے تحت پوچھا پھر جیسے خود ہی اپنی بات پر مسکراتے ہوئے بولا..... ”میں ہی پاگل ہوں..... بھلا تیری چاچی کا کوئی کام ختم ہونے والا ہے..... چل تو..... بیٹھ..... ادھر تیرے سے مجھے بات کرنی ہے ضروری.....“

اللہ رکھی اس کی بات پر چند ثانیے کوٹھکی تھی..... پھر خاموشی سے سر جھکائے سامنے کی جھلنگ چار پائی پر پاؤں لٹکائے اور سر جھکائے بیٹھ گئی..... کمرے میں بلب کی زرد بیماری روشنی پھیلی ہوئی تھی..... اللہ رکھی کا دل جانے کیوں دھڑکنے لگا..... سوڈھل نے گرم گرم چائے کی چند چسکیاں بھریں..... پھر بولا..... ”اللہ رکھی..... تو میرے مرحوم بھائی کی نشانی ہے..... اور مجھے بیٹیوں کی طرح عزیز ہے..... میں تیرا چاچا ضرور ہوں..... مگر باپ کی حیثیت بھی رکھتا ہوں..... بھائی ٹھٹھل کو رب سائیں جنت نصیب کرے..... اس کے گزرنے کے بعد تیری ذمہ داری مجھ پر آگئی..... یہ میں نے تجھ پر کوئی احسان تھوڑا ہی کیا

ہے..... یہ میرا فرض تھا۔“ اتنا کہہ کر وہ چند لمحے تھا۔

اللہ رکھی کو اپنے ہونٹ خشک ہوتے محسوس ہوئے وہ چپ تھی..... ”توں سن رہی ہے نا..... دھیئے اللہ رکھی.....“ سوڈھل نے اسے پکارا۔

”ہاؤ چا چا سائیں..... سن رہی ہوں میں.....“ اللہ رکھی چونک کر بولی۔

سوڈھل اب بغور اپنی آنکھیں اپنی سکیڑے اللہ رکھی کے جھکے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور کچھ متذبذب بھی نظر آنے لگا..... یوں لگ رہا تھا..... جیسے اسے کوئی اہم بات کرنے میں مشکل پیش آرہی ہو..... تاہم وہ بولا۔ ”اللہ رکھی..... بیٹیاں پرانی ہوتی ہیں۔ گھر تو انہیں نہیں بٹھانا ہوتا نا..... اب ظاہر ہے یہ ذمہ داری بھی مجھی کو بھانی ہے..... تیری چاچی کو بیماری نہیں چھوڑتی..... ورنہ یہ بات وہ تجھ سے کرتی..... دیکھ اللہ رکھی..... میرا حال بھی تیرے سامنے ہے..... جمع جتھا میرے پاس ہے نہیں..... وڈیرے کی ”رہاکی“ کرتے کرتے میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اب خیر سے تجھے بیاہ دوں تو سکون سے آنکھیں بند کر لوں.....“ آخر میں سوڈھل کے لہجے میں مکارانہ رقت سی اتر آئی تھی جس پر اللہ رکھی نے ہولے سے سراٹھا کر سوڈھل کی جانب دیکھا تھا..... جانے کیوں اللہ رکھی کو ترس سا آنے لگا..... مگر وہ چپ رہی۔

اسی وقت..... باہر سے چاچی عنایتاں کی آواز ابھری..... وہ اللہ رکھی کو پکار رہی تھی..... ”اڑی کاں..... مرگئی..... ادھر آ..... ذرا میرے گھٹنوں میں آ کے ناڑے باندھ دے۔ درد سے مری جا رہی ہوں۔“

بیوی کی بے وقت کی پکار پر سوڈھل جھنجھلا گیا اور وہیں سے ہی چلا کر بولا۔ ”اڑی..... منخوس ذرا ماٹھ کر لے تھوڑی دیر..... میں اللہ رکھی سے ضروری بات کر رہا ہوں اس وقت جان چھوڑ ہماری.....“ اس کی جھڑکی نے فوراً اثر دکھایا کیونکہ پھر دوبار عنایتاں کی آواز نہیں آئی تھی۔

”ہاں..... تو دھیئے اللہ رکھی! میں کہہ رہا تھا۔“ سوڈھل نے اپنا سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہنا شروع کیا..... ”کہ میں چاہتا ہوں مرنے سے پہلے تیرے فرض سے آزاد ہو جاؤں ورنہ مٹھل بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ تو دھیئے..... میں نے تیرا رشتہ دیکھ لیا ہے اور بات بھی تقریباً پکی کر لی ہے..... اسی چاند کی اٹھارہ تاریخ دینا چاہتا ہوں..... سوچا جہاں اتنے فرائض پورے کئے وہاں آخر میں تجھ سے پوچھنے..... میرا مطلب ہے..... تجھے بتا بھی دوں۔“ سوڈھل نے چند ثانیے توقف کیا اور ساتھ ہی اپنی آنکھیں سکیڑ کر کہنے پن

سے اللہ رکھی کا معصوم چہرہ تکتے لگا کہ کہیں اسے میری بات سے اختلاف تو نہیں ہو رہا..... مگر سر دست اسے وہاں ایسے کوئی آثار نظر نہ آئے بجز اس کے کہ اللہ رکھی کا چہرہ ذرا الجھن آمیز انداز میں متمتاً تاں محسوس ہوا۔ جسے حریص سوڈھل نے درخور اعتنائہ گردانتے ہوئے پھر سلسلہ کلام جوڑا۔ ”دودا خان نام ہے تیرے ہونے والے مرد کا..... بوزائیں اور شوں کار (دولت مند) ہے..... تو بہت سکھی رہے گی..... ہے بھی اسی گوٹھ کا رہنے والا..... مجھے پورا یقین ہے دھیئے تو آپڑیں مرحوم باپ کی روح کو خوش رکھنے کے واسطے اور میری عزت کا خیال رکھتے ہوئے انکار نہیں کرے گی.....“ بالآخر عیار سوڈھل نے فطری جذباتی کمزوری کا پتا پھینکتے ہوئے آخر میں اپنی بات ختم کی اور اللہ رکھی کا وجود جیسے تپت ہو کر رہ گیا..... ایک بھنور تھا جس نے کالے ناگ کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا..... وہ کچھ..... بلکہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی سوڈھل چاچا سے..... لیکن زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی..... وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ چاچا تم اپنے فرض کا بوجھ اتار رہے ہو سر سے یا میرا ایک بڑھے کے ساتھ سودا کر رہے ہو..... اس کی خاموشی کو سوڈھل اپنے تئیں رضا مندی سمجھتے ہوئے اپنی چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر ”شاباش دھیئے“ کہتا ہوا زبردستی اللہ رکھی کے سر پر ہاتھ پھیر کر فوراً باہر نکل گیا..... اللہ رکھی کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا..... اس نے اپنی ٹھٹی گھٹی سسکیوں پر بمشکل قابو پار کھا تھا۔

☆=====☆

”تو اس بڑھے دودے سے اللہ رکھی کی شادی کر تو رہا ہے..... پھر اللہ رکھی کا وہ مکان تو اپنے نام کرا لے.....“ یہ اس رات کا ذکر تھا جب دونوں میاں بیوی سوڈھل اور عنایتاں اپنے کچی کوٹھڑی نما کمرے میں آمنے سامنے چار پائیوں پر براجمان تھے..... سوڈھل نے آج شام اللہ رکھی سے ہونے والی اپنی ”بات“ کا ذکر بیوی سے کر دیا اور ساری بات سننے کے بعد عنایتاں نے اس کے مکان کی بات چھیڑ دی تھی جو کب کا خالی پڑا تھا..... شوہر کو خاموش پا کر عنایتاں دوبارہ ذرا پُر زور لہجے میں بولی۔ ”ایسا نہ ہو شادی کے بعد یہ بڑھا دودا خان اس پر قبضہ کر لے۔ میں تو کہتی ہوں وہ مکان ہی بیچ ڈال۔“

”اڑی..... تو بھی بے وقوف ہے..... تجھے پتہ ہے زمین وڈیرے کی ہے..... مکان بیچنے کا گوٹھ میں کسی کو بھی اختیار نہیں ہے..... ہاں اسے اپنے نام کروا کر کرائے پر ضرور اٹھا سکتے ہیں۔“

”میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں یہ سب کام اللہ رکھی کی شادی سے پہلے پہل نمنا لے

..... اور ہاں..... وہ دونوں بیل؟“ عنایتاں نے جیسے یاد دلایا۔

دونوں میاں بیوی دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے تھے..... سوڈھل نے کہا.....  
”بیلوں کی فکر ہی نہ کرتو، انہیں میں بیچ دوں گا یا پھر بل کے لیے اپنے پاس ہی رہنے دوں  
گا..... بس ہک وری پیسہ تھہ آ جاوے..... پھر دیکھ اپنے مزے.....“ عنایتاں خوش آئندہ  
تصور میں ہو لے ہو لے سر کو اثباتی جنبش دینے لگی..... باہر زور کا جاڑا اتر اتر ہوا تھا۔

☆=====☆=====☆

”آ بابا..... آ جا..... ساون میں تیرا ہی انتظار کر ہا تھا خوش ہو جا..... میں نے تیرا  
کام کر دیا ہے۔“ ساون کو اوطاق کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر نشی میرل فوراً  
بولاً..... سوئے اتفاق وہ اس وقت اکیلا ہی سرکنڈوں کے بنے ایک چوڑے پٹے والے  
مونڈھے پر رجسٹر سنبھالے براجمان تھا..... ساون خاموشی سے اس کے قریب پہنچ کر کھڑا ہو  
گیا..... پھر نشی کو جیسے گھورتے ہوئے بولا۔

”نشی.....! میرا کام کر دیا ہے تو..... پیسے میرے حوالے کر کے آپڑیں رجسٹر پر  
انگوٹھا لگوا لے میرا۔“

”اڑے بابا..... انگوٹھا بھی لگ جائے گا..... پیسے بھی مل جاویں گے تجھے، گزرتی کس  
بات کی ہے بابا..... تو ذرا بیٹھ ابھی بھوتار سائیں آنے والا ہے..... پیسے وہی تیکوں دے  
گا۔“ نشی میرل اپنے پلاسٹک کے سیاہ موٹے اور بھدے فریم والے چشمے کے عقب سے  
اپنی چندھی آنکھیں ساون کے چہرے پر جمائے جمائے بولا..... اس کی بات پر ساون کو ذرا  
اچنبھا سا ہوا اور ایک قریبی چار پائی پر خاموشی سے بیٹھ گیا تاہم اس کا چہرہ عجیب احساس اور  
جذبے کے تحت متمار ہا تھا۔ اس دوران نشی میرل نے جانے کب اوطاق کے ایک خدمت  
گار چاکر کو چائے کی پیالی لانے کے لیے بھیج رکھا تھا جو ذرا ہی دیر بعد ایک چھوٹی سی طشتری  
میں ساون کے لیے چائے کی پیالی لے آیا۔

”لو بابا ساون چائے پو..... ابھی بھوتار سائیں آنے والا ہے.....“ نشی نے کہا۔

ساون حیران ہوا کہ آخر اس پر اتنی مہربانی کیوں؟ درحقیقت وڈیرے کی اوطاق  
میں کسی غریب ہاری کو چائے پیش کرنا غیر معمولی التفات میں شمار ہوتا تھا..... جو تقریباً  
ناممکن تھا۔ بہر طور ساون بے دلی کے ساتھ چائے پینے لگا..... وہ کسی گہری الجھن کا شکار نظر  
آ رہا تھا۔ عیار نشی میرل کی چشمے کے عقب سے جھانکتی ہوئی چھچھوند جیسی آنکھیں جانے  
کیوں مسلسل ساون کے ژولیدہ چہرے کا حواف کر رہی تھیں..... وہ ساون کے کسی اندرونی

انتشار کے کھوج میں تھا..... بہر طور پر چند ثانیے بعد بولا..... ”ساون! تو فکر نہ کر بابا.....  
میں نے کہانا تیرا کام سمجھو ہو گیا ہے..... بس وڈیرے سائیں کو آ لینے دے حویلی سے.....  
اچھا ایک بات تو بتا بھلا..... وہ کون خوش نصیب ہے جس کا رشتہ تو پچاس ہزار میں لے  
رہا ہے..... کس کی بیٹی ہے وہ..... دیکھ برامت منانا میں ویسے ہی پوچھ رہا ہوں..... دعا ہی  
دوں گا تم بالکوں کو..... آخر میں بھی تمہارے بڑوں جیسا ہوں۔“

نشی میرل کی بات پر ساون ذرا چونکا..... لیکن پھر مبہم سے لہجے میں بولا۔ ”ابھی تو  
مجھے خود بھی معلوم نہیں اچھی طرح کہ آیا پچاس ہزار روپے میں بھی میرا کام ہوتا ہے.....  
یا..... خیر چھوڑ نشی..... میرا کام ہو جائے..... تجھے خود ہی پتہ لگ جائے گا.....“ ساون نے  
جیسے بات کو یہیں دفن کرنے کی غرض سے کہا..... پھر نشی بھی کسی خیال کے تحت چپ ہو رہا۔  
تھوڑی دیر بعد وڈیرا میرلکھ میر خان بھی اپنے چند مصاحب خاص کے ہمراہ اندر  
داخل ہوا..... ”سلام سائیں.....!“ ساون نے وڈیرے کو دیکھتے ہی چار پائی سے اٹھ کر  
سلام کیا..... وڈیرے نے اپنے سر کے خفیف اشارے سے سلام کا جواب دیا..... نشی میرل  
بھی رجسٹر بغل میں دبائے اٹھ کھڑا ہوا تھا..... وڈیرا، ساون کو عجیب نگاہوں سے گھورتا ہوا  
ایک مونڈھے پر براجمان ہو گیا۔

”ہاں بابا..... میرل..... کیا کہتا ہے یہ چھوڑا۔“ وڈیرے نے استفسار طلب لہجے  
میں نشی سے پوچھا۔  
”سائیں بھوتار کی خیر ہو دے..... چھوکرے کو روپے چاہئیں.....“ نشی خوش آمدانہ  
لہجے میں بولا۔

”ہاں بابا ٹھیک ہے..... دے دوا سے..... پھر قرضے کی شرائط اور سود وغیرہ سے  
اسے آگاہ کر دیا ہے تو نے.....“ وڈیرے نے گمبھیر لہجے میں پوچھا..... ساتھ ہی اس نے  
کھڑے ہوئے ساون کو ہاتھ کے اشارے سے چار پائی پر بیٹھنے کو کہا..... پھر ساون کے  
بیٹھے ہی نشی حسب عادت جلدی سے رجسٹر کھول کر پڑھنے لگا، پھر مستعدی سے بولا۔

”سائیں بھوتار..... ابھی بتاتا ہوں۔“ اس کے بعد وہ ساون سے مخاطب ہوا۔  
”ساون..... تجھے پچاس ہزار قرض چاہئے یا دس.....“ ساون نشی کی بات پر ذرا گڑبڑایا  
مگر پھر اسے ایک روایتی پوچھتاچھ پر محمول کرتے ہوئے جواب مختصر بولا۔ ”قرض!“  
”کتنے دنوں کے لیے..... ہا۔“ نشی نے چشمے کے پیچھے سے ساون کے چہرے کی  
طرف گھورتے ہوئے پوچھا.....

سے کہا۔

”ہالا بابا ہالا۔ جا اب تو.....“

”حاضر سائیں وڈا.....!“ وہ مستعدی سے بولا۔

”نہیں سائیں! ابھی تو کچھ نہیں بتایا ہے..... بڑا پکا ہے.....“ منشی نے آنکھیں بھیچتے ہوئے پُر خیال لہجے میں جواب دیا..... وڈیرے میر لکھ میر خان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک عود کر آئی تھی.....

☆=====☆=====☆

پچاس ہزار قرض لینے کے بعد ساون کو فوری طور پر دوسلوں نے گھیر لیا..... پہلا تو اتنے بہت سارے روپوں کی حفاظت کا مسئلہ درپیش تھا دوسرے اللہ رکھی کے رشتے کے سلسلے میں اس کے چاچا سوڈھل سے کس ذریعے سے بات کی جائے.....؟ اسی دوران ساون کو اچانک ایک اور بات کا بھی خیال آیا کہ اللہ رکھی کو جان کرنے کے لیے دو داخان نے بھی سوڈھل کو پچاس ہزار روپے ہی دیئے کا وعدہ کیا ہے..... پھر سوڈھل اس کے پچاس ہزار کو بھلا کہاں خاطر میں لائے گا..... یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ وہ دس پندرہ ہزار روپے اوپر کر کے سوڈھل کو پیش کرے تو اس کے حق میں بات بن سکتی ہے..... لیکن ساتھ ہی اسے ایک اور بات کا بھی یکبارگی خیال آیا کہ اگر وہ یکمشت سوڈھل کو اتنے روپوں کی جھلک دکھا دے تو ہو سکتا ہے لالچی سوڈھل یک دم اتنے بہت سے روپوں کو سامنے دیکھ کر اپنا فیصلہ اس کے حق میں بدل دے۔ لہذا یہ سوچ کر ساون نے فوری اور خود ہی سوڈھل سے ملاقات کر کے بات کرنے کا ارادہ کر لیا۔

☆=====☆=====☆

باہر ٹھہرتی شام نے اپنے گیسو دراز کرنے شروع کر دیئے تھے..... ایک کچی کھڑی کی پیشانی پر لگے بلب کی مدہم اور پیلی روشنی نے صحن میں ایک 'گوگوار' سا نا کافی اجالا کر رکھا تھا۔ ایک کونے میں پھونس کے چھپرے تلے ”ہیرے اور سانولے“ کو سردی سے بچانے کی غرض سے اللہ رکھی بطور ”الحاف“، ان پر خالی بوریاں ڈال بیسی تھی وہ دونوں بیل اللہ رکھی کو

”س..... سائیں وڈا..... ایک سال کے لیے.....“ ساون کے منہ سے نکلا۔

”سائیں وڈا..... درحقیقت بات کیا ہے کہ..... میں نے پہلے کبھی قرضہ لیا نہیں ہے..... اسی لیے ذرا.....“ ساون مرتعش سے لہجے میں کچھ کہتے کہتے رک گیا تو وڈیرے کے جہان دیدہ چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ کھنڈ آئی وہ بولا۔

”اڑے بابا..... اس میں کیا مشکل ہے..... پورا گوٹھ قرض لیتا ہے..... دیتا ہے..... خود تیرے پیو موگو نے پندرہ ہزار روپے لے رکھا ہے..... اچھا سن..... قرضہ جتنی کم مدت کا ہوگا جتنی بڑی قسط کا ہوگا اتنا ویا ج کم لگے گا..... سمجھا..... اب بتا.....“ وڈیرا خاموش ہوا تو ایک بار پھر ساون کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ اسے جانے کیوں انجانے اندیشوں نے اپنی پلیٹ میں لے لیا تھا، لیکن پھر اللہ رکھی کا معصوم چہرہ آنکھوں میں گھوم جاتا تو اسے پھر اپنے سارے خدشات اور اندیشے بے معنی نظر آنے لگتے۔

”اچھا بابا..... پھر مجھے ہی بتانا پڑے گا..... سن.....“ بالآخر وڈیرے لکھ میر خان نے کہا۔ ”دیکھو ساون..... ایسا کرو پورے سال کے لیے ہی قرضہ لے لو..... اور بجائے ہر مہینے قسطوں میں اتارنے کے سال بعد یکمشت ادا کر دینا..... اور اوپر پندرہ ہزار ویاج دے دینا۔ بیسٹھ ہزار..... کیا سمجھے.....؟“ ساون کو اس وقت اللہ رکھی کو حاصل کرنے کی دھن سوار تھی لہذا اس نے فوراً ہامی بھرتے ہوئے رجسٹر پر اپنا نام لکھ دیا اور انگوٹھا بھی منشی میرل نے لگوادیا..... آخر میں جاتے جاتے..... ساون نے وڈیرے سے قدرے لجاجت

ساون بے دھڑک دوسری کوشڑی میں داخل ہو کر اندر ایک طرف رلی پچھی چار پائی پر  
براجمان ہو گیا۔۔۔۔۔ اس کے بیٹھنے کی دیر تھی کہ چاچا سوڈھل بھی اندر آ گیا اور چار پائی کے  
عین سامنے پرانے سے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

”ہاں بابا اور سنا۔۔۔۔۔ گھر والے تو ٹھیک ٹھاک ہیں نا۔۔۔۔۔ تیرے۔۔۔۔۔ موگو کیسا  
ہے؟۔۔۔۔۔ آتا ہی نہیں ہے۔۔۔۔۔ عرصہ ہوا تاش کی بازی لگائے۔“

”ہاں چاچا بس ابا کچھ بیمار رہنے لگا ہے۔۔۔۔۔ اسی لئے۔“ ساون نے مختصر جواب دیا  
اور سوڈھل کی طرف دیکھا جو بغور اس کے چہرے کی طرف اپنی نظریں جمائے ہوئے  
تھا۔۔۔۔۔ ساون کی بات پر اس نے یونہی دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ پھر بولا۔

”اچھا یہ بتا۔۔۔۔۔ کیا پیسے گا۔۔۔۔۔ سردی بہت ہے آج۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے چائے ٹھیک  
رہے گی۔۔۔۔۔“

”نہیں چاچا اس کی فکر نہ کر۔“ ساون بولا۔

”اڑے فکری کیا بات ہے۔۔۔۔۔ آپڑاں بچہ ہے تو۔۔۔۔۔ اچھا خیر تو ہے نا۔۔۔۔۔ کیسے آیا  
ہے۔“ سوڈھل بالآخر چائے وغیرہ کی بات ملتی دیکھ کر بولا۔۔۔۔۔ تو ساون کے چہرے پر  
جھجک آمیز خاموشی طاری رہی چند ثانیے۔۔۔۔۔ پھر وہ سوڈھل کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے  
لہجے میں بولا۔

”چاچا ایک ضروری بات کرنے آیا تھا تجھ سے۔۔۔۔۔ پتہ نہیں تجھے کیسا لگے۔ یوں تو  
آنا میرے ماں پو کو چاہئے تھا۔۔۔۔۔ پر۔“

ساون کہتے کہتے رک گیا اور سوڈھل کی جہاندیدہ نگاہوں نے فوراً ساون کے  
چہرے کا ارتعاش اور اس کے جملوں کا پس منظر کھوجنا شروع کر دیا۔۔۔۔۔ پھر وہ ساون  
کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے بولا۔۔۔۔۔ ”ہاں ہاں بول۔۔۔۔۔ میں نے کہا نا۔۔۔۔۔ آپڑاں بچہ ہے  
تو۔۔۔۔۔ بول کیا کہنا ہے۔“ اس کی بات پر بالآخر ساون بولا۔

”چاچا۔۔۔۔۔ دیکھ تجھے اگر میری بات اچھی نہ لگے تو بھلے میرے سر پر جوتا مار دینا پر  
مجھ سے ناراض نہ ہونا۔۔۔۔۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میری کوئی مجبوری ہے جو میں ماں باپ کو نہیں  
لا سکا ساتھ۔“

”اڑے بابا۔۔۔۔۔ بول تو سہی تو۔۔۔۔۔ کیا بات ہے میری گود میں کھیا ہے تو۔۔۔۔۔ تو کوئی  
بات کر یا نہ کر تجھے میں پھر بھی جوتا مارا سکتا ہوں۔۔۔۔۔ اتنا میرا حق قائم ہے اب بھی گوٹھ کے  
سارے لونڈے لپاڑوں پر۔۔۔۔۔ لیکن موگو تو میڈا بھائی ہے اور تو بھی میڈے بچوں جیسا

اپنی کالی اور ابھری ہوئی معصوم نظروں سے گھورتے ہوئے جگالی میں مصروف تھے۔ صحن میں  
سگ داسی چاولوں کی خوشگوار مہک پھیلی ہوئی تھی جو اللہ رکھی نے کچھ دیر پہلے ہی دم پر رکھے  
تھے۔ چاچا سوڈھل اور عنایتاں دونوں اپنی کوشڑی میں موجود تھے۔۔۔۔۔ معاً دروازے کی  
کنڈی کھٹکی۔۔۔۔۔ اللہ رکھی ذرا چونکی۔

”اڑی ذرا دیکھ اللہ رکھی کون ہے در پر۔۔۔۔۔“ اندر سے چاچی عنایتاں کی چلاتی ہوئی  
آواز بلند ہوئی اور اللہ رکھی با آواز بلند ”اچھا چاچی“ کہتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”کیہ آ۔۔۔۔۔؟“ (کون ہے) دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے پوچھا۔  
”سوڈھل چاچا سے ملنا ہے۔“ جو اباباہر سے آواز ابھری اور اللہ رکھی دھک سے رہ  
گئی۔۔۔۔۔ وہ ساون کی آواز کو پہچان چکی تھی ایک لمحے کو ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔۔۔۔۔ پھر اس نے  
بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔۔۔۔۔ سامنے پرانی اوٹی چادر اوڑھے ساون موجود تھا۔

”س۔۔۔۔۔ ساون تم!“ اللہ رکھی کے منہ سے نکلا۔

”چاچا ہے تیرا اندر۔۔۔۔۔“ ساون نے چوکھٹ سے اندر آتے ہوئے کہا۔  
”ہاں۔۔۔۔۔ اندر کوشڑی میں۔۔۔۔۔ پر تو۔“ اللہ رکھی کے لہجے میں پریشانی تھی۔

”تو کیوں گڑتی کر رہی ہے۔ روپے لایا ہوں۔۔۔۔۔ پورے پچاس ہزار، میں خود تیرا  
رشتہ لوں گا۔۔۔۔۔ اندر آنے دے مجھے راستے سے ہٹ۔۔۔۔۔“ ساون یہ کہتا ہوا اندر آ گیا۔

”کون ہے اللہ رکھی؟ کس سے باتیں کر رہی ہے تو۔۔۔۔۔“ اندر سے سوڈھل کی آواز  
سنائی دی۔

اللہ رکھی عجیب پریشان اور حیران کن صورت حال سے دوچار تھی۔ سوڈھل کو جواب  
دینے کے لیے اس کے لب محض ہوئے سے کپکپا کر رہ گئے۔۔۔۔۔ ساون اس دوران صحن میں  
آچکا تھا اور خود ہی اندر کوشڑی کی طرف اپنا رخ کرتے ہوئے سوڈھل سے مخاطب ہوتے  
ہوئے بولا۔ ”چاچا سوڈھل۔۔۔۔۔ سلام کہتا ہوں۔۔۔۔۔ میں ہوں ساون۔۔۔۔۔! موگو باری کا  
بیٹا۔“

اسی لمحے ساون کو اندر سے چار پائی کے اس زور سے چرچرانے کی آواز سنائی  
دی۔۔۔۔۔ جیسے کوئی جلدی میں ایک جھٹکے سے چار پائی سے اٹھا ہو۔۔۔۔۔ اس کے عقب میں اللہ  
رکھی پریشان چہرہ لئے کھڑی تھی۔

”اڑے چھو کر۔۔۔۔۔ کیا حال ہے اڑے تیرا۔۔۔۔۔ اچھا چل ساتھ والی اوطاق میں بیٹھ  
جا کر، میں ابھی آتا ہوں۔“ سوڈھل ساتھ والی کوشڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

ہے..... چل اب بول دے..... سن رہا ہوں میں.....“ سوڈھل فنکارانہ شفقت سے بولا۔  
پھر چند ثانیے توقف کرتے ہوئے ساون نے اپنی قمیض کی اندرونی کمری کی بڑی سی  
جیب میں سے پچاس ہزار کی رقم نکال کر اٹھتے ہوئے سوڈھل کے قدموں پر رکھ دی ہے اور  
جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں بجائے التجا کے گہری متانت تھی..... ”چا چا مجھے اپنے لئے  
اللہ رکھی کا سنگ چاہیے۔“

سوڈھل کیا جواب دیتا..... اتنے سارے نوٹوں کو اپنے قدموں میں دیکھ کر اس کی  
آنکھیں پھیل گئی تھیں..... ساون نے اس سے کیا کہا تھا..... اگرچہ سوڈھل سن رہا تھا مگر اس  
کی نظروں کی سوئی روپوں پر انک کر رہ گئی تھی۔

”سک..... کتنے ہیں یہ.....“ سوڈھل نے حریصانہ لہجے میں سرگوشی کی۔ ساون کو  
ذرا حوصلہ ہوا لہذا وہ بے دھڑک بولا۔

”پورے پچاس ہزار ہیں..... چا چا.....“ ساون کی بھی آواز دھیمی تھی۔

”مگر دودا خان.....؟“ سوڈھل نے تھوک لگتے ہوئے کہنا چاہا۔

وہ فوراً مطلب کی بات پر آ گیا تھا۔

”چا چا تو اس کی گڑتی نہ کر..... میں اس سے نمٹ لوں گا.....“ ساون نے متمتاتے  
ہوئے لہجے میں کہا..... اس کی آنکھوں میں درشتی اتر آئی تھی کوٹھڑی میں چند لمحے کے لیے  
سکوت چھا گیا..... سوڈھل کے تنفس کی ڈور ایک دم اتنے نوٹوں کو دیکھ کر بے ترتیب ہوئی  
جاری تھی جبکہ ساون کا دل اس فیصلہ کن گھڑی کو جلد از جلد اپنے حق میں کرنے کی خاطر بے  
طرح دھڑک رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سوڈھل کو اپنے بے ترتیب سانسوں کی بازگشت اور  
ساون کو اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کی گونج صاف سنائی دے رہی تھی۔

پھر چند ثانیے بعد جیسے سوڈھل اپنی سنسنی خیز کیفیت پر قابو پاتے ہوئے تشویش بھرے  
لہجے میں بولا..... ”سوچ لے ساون..... دودا خان ذرا میڑھا آدمی ہے..... بے شک وہ  
بڑھا نظر آتا ہے۔ مگر کاٹھ کا پکا ہے..... اگر اس نے اپنی غیرت کا مسئلہ بنالیا تو۔“

”بس چا چا سوڈھل۔“ ساون اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے قطعیت سے بولا۔ ”مجھے  
اب آخری بار ہاں یا ناں میں جواب دے.....“ یہ کہتے ہوئے ساون نے اٹھ کر سوڈھل  
کے پیروں تلے کچھ رے نوٹ سمیٹنے چاہے تو حریص سوڈھل نے فوراً ساون کا شاہ تھام  
لیا..... ساون ذرا رکا..... پھر سوڈھل ساون سے بولا..... ”اڑے بابا! بات تو سن..... اتنی  
گرمی کی کیا ضرورت ہے..... چائے پی..... سوچتے ہیں تیرے لئے بھی کچھ.....“

ساون قدرے مطمئن ہو کر دوبارہ چار پائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ سوڈھل نے  
سکپکپاتے ہاتھوں..... جسے اپنے پیروں پہ رکھے نوٹ اٹھائے اور دوبارہ مونڈھے پر براجمان  
ہو گیا پھر نوٹ اپنی گود میں ڈال لیے۔

”چائے تو پیئے گا نا تو.....“ سوڈھل نے یکبارگی پوچھا۔  
”نہیں چا چا بس تو مجھے جواب دے دے یہی تیری مہربانی ہے..... کیا کہتا ہے پھر  
تو.....“ ساون نے کہا۔

بلبل کی کمزور زرد روشنی میں ساون نے بغور سوڈھل کا چہرہ دیکھا تو وہاں اسے ایک  
عجیب سا تغیر نظر آیا..... جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکا..... سوڈھل نے ایک طویل سانس حلق  
سے خارج کی اور بولا۔ ”ساون! تیری بات مان لوں تو ظاہر ہے دودے سے مجھے بھی  
مخالفت مول لینی پڑے گی..... پھر خیر میں اسے دیکھ لوں گا، لیکن ساون! دودا خان بھی سنگ  
کے پچاس ہزار دے رہا ہے۔ تیری بھی اتنی ہی رقم ہے۔ مقصد کہنے کا یہ ہے کہ مجھے دونوں  
طرف سے برابر ہی رقم مل رہی ہے..... پھر بھلا میں کیوں اس خجال میں پڑوں..... میرا  
خیال ہے تو میری بات سمجھ رہا ہے۔“ سوڈھل نے آخر میں ساون کو عیارانہ نگاہوں سے  
دیکھتے ہوئے مکاری سے کہا تو ساون اس کی بات سمجھ گیا تاہم وہ مدافعانہ لہجہ اختیار کرتے  
ہوئے بولا۔

”تیری بات برابر چا چا سوڈھل!..... پر تو یہ بھی تو دیکھ کہ میں نے یکمشت پورے  
پچاس ہزار تیرے قدموں میں ڈال دیئے ہیں جبکہ مجھے یقین ہے کہ دودے نے ابھی تجھے  
کچھ بھی نہیں دیا ہوگا۔“ ساون اتنا کہہ کر رکا..... سوڈھل نے دانستہ مکارانہ چپ اختیار کر  
رکھی تھی اور ساون اسے اپنی بات کی اثر پذیری پر محمول کرتے ہوئے مزید پُر زور لہجے میں  
بولا..... ”دیکھ نا چا چا! حق تو میرا ہی بنتا ہے نا پہلے رشتہ لینے کا.....“

”اچھا ٹھیک ہے پھر..... تو بھلے روپے اپنے سارے لے جا..... میں جب تجھے  
تاریخ دینے آؤں گا تو..... پیسے لے لوں گا.....“ حریص سوڈھل نے چال بازی سے  
کہا..... جس پر حسب توقع ساون فوراً بولا۔

”نہیں چا چا..... یہ کیسی بات کرتا ہے تو..... تیری زبان پر مجھے بھروسہ ہے..... یہ  
پیسے رکھ لے تو بے شک..... میں تیرا انتظار کروں گا..... میں پھر..... تیری ہاں اپنے حق میں  
سمجھوں نا۔“

ساون نے اٹھتے ہوئے آخر میں گویا اپنی تسلی چاہی..... تو سوڈھل بھی اپنی گود میں رکھے

..... درحقیقت وہ اپنی شوخ و چنچل اور منہ پھٹ چچا زاد سورتھ کی اس بات سے بھی اچانک پریشان ہو گیا تھا کہ اس کا چاچا چچی بھی عنقریب اپنے بیٹے گل محمد کے لیے اس کی بہن ہدایتاں کا رشتہ لینے کے لیے اس کے ہاں آنا چاہتے تھے..... اور پھر یہ طور و نہ ساون کے ماں باپ نے بھی اپنے بیٹے کے لیے ان کی بیٹی سورتھ کا رشتہ مانگنا تھا جس پر دونوں خاندان کی رضامندی کسی بھی قسم کے شکوک و شبہات سے بالاتر تھی لہذا اس خبر نے ساون کو اللہ رکھی کے فوری حصول کے لیے متحرک کر دیا تھا اور وہ بغیر سوچے سمجھے وڈیرے کے منشی سے بھاری قرض سود پر لے کر سوڈھل کے ہاں جا پہنچا تھا اور اسی تیزی میں وہ ساری رقم بھی اس کے حوالے کر آیا تھا..... سوڈھل کے گھر سے روانہ ہوتے وقت اس نے ساون کو اگلے دن کا دو جکھرائی کے ہوٹل پر ملنے کی تاکید نے بھی منحصے میں ڈال دیا تھا۔ بہر طور انہی خیالات کی یلغار میں وہ اپنے گھر کی شکستہ گلی میں داخل ہو گیا۔

☆=====☆=====☆

روپوں کا ڈھیر سمیٹتے ہوئے بولا..... ”اس میں کوئی شک ہے کیا..... حق تیرا ہی بنتا ہے..... ویسے تو مجھے ذرا ایک بات بتا تیرے ماں باپ تو خوش ہیں ناں مجھ سے سنگ لینے پر.....“  
اس پر ساون کے چہرے پر ذرا الجھن آمیز خاموشی سی چھا گئی..... بہر طور چند ثانیے بعد بولا..... ”چاچا..... وہ سب راضی ہیں..... بات دراصل یہ ہے کہ میں نے یہ رقم..... بہ طور قرض لی ہے سود پر..... منشی میرل منکن ہار سے..... میرا بیوا اس بات پر راضی نہ تھا..... لہذا ابھی میں نے اسے یہ بات نہیں بتائی ہے کہ.....“  
”اچھا..... اچھا میں سمجھ گیا۔“ چاچا سوڈھل اس کی بات کاٹ کر اور بات کی تہہ تک پہنچتے ہوئے بولا..... ”چلو بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا..... پرسن..... تو مجھ سے کل یاد سے..... کا دو جکھرائی کے ہوٹل پر ملنا.....“

”کیوں چاچا خیر تو ہے نا۔“ ساون نے پوچھا۔  
”تو وہاں آنا تو سہی..... تجھے بتاؤں گا وہیں پر..... ابھی تجھے بھی دیر ہو رہی ہوگی۔“  
سوڈھل چالاکی سے ساون کو اپنے گھر سے رخصت کرنے کی غرض سے بولا اور ساون اپنے تئیں مطمئن ہونے کے باوجود متذبذب سا وہاں سے نکل آیا۔

☆=====☆=====☆

ساون جب سوڈھل کے گھر سے روانہ ہوا تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اگرچہ سردی میں اتنی کاٹ نہیں تھی تاہم وہ قدرے تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کی جانب چلا جا رہا تھا..... تاروں سے بھرا آسمان بالکل صاف تھا..... جن کی مدہم روشنی میں ساون کو کوئی مشکل درپیش نہیں آرہی تھی..... ساون یوں تو سوڈھل کے گھر سے مطمئن ہو کر نکلا تھا لیکن جانے کیوں اس کے دل میں ایک عجیب اور بے نام سی ”کھٹک“ بار بار سراپا رہی تھی..... اسے اب رہ رہ کر اس بات کا قلق ہو رہا تھا کہ اسے ابھی یک دم اتنی بڑی رقم اور وہ بھی ساری کی ساری سوڈھل کو دینی نہیں چاہئے تھی..... بے شک سوڈھل ایک جانا پہچانا شخص تھا..... لیکن بہر طور وہ فرشتہ نہیں تھا..... مگر ساون نے اپنے اس خام خیال کو جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا کہ..... یہ سب ضروری تھا..... سوڈھل کا اعتماد بحال کرنے کے لیے اور فیصلہ اپنے حق میں کرانے کے لیے..... جس پر اسے خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی تھی..... ورنہ دودا خان نے سوڈھل سے اللہ رکھی کا سنگ لینے کے لیے پچاس ہزار ہی معاوضہ مقرر کیا تھا یہ الگ بات تھی کہ ساون نے یکمشت اکٹھے ہی روپے سوڈھل کے آگے رکھ دیئے تھے..... لہذا اس نے جو کیا بالکل ٹھیک کیا اور موجودہ حالات کی نازک روش کو دیکھتے ہوئے بالکل درست کیا تھا



مصافحے کے بعد اپنے قریب ہی بچھے اسٹول پر اسے بٹھا دیا اور سوڈھل جو ابارسی کلمات کی ادائیگی کے بعد خاموش ہو رہا۔ ”اڑے بابا چھوڑا!“ دودا خان نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے ایک پیش کار لڑکے کو آواز دی۔ ”بابا کڑک چائے لاؤ جلدی۔“ پھر وہ سوڈھل کی جانب متوجہ ہوا۔ ”ہاں بابا سوڈھل اور سناؤ کیا حال ہے۔۔۔۔۔ میں آج سوچ ہی رہا تھا کہ تیرے پاس ایک چکر لگا آؤں۔۔۔۔۔ پراچھا کیا تو آگیا خود ہی۔۔۔۔۔ کیا خدمت کروں تیری۔“

سوڈھل گوگو چہرہ لئے خاموش رہا۔ اس کے لمبوترے چہرے کی سلوٹیں آپ ہی آپ گہری ہوتی چلی گئیں، تب دودا خان نے آنکھیں سکیڑیں۔۔۔۔۔ وہ جواب کے انتظار میں اس کی جانب تنکے جا رہا تھا۔ ”سوڈھل! اڑے یا خیریت تو ہے۔۔۔۔۔ کچھ بات کر۔۔۔۔۔ کیا ہوا بابا۔۔۔۔۔؟“ بالآخر دودا خان اسے مخاطب کرتے ہوئے دوبارہ بولا۔

”دودا خان! تو تو جانتا ہے میں اگر کسی کو ایک بار زبان دے دوں تو اس سے پھر ہٹتا نہیں۔۔۔۔۔ تو نے مجھ سے اللہ رکھی کا اپنے لیے سنگ مانگا میں نے انکار نہیں کیا اور کچھ پیسے بھی تو نے بہ طور خرچہ مجھے دیئے۔۔۔۔۔ میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ ایک گہرے تشویشناک انداز میں سوڈھل اپنی ہی بات کاٹ کر چپ ہوا تو دودا خان یک دم کھٹک گیا۔ وہ اس کے متفکر چہرے کی جانب بغور گھورتے ہوئے مخاطب ہوا۔

”سوڈھل! بابا سیدھی بات کر کیا ہوا ہے۔ کیا مسئلہ ہے آخر۔۔۔۔۔“

عیار سوڈھل دودا خان کے کھر درے لہجے سے ایک لمحے کو بدک سا گیا پھر اپنے چہرے پر مکارانہ بے چارگی طاری کرتے ہوئے بولا۔ ”دودا سائیں۔۔۔۔۔ تجھے تو پتہ ہے کہ میری کوئی اولاد نہیں۔۔۔۔۔ ہم بوڑھے زندگی کی گاڑی جیسے تیسے اکیلے گزار رہے ہیں۔۔۔۔۔ اور میرے جیسے بڑھے کے گھر کے کچے آنگن میں اگر جوان بیری لگ جائے تو پتھروں کو روکنے کی بھلا ہم کہاں طاقت رکھتے ہیں۔“

”ہاں تو بابا! بتاؤ نا۔۔۔۔۔ کون پتھر مار رہا ہے۔۔۔۔۔ نام بول اس کا۔“ سوڈھل کی بات پر دودا خان بولا اس بار اس کا لہجہ ذرا دھیمہ تھا۔

”ساون نام ہے اس پتھر مار چھو کرے کا۔“ سوڈھل بلا تکلف بولا۔ ”بہت تنگ کرنے لگا ہے مجھے وہ۔۔۔۔۔ کل تو مجھے وہ باقاعدہ دھمکی دینے آیا تھا کہ اگر میں نے اللہ رکھی کا ہاتھ دودا خان کو دیا تو۔۔۔۔۔ اب تو خود بتا میں میں بڑھا آدمی اس چھو کرے کو کب تک سہتا رہا ہوں گا؟“ سوڈھل اتنا بتا کر خاموش ہو گیا تاہم اس نے کن آنکھوں سے دودا خان کے کھلتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں اسے حسب توقع ایک جوالہ کبھی سا نظر آیا اور یہی وہ

دودا خان کی جب سے ساون سے بڑبھڑھوئی تھی وہ مسلسل غصے سے پھٹک رہا تھا حالانکہ اس سے قبل وہ ذرا بھی اسے خاطر میں نہیں لاتا تھا لیکن اب وہ ساون کو اللہ رکھی کے حصول کے سلسلے میں اپنے لئے ایک بڑی رکاوٹ تصور کرنے لگا تھا۔ تاہم اسے اس حد تک تسلی ضرور تھی کہ وہ چاچا سوڈھل کو دس ہزار روپے کیش دے چکا تھا اب چاہے ساون کہیں سے بھی روپے پیسے کا بندوبست کرے بالفرض محال کر بھی لیتا ہے تو تب بھی سوڈھل جیسا جہاندیدہ شخص ایسی بچکانہ حرکت نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی بھتیجی اللہ رکھی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دے۔۔۔۔۔ مگر دودا خان کو جانے کیوں یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ اللہ رکھی کا جھکاؤ زیادہ تر ساون ہی کی طرف تھا۔ وہ اس وقت اپنے چھپر ہوٹل کے دخل پر موجود مٹھی میں بیڑی دبائے سوچتے ہوئے گہرے گہرے کش لے رہا تھا۔۔۔۔۔ ابھی طائر شام نے اپنے سرمئی پنکھ نہیں پھیلائے تھے۔۔۔۔۔ اسے سوڈھل پر بھی غصہ آ رہا تھا جس نے دس ہزار بہ طور ”بیعانہ“ لے کر بھی ہنوز اسے آسرے پر رکھا ہوا تھا اور ابھی تک تاریخ دینے اس کے ہاں نہیں آیا تھا حالانکہ اس نے کہا تھا کہ وہ خود اس کے پاس آئے گا شادی کی تاریخ بتانے۔۔۔۔۔ لہذا اس نے آج ہی سوڈھل سے ملاقات کرنے کا قصد کیا۔۔۔۔۔ مگر اسے اپنے بیٹے محرم علی کا انتظار تھا۔ کیونکہ وہ دخل خالی چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ ہوٹل میں حسب معمول لوگ باگ لکڑی کی بیچوں پر بیٹھے چائے نوشی کرنے کے علاوہ باہم بات چیت میں مشغول تھے۔ مائی بھاگی کی آواز میں ریکارڈ بج رہا تھا۔۔۔۔۔ اسی وقت دودا خان ایک شخص کو ہوٹل کے احاطے میں آتے دیکھ کر چونک پڑا۔۔۔۔۔ مذکورہ شخص چاچا سوڈھل تھا۔۔۔۔۔ وہ ایک پرانی سی چادر اوڑھے اس کی طرف آ رہا تھا۔۔۔۔۔ جانے کیوں سوڈھل کو دیکھ کر دودا خان کا اضطراب آمیز غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

”بسم اللہ۔۔۔۔۔ بابا سوڈھل سائیں! آؤ آؤ؟ بیٹھو، کیسے ہو؟“ اس کے قریب آتے ہی دودا خان خوشدلی سے اس کا استقبال کرتے ہوئے بولا اور اٹھ کر ایک بھر پور معائنے اور

چاہتا تھا کہ کسی طرح ان دونوں یعنی دودا خان اور ساون کو آپس میں لڑا دے اور جس میں یقینی فتح دودا خان ہی کی اسے نظر آرہی تھی۔

سوڈھل کا منصوبہ ساز ذہن بڑے تباہ کن اثرات لئے ہوئے تھا۔ لہذا جب اس نے دودا خان کو اندر ہی اندر غصے سے بل کھاتے ہوئے دیکھا تو بڑی مکاری سے بولا..... ”دودا خان، دیکھ خود کو سنبھال..... وہ کل کا چھو کر ا ہے..... مجھے یقین ہے تیرے آگے وہ ذرا نہیں ٹھہر سکتا..... اس لئے کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھانا کہ بعد میں تو خدا نخواستہ کسی مصیبت میں پھنس جائے کیونکہ بعض مرتبہ سکے کے ساتھ ساوک بھی جل جایا کرتا ہے۔“

”میں اپنا کام خود بہتر طریقے سے کرنا جانتا ہوں سوڈھل!“ دودا خان گمبھیر لہجے میں بولا..... ”تو اپنا کام کر..... اور مجھے تاریخ بتا..... میں کس دن جج (بارا ت) لے کر آؤں تمہارے پاس..... ساون سے میں نمٹ لوں گا بعد میں اچھی طرح.....“

”وہ تو ٹھیک ہے سنگت سائیں!..... پر اس چھو کرے ساون کا میں کیا کروں.....؟“

”اڑے بابا کہنا میں نے نمٹ لوں گا اس سے۔“ دودا خان درشتگی سے بولا۔ ”تو مجھے تاریخ بتا کب آؤں میں۔“

اس کی بات سن کر سوڈھل نے ایک اور پینٹر بدلا اور بولا..... ”تاریخ تو میں نے تجھے اسی چاند کی اٹھارہ ہی دینی تھی..... پر تیری بھاجائی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے..... جوڑوں کے درد نے بالکل ہی ادھ موا کر دیا ہے بے چاری کو.....“

”اسے دکھاتا کیوں نہیں ہے..... اپنے حکیم بڈھل کو..... کہے تو میں اسے کہہ دوں..... وہ دیکھ لے گا اچھی طرح بھاجائی کو..... اور دوائی بھی اچھی بنا کر دے گا۔“ دودا خان نے تجویز پیش کی۔

”ہاں..... لے کر گیا تھا اس کے پاس بھی میں..... مگر عارضی افاقہ ہوا تھا.....“ سوڈھل نے بتایا..... ”اب کے کہہ رہا تھا کہ نیل گاڑی میں ڈال کر شہر کے بڑے سرکاری ہسپتال لے جاؤ..... کہتا تھا کہ اس موڈی درد نے اب دل پر حملہ کرنا شروع کر دیا ہے..... جس میں جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔“

چالاک سوڈھل کی بات پر دودا خان کے چہرے پر الجھن سی نمودار ہو گئی۔ سوڈھل ترجیحی اور مکارانہ نظروں سے برابر اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

”اڑے بابا! تو لے جا بھاجائی کو شہر..... دیر کس بات کی ہے پھر.....“ دودا خان

بولا..... اس کے لہجے میں اب ایکا ایکی بیزاری عود کر آئی تھی جبکہ سوڈھل اس کے منہ سے متوقع جواب سن کر ایک اور پتہ پھینکتے ہوئے بولا۔

”یہی تو مسئلہ ہے سارا..... شہر جاؤ تو کم سے کم دس بیس ہزار ہونے چاہئیں۔“

”اتنے سارے روپے.....! سرکاری ہسپتال میں تو اتنے روپے نہیں لگتے یار سوڈھل.....“ دودا خان حیرت سے بولا۔

”اسی لئے تو دس بیس ہزار کہے ہیں..... ورنہ تو پورے پچاس ہزار کا خرچہ ہے..... حکیم بڈھل بتا رہا تھا کہ اس بیماری کے علاج میں استعمال ہونے والی دوائیاں بہت مہنگی ملتی ہیں..... اور تجھے تو پتہ ہی ہوگا دودا خان کہ سرکاری ہسپتال سے تو دوائیاں ملتی نہیں..... خود ہی خریدنی پڑیں گی..... میڈیکل سنور سے..... پھر پتہ نہیں کتنے دن وہاں رہنا پڑے۔ پردیس میں سوسمٹے ہوتے ہیں جان کو.....“

”اچھا بابا..... لے جا شہر بھاجائی کو..... جتنا بھی پیسہ لگے..... علاج تو کروانا ہے نا آخر..... پر تاریخ تو دے دے مجھے.....“ دودا خان نے کہا۔

اس کی بات سن کر سوڈھل بولا..... ”تاریخ کی تو فکر نہ کر دودا خان وہ میں تجھے شہر سے لوٹتے ہی دے دوں گا اور نزدیک ہی کی دوں گا.....“

”کیا مطلب!..... یعنی تو شہر سے آئے گا تو مجھے تاریخ دے گا.....!“ دودا خان جھنجھلاہٹ آمیز حیرت سے بولا..... اور سوڈھل جواباً چپ رہا..... ”اچھا بابا پھر لے جا بھاجائی کو شہر کے ہسپتال..... دیر کیوں کر رہا ہے.....“ دودا خان نے دوبارہ کہا تو سوڈھل مکارانہ بے چارگی سے بولا۔

”دودا سائیں! پیسے کا مسئلہ ہو رہا ہے..... اگر کہیں سے بندوبست ہو جائے تو میں صبح تڑکے نیل گاڑی میں بیوی کو ڈال کر روانہ ہو جاؤں شہر۔“

”ہوں.....“ دودا خان نے ہنکاری بھری پھر پوچھا۔ ”کتنے چاہئیں؟“

”ظاہر ہے دودا سائیں بیس پچیس تو ہوں پاس.....“ حریص سوڈھل یک دم بولا۔

”اتنے تو میں تجھے ابھی نہیں دے سکتا سوڈھل۔“

دودا خان انکاری لہجے میں بولا..... تو سوڈھل کو اس کی بات قدرے ناگوار لگی مگر وہ بھی ایک کانیاں تھا مکاری سے بولا..... ”دودا خان تو نے اللہ رکھی کے سنگ کے لئے تو مجھے ویسے بھی چالیس دینے ہی ہیں بھلا بیس پچیس ہزار پہلے دے دے گا تو کیا ہو جائے گا.....“

تجھے پتہ ہے دودا خان وہ کل کا چھو کر ساون بھی میرے پاس پورے پچاس ہزار لے کر آیا

”ہا بابا..... تو فکر ہی نہ کر..... تیری بھاجائی کو خیر خیریت کے ساتھ شہر سے لے آؤں..... پھر تجھے تاریخ دے دوں گا۔“ سوڈھل نے جواباً کہا پھر اس کے بعد وہ مسرور سا ہو کر وہاں سے لوٹ آیا۔

☆=====☆=====☆

اگلے دن ساون متذبذب سا ٹھیک مقررہ وقت پر کا دو جکھرائی کے چھپر ہوٹل پہنچا جہاں دغا باز سوڈھل پہلے ہی سے ہوٹل کے بیرونی حصے میں ایک لکڑی کی بوسیدہ بیچ پر بیٹھا اس کا منتظر تھا..... پاس ہی خالی چائے کی پیالی رکھی ہوئی تھی جس پر کھیاں بھننا رہی تھیں..... یہ شام سے ذرا پہلے کا سہ تھے..... کا دو جکھرائی کا ہوٹل گوٹھ کے سرے پر شہر جانے والی سڑک کے کنارے ہی واقع تھا.....

”آ بابا..... آساون..... کیا خال ہے..... چائے پاڑیں منگواؤں تیرے واسطے.....“ رسمی کلمات کے دوران سوڈھل نے یونہی سرسری پوچھا۔

”نہیں چا چا چائے پاڑیں کی خبر ہے..... مجھے یہ بتا کس واسطے تو نے مجھے یہاں بلایا ہے..... مجھے بڑی فکر ہو رہی ہے۔“ ساون اذراہ تفکیر بولا۔

سوڈھل اپنے لمبو تر چہرے پر الجھن آمیز تاثرات لاتے ہوئے بولا..... ”ساون! میں، یہ بات تجھ سے اپنے گھر میں بھی کر سکتا تھا۔ پردیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں..... دیکھ ساون میں ایک کمزور اور بوڑھا شخص ہوں جو شتم شتم اپنی بیمار بیوی کے ساتھ حیات کی گاڑی گھسیٹ رہا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ میرا کوئی تیرے جیسا جوان بٹ نہیں..... جو میرا بازو بنتا..... دودے خان کو تو تو جانتا ہی ہے ناں.....“ اتنا کہہ کر وہ ذرا خاموش ہوا..... اس کا لہجہ آخر میں انتہائی سرگوشیا نہ ہو گیا تھا اور وہ تھوڑا ساون کی طرف آگے کو بھی جھک آیا تھا۔ ساون کے چہرے پر ایک ہیجان خیز خاموشی کھنڈ آئی تھی..... عیار سوڈھل مزید بولا..... ”ساون! تجھے تو پتہ ہی ہے کم بخت دودا خان بھی میری اللہ رکھی کا بیڑی ہو رہا ہے..... وہ بھی اس کا رشتہ لینا چاہتا ہے پر تجھے معلوم ہے میری پھول جیسی اللہ رکھی اس بڑھے گدھے کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی..... تو اب ایسا کر..... پہلے میری جان اس کینے بڑھے دودا خان سے چھڑا دے..... کسی طرح..... تاکہ میں بے فکری سے اپنی اللہ رکھی تیرے ساتھ بیاہ دوں.....“ منافق سوڈھل..... ساون کے دماغ میں خناس ڈالنے کی غرض سے بولا اور پھر چپ ہو کر اپنی چند ہی آنکھوں سے ساون کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات کی تغیر پذیریری کھوجنے لگا۔

تھا..... پر میں نے اسے ٹھکرا دیا۔ اب سوچ رہا ہوں رکھ لیتا تو اچھا تھا.....“

”سوڈھل!“ دودا خان اس کی بات پر ایک دم چراغ پا ہو کر دھاڑا..... لیکن سوڈھل ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا تھا۔ ”سوڈھل! سوچ بچار کر بات کر..... تیرا کیا مطلب ہے..... ساون نے اگر یکشت تیرے آگے روپے ڈال دیئے تو کیا تو اللہ رکھی کا سنگ اس کے ہاتھ دینے کے لیے تیار ہو جائے گا.....“ دودا خان قدرے درشت لہجے میں بولا۔

”اب ایسی بھی بات نہیں، پر میری مجبوری ہی سمجھ..... مجھے اس وقت پیسوں کی سخت ضرورت ہے.....“ سوڈھل معقول لہجے میں بولا۔ ”اب تو خود ہی بتا..... تیری بھاجائی عنایتاں کو کچھ ہو گیا خدا نخواستہ تو میرا کیا بنے گا۔“

اس کی بات سن کر دودا خان کا جوش ذرا کم ہوا اور وہ سوڈھل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا..... ”اچھا بتا کتنے چاہئیں..... میں دوں گا تجھے بول.....“ اور چالاک سوڈھل اپنی بات بننے دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرا اٹھا۔

”کچھ زیادہ نہیں دودا سائیں..... صرف 30 ہزار۔“ سوڈھل نے مکاری سے بتایا تو ایک لمحے کے لیے دودا خان کا منہ کھل گیا۔

لہذا وہ متحیر ہو کر بولا..... ”30 ہزار.....! سوڈھل کیا یہ کم ہیں؟“

”بابا ہمارے لیے تو زیادہ سہی..... پر، تیرے شوں کار (آسودہ حال) کے لیے تو کم ہی ہیں نا..... دودا سائیں.....“ چالاک سوڈھل نے جواباً کہا تو چند ثانیے دودا خان خاموشی کے بعد بالآخر ایک ہنکاری مار کر ہامی بھرتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے..... سوڈھل..... رقم میں تجھے دے دیتا ہوں..... پر یاد رہے..... دس میں تجھے پہلے بھی دے چکا ہوں۔ ان میں کو بھی شامل سمجھنا..... اب میں صرف تجھے اللہ رکھی کے سنگ کے لیے دس ہزار دوں گا اس طرح تیرا پچاس ہزار پورا ہو جائے گا۔“

”ہا..... سائیں..... برابر مجھے یاد ہے..... درحقیقت میں تجھ سے یہ بھی بعد میں ہی لیتا پر کیا کروں بیماری اور شفاء اللہ کے ہاتھ میں ہے..... تیری بھاجائی اچانک بیمار نہیں پڑتی تو.....“

”اچھا..... اچھا..... ٹھیک ہے۔“ دودا خان اس کی بات کا منٹے ہوئے بولا.....

”بھاجائی کو لے جا تو پہلے شہر علاج کے واسطے..... اور رقم بھی صبح تڑکے آ کر ادھر ہی سے لے جانا..... مجھ سے..... پر اتنا یاد رہے..... آتے ہی مجھے تاریخ دینی ہوگی تیرے کو..... اور وہ بھی قریب کی..... کیا سمجھا.....“

ساون واقعی اندرونی طرح سے ایک ابال کی سی کیفیت سے دوچار ہو گیا..... تاہم وہ بولا..... ”جا چا سوڈھل! تجھے دودا خان سے زیادہ خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے..... ٹوئس اللہ رکھی سے میری شادی کا ترنت بندوبست کر..... میں اس بڑھے دودے خان سے نمٹ لوں گا بعد.....“

”یہی تو میری بات تو نہیں سمجھ رہا ناں..... پٹ.....“ سوڈھل منافقت سے بولا..... ”اللہ رکھی کی طرف سے تو بے فکر ہو جا..... وہ تیرے نام ہو چکی ہے..... لیکن میں چاہتا ہوں کہ پہلے اس کم بخت دودا خان کا قضیہ نمٹ جائے..... تو اچھا ہے..... کیا معلوم وہ ذلیل عین میری اللہ رکھی کی شادی والے دن کوئی ہنگامہ کر دے..... اولاد تو میری اپنی ہے نہیں..... وہ میرے مرحوم بھائی کی نشانی ہے جواب میرے واسطے اولاد کا درجہ رکھتی ہے..... اب اس کی خوشیاں بھی رل جائیں..... بھلا یہ میں کس طرح برداشت کروں گا۔“ مکار سوڈھل یہ کہتے ہوئے مگر مجھ کے آنسو بہانے لگا۔

ساون عیار سوڈھل کی منافقانہ روش پر گوگو کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا..... ماحول پر عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہوٹل کا شیپ ریکارڈ رنچ رہا تھا..... البتہ سامنے سڑک پر کبھی کبھار کوئی ویگن یا بس شور مچاتی گزر جاتی تو پرسکون ماحول میں کچھ دیر تک ارتعاش سا پھیلا رہتا۔ دور چالوں کے کھیتوں کے کنارے افق، غروب ہونے سورج کی گلابی نکیہ سے نارنجی ہو رہا تھا..... اور دھیرے دھیرے سردی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا..... ہوٹل میں لوگ بھی کم ہی تھے اور جتنے تھے وہ سب اندرونی حصے میں بیٹوں پر بیٹھے بوسیدہ سی ادنی چادریں اوڑھے..... ہاتھوں میں چائے کی دھواں اڑاتی گرم گرم پیالیاں پکڑے باتوں میں مشغول تھے۔

سادہ لوح مگر بڑرساون نے مکار سوڈھل کی بات کا اپنے تئیں یہی مطلب اخذ کیا تھا کہ سوڈھل کی چونکہ اپنی کوئی اولاد نہیں اسی لئے اللہ رکھی، جو اس کے مرحوم بھائی کی نشانی اور اس کی اکلوتی بیٹی تھی لہذا وہ اپنی چیتیتی بیٹی اللہ رکھی کی خوشیوں کو خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اور اسی لئے وہ پہلے موزی دودا خان کا قضیہ نمٹانے کا خواہشمند تھا۔ ساون کو بھلا کیا معلوم تھا کہ اس میں دغا باز سوڈھل کی ایک ایسی چال کا رفرما تھی جس کے ذریعہ وہ ایک تیر سے دو خنکار یا بے الفاظ دیگر..... سوڈھل ساون کا پچاس ہزار بغیر ڈکار لئے ہڑپ کرنے کے چکر میں تھا۔

بہر طور..... ساون سوڈھل کو اپنا اور اللہ رکھی کا خیر خواہ سمجھتے ہوئے اسے تسلی دے کر

وہاں سے چلا آیا..... سوڈھل کو تو اس نے اپنے تئیں مطمئن کر دیا تھا لیکن خود اس کی اپنی ذہنی کیفیت دیگرگوں ہو رہی تھی اسے خود بھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ آخر اس بڑھے دودے خان سے کس طرح نمٹے..... اس سلسلے میں وہ دودا خان کے بڑے اور سرکش بیٹے علی بخش سے بھی ذکر کر چکا تھا..... علی بخش بذات خود اس کا بھی دوست تھا..... اور وہی ایک ایسا شخص تھا جو اپنے باپ دودے خان کی تیسری شادی کی بھرپور مخالفت یا اس میں رکاوٹ کھڑی کر سکتا تھا..... لہذا علی بخش سے وہ خاص پُر امید تھا کہ ہو سکتا ہے بڑے بیٹے کی مخالفت کے آگے باپ کو اپنا ارادہ بدلنا پڑے۔

ساون اس ادھیڑ بن میں جب اپنے گھر پہنچا تو ٹھٹھرتی رات اتر چکی تھی..... مگر اسے اپنے گھر میں قدرے گرمی کا احساس ہوا..... اس نے محسوس کیا کہ اس کے ماں باپ کے چہروں پر آج غیر معمولی جوش کی گرمی تہمارہی تھی..... کچھ ایسی تمازت اس نے اپنی جھوٹی مگر جوان بہن ہدایتاں کے چہرے پر بھی محسوس کی..... لہذا جب وہ اس کے آگے چارپائی پر روٹی کی چھابی رکھنے لگی تو بے اختیار ساون سے نہ رہا گیا..... وہ اپنی بہن سے مستفسر ہوا..... ”ادی! کیا بات ہے؟ امڑ اور پیو کے آج تیور ہی اور نظر آرہے ہیں.....“

اس کی بات پر ہدایتاں کے گندمی چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا..... تاہم وہ بولی۔ ”ہاں ادا! کچھ ایسی ہی بات ہے..... وہ..... آج چا چا اور چاچی آئے تھے..... مٹھائی اور پھل لے کر..... مجھے خرچی بھی دے کر گئے ہیں..... تیری بھی خرچی میرے پاس ہے.....“ بہن کی بات سن کر ساون دھک سے رہ گیا..... اس کا ہاتھ چاول کی روٹی پر نوالہ توڑتے توڑے رک گیا جبکہ ہدایتاں اتنا تاتا کر چلی گئی تھی..... بہن کی بات سن کر اس کے اندر اچانک ہی خطرے کی گھنٹی بجنے لگی اور اپنی عم زاد منہ پھٹ سورٹھ..... کی وہ بات یاد آگئی جو اس نے کل شام تنہائی کا موقع پا کر اسے پیشگی اطلاع کے طور گوش گزار کی تھی..... اسے معلوم تھا کہ چا چا پرل اور چاچی مع لوازمات کے کیوں آئے تھے۔

ساون نے جیسے تیسے کھانا زہر مار کیا..... ابھی وہ فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کی ماں اندر آئی..... ”پٹ! وہ آج تیرے پرل چا چا اور چاچی آئے تھے..... ہدایتاں اور تجھے خرچی بھی دے کر گئے ہیں.....“

”ہاں امڑ! پتا ہے مجھے..... ہدایتاں نے بتایا تھا مجھے!“ ساون قدرے بیزاری سے بولا..... ”اتنے میں اس کی ماں اس کے آگے سے کھانے کے برتن سمیٹ چکی تھی۔“

”وہ..... بھا پرل ہدایتاں کو اپریں گل محمد کے لیے مانگنے آیا تھا.....“ اس کی ماں

بات کہیں گے۔ میں نے اللہ رکھی کو دیکھا تو نہیں ہے پھر بھی مجھے یقین ہے کہ میرے بھائی کی سورتھ..... تیرے لئے زیادہ بہتر رہے گی.....“

”بابا..... میرے لئے کون بہتر ہے گا..... یہ میں جانتا ہوں اچھی طرح کیونکہ لڑکی کے ساتھ زندگی میں نے گزارنی ہے.....“ ساون باپ کی بات قدرے محل سے سننے کے بعد فوراً بولا..... ”میں شادی کرپوں گا تو صرف اللہ رکھی سے۔“

اس کی اس گفتگو پر اس کا باپ قدرے اونچے لہجے میں بولا..... ”اڑے تو تو چریا ہو گیا اس یتیم چھوڑی کے پیچھے..... ہیں..... جس چھوڑی کو حاصل کرنے کے لیے تو پچاس ہزار جیسی بڑی رقم کا (قرضدار) ہو جائے بھلا ایسی چھوڑی تجھے شادی کے بعد کیا خوشیاں دے سکتی ہے۔ ہیں..... بول بتا مجھے۔“ موگو جذبات کی شدت سے کپکپانے لگا.....

اپنے شوہر کو جوان اولاد پر غصہ ہوتا دیکھ کر موگو کی بیوی ایک دم باپ بیٹے کے بیچ آتے ہوئے اپنے شوہر سے بولی۔ ”ائے..... ہے، ذرا..... آرام سے بات کر پٹ ساون سے..... جوان پٹ ہے اپنا لہجہ ذرا ہولے رکھ.....“

بیوی کی بات سن کر موگو کو اور بھی غصہ چڑھنے لگا مگر وہ کافی حد تک اس پر قابو پاتے ہوئے اپنی بیوی سے قدرے تیز لہجے میں بولا..... ”تو نے ہی اس کا دماغ آسمان پر پہنچایا ہوا ہے..... تو بتا دے پھر اپنے اس جوان پٹ کو..... اسے ہماری بات ماننی پڑے گی..... اس کی فضول اور بے کار ضد کے آگے میں اپنے بھائی کے ساتھ تعلقات خراب نہیں کرنا چاہتا.....“ موگو اتنا کہہ کر کوٹھڑی سے نکل گیا..... ساون کی ماں بے چاری حیران پریشان کھڑی رہ گئی جبکہ خود ساون باپ کے قطعیت بھرے لہجے پر گولم میں مبتلا ہو گیا تھا۔

حرص و ہوس اور لالچ ایک ایسی دلدل ہے جس میں انسان جانتے بوجھتے دھنستا چلا جاتا ہے..... اور جتنا اندر دھنستا ہے اتنی ہی اس کی طمع بھی بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ یہی لو بھہ لالچی شخص کو تعرف میں ہمیشہ کے لیے غرق کر کے رکھ دیتا ہے..... حریفوں سوڈھل بھی ایک ایسا ہی لالچی شخص تھا اور اپنے عبرت ناک انجام سے بے پروا ہو کر لالچ اور حرص کی دلدل میں اترتا چلا جا رہا تھا..... پہلے بڑھے دو داخان سے اپنی اکٹوتی جوان بیٹی کی شادی دینے کا معاوضہ دس ہزار..... اور پھر اسی بہانے بعد میں اس سے تیس ہزار بیٹھ لئے اور دوسری طرف ساون سے بھی اللہ رکھی سے شادی کرنے کا جھوٹا وعدہ کرتے ہوئے اس سے پورے پچاس ہزار کی رقم ہضم کر چکا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اب دو داخان اور ساون کو بھی آپس میں لڑانے کی کوشش کر رہا تھا..... مقصد یہی تھا کہ وہ اپنی سونے کی چیز (اللہ رکھی)

نے بتایا۔ ”اچھی بات ہے..... مجھے کوئی اعتراض نہیں..... اگر تم لوگوں کو نہیں ہو تو..... گل محمد اچھا لڑکا ہے..... ادی ہدایتاں یقیناً اس کے ساتھ سکھی رہے گی۔“ ساون نے بالآخر اس سنجیدہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا..... اور سوالیہ نگاہوں سے متذبذب کھڑی اپنی ماں کے چہرے کی جانب تکتے لگا جیسے وہ کوئی دھماکہ کرنے والی ہو..... اس نے سر پر اجرک اوڑھ رکھی تھی..... بالآخر ساون کو اپنی ماں سے جس بات کی توقع تھی وہ اس کی ماں نے کہہ ہی ڈالی۔

”پٹ ساون! تیرا چاچا پر پیل پیسوں کی بجائے سنگ کے بدلے سنگ لینا دینا چاہتا ہے وہ وہ سٹ کرنا چاہتا ہے..... اپنی بیٹی سورتھ کا سنگ تجھے.....“

”امڑ..... یہ تو کیا کہہ رہی ہے.....“ ساون ایک دم اپنی ماں کی بات کاٹتے ہوئے چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا..... ”نہ صرف تجھے بلکہ پیو کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کسی اور سے شادی کرنا چاہتا ہوں..... اور اس کے سوا میں کسی اور چھوڑی کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا ہے..... اپنے.....“ ساون قدرے سخت لہجے میں بولا.....

اس کی ماں کے چہرے پر گہری متانت عود کر آئی وہ بولی..... ”پٹ!..... تیرے پیو کو معلوم تھی یہ بات اچھی طرح سے اور اس نے بھائی پر پیل کو بھی اشاروں میں یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ بے شک اپنے پٹ گل محمد کے واسطے ہماری ہدایتاں کا سنگ لے لے اور بدلے میں اپنی بیٹی سورتھ کا سنگ تجھے دینے کی بجائے رواج کے مطابق تھوڑے پیسے بے شک دے دے..... پر وہ نہیں مانا..... کہتا تھا کہ بدلے میں پیسوں کی بجائے سنگ داری ہی کروں گا۔“

ماں کی گفتگو سے ساون نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کے ماں باپ چاچا پر پیل کی ہٹ دھرمی کے آگے خاموشی اختیار کرنے پر نہ صرف مجبور ہو چکے ہیں بلکہ اب وہ اس پر دباؤ ڈال کر اپنی عم زاد سورتھ سے شادی کرنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں، جبکہ ساون بھی اپنی ہٹ دھرمی کا پکا تھا وہ اللہ رکھی کے سوا کسی اور سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا..... اور پھر اس سے پہلے کہ ساون اپنی ماں سے مزید کچھ کہتا اس کا باپ موگو..... بھی اندر کوٹھڑی میں آگیا..... غالباً اسے باہر ہی اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اندر کمرے میں ماں بیٹے کے درمیان کس نوع کی گفتگو ہو رہی ہے..... لہذا وہ اس اہم گفتگو میں شریک ہوتے ہوئے ساون سے بولا..... ”اڑے ساون پٹ.....! ہم تیرے ماں پیو ہیں اور تیرے بھلے ہی کی

آج پہلی بار اس نے اس رخ پر سوچا تھا اور دہل کر رہ گیا تھا..... وہ سوچوں میں اتنا محو ہو چکا تھا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ اس کے آگے رکھے ہوئے چاول کب کے سرد ہو چکے تھے۔

☆=====☆=====☆

علی بخش اب آہستہ آہستہ کام دھندے میں دلچسپی لینے لگا تھا..... وہ خود کو اپنی شخصیت کے خول سے باہر نکال رہا تھا..... اسے اس بات کا ادراک ہو چلا تھا کہ زیادتی اور دکھ سہہ کر اپنی ذات کی تاریک کوٹھری میں محبوس ہونے سے کئی درجہ بہتر تھا کہ انسان اپنے اوپر ہونے والی زیادتیوں کے معاشرے سے بھرپور بدلے لے اور اس کا ازالہ کروائے..... یہی وجہ تھی کہ گوٹھ کی گلیوں میں بے مقصد اور آوارہ پھرنے اور اپنی ذات میں تنہا تنہا رہنے والا علی بخش اب اپنی الجھی ہوئی شخصیت کے گرداب سے باہر نکل آیا تھا..... اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس کی مرحومہ ماں حضوران بی بی کے سینے پر مونگ دالنے کے لئے اس کے باپ دودا خان نے اس کی ماں پر سوتن جو بٹھادی اس کی وجہ سے وہ بچپن ہی سے ماں کی ممتا سے محروم ہو گیا تھا کیونکہ اس کی سوتیلی ماں خیراں نے حضوران بی بی کا ناک میں اس قدر دم کیا تھا کہ وہ بے چاری بستر سے جا لگی تھی۔ شوہر کی چیتا تو تھی وہ اس لئے بڑے دھڑلے کے ساتھ علی بخش کی ماں حضوران بی بی کا ناطقہ بند کئے رکھتی تھی..... بالآخر حضوران بی بی کی موت کی آغوش میں جاسوئی اور علی بخش بے چارہ تنہا رہ گیا..... مگر علی بخش اپنی ماں کی موت کا اصل ذمہ دار اپنے باپ دودا خان کو ہی سمجھتا تھا..... ماں کی موت کے بعد کافی عرصے اس کی شخصیت اپنے گھر میں اجنبیوں جیسی رہی تھی..... پھر رفتہ رفتہ اس نے محسوس کیا کہ اس کی اس اجنبیت کو دانستہ تقویت پہنچانے والے دواہم کردار ہیں، اس کی سوتیلی ماں خیراں اور اس کے بیٹا محرم علی کا مقصد ہی درحقیقت یہی تھا کہ علی بخش کو اس کے باپ کی املاک اور جائیداد وغیرہ سے دور رہی رکھا جائے..... مگر بروقت علی بخش دنوں ماں بیٹوں کی سازش بھانپ گیا تھا اور یوں اپنا آپ منوانے اور اپنے حق کا محافظ بننے کی خاطر وہ اب اپنے سوتیلے چھوٹے بھائی محرم علی کے ساتھ ہوٹل کا کام سنبھالنے لگا تھا..... اس کی اس تبدیلی پر دودا خان خوش تھا۔ بالآخر علی بخش اس کا بڑا بیٹا تھا، لیکن بہر حال علی بخش اندر ہی اندر اپنے باپ اور سوتیلی ماں اور بھائی سے خائف رہتا تھا۔

اس کے دوست سادون نے ایک دن علی بخش کو اس دھماکہ خیز اطلاع سے نوازتے ہوئے بتایا کہ اس کا باپ دودا خان اللہ رکھی نائی ایک نوعمر لڑکی سے شادی کر رہا ہے جو خود

کے نئے زیادہ سے زیادہ کھرے کر سکے..... لوگوں کو بتانے کے لیے وہ اللہ رکھی کو اپنی بیٹی کہتا تھا مگر درحقیقت وہ اسے اپنے لئے سونے کی چیز یا سمجھتا تھا..... کا دو جکھرائی کے چھپر ہوٹل میں سادون کو دودے کے خلاف بھڑکا کر وہ بڑا مسرور واپس اپنے گھر پہنچا تو حسب معمول اللہ رکھی کو کام میں جتا ہوا اور اپنی بیوی عنایتاں کو اندر کوٹھری میں چار پائی پر اٹوائی کھٹوائی ڈالے پایا..... جوڑوں کے درد نے اسے خاصا بے حال کیا ہوا تھا..... سردیوں میں تو گٹھینے کا یہ درد اور بھی شدت اختیار کر لیتا تھا اور بالائے ستم اس کا وجود بھی بہت بھاری بھر کم تھا..... کوٹھری نما کمرے کی کچی دیواروں کی وجہ سے اندر ٹھنڈ کی شدت ذرا کم ہی تھی..... اکلوتے بلب کی پہلی روشنی اندر کے محدود ماحول کو بیمار اور سوگوار سا بنا رہی تھی..... ایک عجیب سا سکوت چھایا ہوا تھا..... سوڈھل اپنی رلی پچھی چار پائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا..... اسی اثناء میں اللہ رکھی اندر داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں کھانے کے برتن تھے..... برتن کیا تھے..... ابلے ہوئے گرم گرم سفید چاولوں کی ایک بڑی پلیٹ تھی جس پر مونگ کی پتلی دال پھیلائی ہوئی تھی اور اس میں سے بھاپ کے مرغولے اٹھ رہے تھے..... سوڈھل چاول کھاتے ساتھ کی چار پائی پر لیٹی کراہتی ہوئی عنایتاں کو عجیب نگاہوں سے تنکے لگا..... اپنی بیوی کو تنکے ہوئے منصوبہ ساز سوڈھل کو یوں لگا جیسے کوئی پراسرار سا خیال ایک خناس کی صورت اس کے دماغ میں کسی ناگ کی طرح کلبلارہا ہے..... اور یہی بات نہ تھی پہلے بھی سوڈھل کے اندر اس خیال نے خناس کی صورت سرا بھارا تھا مگر سوڈھل نے اس پر کچھ خاص توجہ دینے کی کوشش نہیں کی تھی مگر آج جانے کیوں وہ اپنے اندر اچانک ابھرنے والے اس پراسرار خیال سے پیچھا نہ چھڑا سکا تھا۔ شاید یہ اس لیے کہ اس کی دائمی مرض میں بتلا بیوی جو ایک مستقل بوجھ کی صورت میں چار پائی پر لیٹی ہو لے ہو لے کراہ رہی تھی..... آج مسلسل اس کی نظروں میں کھٹک رہی تھی..... وہ آج پہلی مرتبہ اپنے اندر ابھرنے والے اس خیال پر غور کرنے لگا کہ وہ آخر کب تک اپنی بیمار بیوی کا بوجھ ڈھوتا رہے گا..... جبکہ وہ خود بھی ایک بوڑھا اور کمزور شخص تھا..... اسے خود بھی اپنی بیوی کی خدمت کی ضرورت تھی..... وہ سو اپنے لگا کہ اللہ رکھی کے آنے سے اس کی بیوی بھی کچھ زیادہ چار پائی سے لگ گئی تھی اور تو اور اٹھ کر پانی کا ایک گلاس پینے سے بھی لاچار ہو گئی تھی..... گھر میں اللہ رکھی تھی تو معمول کے کام روز نمٹ جایا کرتے تھے۔ اللہ رکھی کی شادی کے بعد یہ سب کون کرے گا..... اس خیال نے سوڈھل کو بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور تب پہلی بار اسے اپنی بیوی عنایتاں ایک لاش کی طرح محسوس ہونے لگی۔

اس کی بیٹیوں جیسی ہے اور جس سے خود اس کا دوست ساون شادی کرنا چاہتا ہے وغیرہ.....  
یوں تو علی بخش نے اپنے دوست ساون کی اس سلسلے میں بھرپور مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا.....  
کیونکہ پہلے تو علی بخش کو ساون کی بات پر یقین ہی نہیں آیا تھا کہ اس کا باپ کسی نوعمر لڑکی  
سے تیسری شادی کی تیاریوں میں مصروف ہے مگر ساون کے سنجیدہ اور رنجیدہ لہجے نے اسے  
سچائی ماننے پر مجبور کر دیا تھا..... بہ ظاہر علی بخش نے ساون کو تسلی دے کر لوٹا دیا تھا مگر  
درحقیقت علی بخش چاہ یہی رہا تھا کہ اس کا باپ بھلے تیسری شادی کرتا ہے تو کرے..... آخر  
اس کی سوتیلی ماں خیراں بھی تو ایک سوتن کا عذاب جھیلے..... جس طرح وہ کبھی خود اس کی  
ماں حضوراں بی بی پر سوکن بن کر آتی تھی..... تاریخ اب اپنے آپ کو دہرانے والی تھی.....  
علی بخش اب دل ہی دل میں اپنے باپ کی اس حد تک بڑھی ہوئی بولہبوسی پر خوش تھا۔ وہ  
مسرور ہو کر سوچ رہا تھا کہ تقدیر اب خود ہی اس کی معصوم ماں کا بدلہ لینے والی تھی۔ لہذا علی  
بخش نے بجائے باپ کو تیسری شادی کے اقدام سے روکنے کے خاموشی اختیار کر لی اور  
اپنے دوست ساون سے کیا ہوا وعدہ بھی بھٹلا دیا..... اب علی بخش شدت سے اس دن کا  
منتظر تھا جب اس کا باپ تیسری شادی کر کے اللہ رکھی جیسی نوعمر لڑکی کو اس کی دوسری سوتیلی  
ماں بنا کر لائے اور وہ تماشا دیکھے..... عنقریب گھر میں داماد مست قلندر ہونے والا تھا.....  
علی بخش کے ہوٹل میں بیٹھنے سے اب یہ ہوا تھا کہ اس کا سوتیلہ بھائی محرم علی کم توجہ دینے لگا تھا  
اور یوں دھیرے دھیرے ہوٹل کا سارا نظام حتی کہ روپے پیسوں کا معاملہ بھی علی بخش کے  
ہاتھ میں آچکا تھا جبکہ اس کا باپ دودا خان برائے نام ہی ہوٹل آیا کرتا تھا..... محرم علی اب  
زیادہ وقت دوستوں یاروں کے ساتھ آوارہ گردی کرنے لگا تھا۔

یہ دیکھ کر محرم علی کی ماں خیراں کو تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔ اسے کسی بھی طور پر  
گوارا نہ تھا کہ اس کا سوتیلہ بیٹا علی بخش کمائی کا اڈا سنبھالے..... کیونکہ ہوٹل سنبھالنے  
کا مطلب یہی تھا کہ دونوں ماں بیٹے اب علی بخش کے محتاج ہو جاتے..... لہذا ایک دن  
خیراں نے اپنے نادان بیٹے محرم علی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھ..... میں تجھے گھومنے  
پھرنے سے منع نہیں کرتی پر تو روزگار کے اڈے کو نہ چھوڑ۔ اسے بھی وقت دے..... جتنا علی  
بخش کا ہوٹل میں حصہ ہے اتنا تیرا بھی تو ہے..... ایسا نہ ہو تیرے باپ کے مرنے کے بعد تیرا  
سوتیلہ بھائی اس پر قبضہ کر لے.....“

ماں کی بات پر محرم علی جواباً بولا..... ”اماں میں تو جایا کرتا تھا ہوٹل..... بلکہ سارا  
سنبھالا ہوا ہی تھا..... جب سے علی بخش نے بیٹھنا شروع کیا ہے تو وہ دخل چھوڑتا ہی

نہیں..... ساری کمائی ہوٹل کی اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔“  
”یہی تو اس کی سازش ہے.....“ خیراں تڑپ کر بولی..... ”علی بخش ہم دونوں ماں  
بیٹوں کے لیے سانپ بنا ہوا ہے..... تو وہ بات سوچتا نہیں..... پر مجھے اب اس بات کا  
اندازہ ہونے لگا ہے کہ علی بخش اپنی ماں حضوراں بی بی..... کی موت کا ذمہ دار ہم  
دونوں ماں بیٹوں کو سمجھتا ہے۔ تو نے کبھی اس کی نظروں پر غور نہیں کیا..... کس طرح وہ  
دشمنوں کی طرح ہمیں گھورتا ہے سچ پوچھو بیٹا..... مجھے اب اس سے خوف آنے لگا ہے.....  
تیرے باپ کا کچھ پتہ نہیں کب آنکھیں بند ہو جائیں اور علی بخش انتقام ہمیں نکال باہر  
کرے.....“ خیراں کا لہجہ آخر میں خوف آمیز ہو گیا تھا۔

ماں کی بات پر محرم علی بھی تشویش آمیز الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسے احساس ہونے  
لگا کہ وہ کتنی غفلت برت رہا تھا..... ماں کے بہکانے کا خاطر خواہ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اسی وقت  
اپنے ہوٹل جا پہنچا..... اس وقت ”دخل“ پر علی بخش بیٹھا گاؤں سے پیسے وصول کر رہا  
تھا..... جبکہ دودا خان وہاں موجود نہ تھا۔

”کیسے آئے ہو محرم؟“ علی بخش اسے اچانک وہاں پا کر بولا۔

”کیوں..... کیا میں نہیں آ سکتا..... میرا اس ہوٹل پہ حق نہیں ہے.....؟“ محرم علی  
قدرے ناگواری سے بولا اور دھڑلے کے ساتھ ”دخل“ کے قریب رکھے ایک دوسرے  
اسٹول پر براجمان ہو گیا۔

علی بخش نے بغور اس کے تیوروں کا اندازہ لگایا اور جواباً اس کے لہجے میں بھی تلخی  
کھل گئی..... وہ بولا..... ”اس میں اتنی گرمی دکھانے کی کیا ضرورت ہے میں نے کب کہا  
کہ تمہارا اس ہوٹل پہ حق نہیں.....“

”میں اب روزانہ ہوٹل آکر ”دخل“ سنبھالا کروں گا۔“ محرم علی کا انداز بدستور اکھڑ  
پن کی غمازی کر رہا تھا۔

”اچھی بات ہے..... میرا کام بھی ذرا آسان ہو جائے گا..... مجھے بھی ذرا دوستوں  
یاروں کے ساتھ گھومنے پھرنے کا موقع ملے گا.....“ جواباً علی بخش تحمل سے اس کے چہرے  
کی طرف بغود دیکھتے ہوئے بولا۔

اس کے محتاط ذہن نے اس بات کا اندازہ لگالیا تھا کہ محرم کا ذہن کسی نے خراب کر  
کے بھیجا ہے یہاں..... اور یہ ”کار خیر“ اس کی ماں سے بہتر بھلا کون انجام دے سکتا تھا.....  
اس وقت شام پر تو لے کھڑی تھی..... ہوٹل میں حسب معمول ”کچہری پسندوں“ کا

نے جھکائی دیتے ہوئے خود کو بچانے کی سعی کی لیکن بچاتے بچاتے محرم علی کا زور دار گھونٹ اس کی گردن پر پڑا..... جس نے علی بخش کو بھی ہتھ سے اکھاڑ دیا۔ جب تک دیگر لوگ دونوں بھائیوں کے درمیان میں آتے..... علی بخش کی داہنی ٹانگ حرکت میں آئی اور محرم علی اپنے حلق سے، اوغ“ کی آواز لگاتا ہوا دہرا ہوتا چلا گیا.....

لوگوں نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے دونوں کو سنبھالا..... ادھر مضروب محرم علی کو بھی کچھ لوگ پرے کھینچ کر لے گئے تھے کیونکہ اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا تھا اور ایک پرانی سی لوہے کی کرسی اٹھا کر علی بخش کی جانب بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا..... اس کے حلق سے مغلظات کا طوفان بھی بپا تھا.....

علی بخش کا غصہ ابھی تک سرد نہیں پڑا تھا..... غرض دونوں ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی خواہش دیرینہ میں مبتلا، درمیان میں آئے ہوئے لوگوں کی گرفت سے خود کو چھڑانے کی ناکام کوششیں کر رہے تھے..... اسی اثناء میں اتفاق سے دودا خان وہاں آپہنچا..... اسے شاید وہاں پہنچتے پہنچتے اس ہنگامے کی اطلاع مل چکی تھی..... باپ کو دیکھ کر دونوں بھائیوں کا جوش بھی ماند پڑنے لگا اور بیچ بچاؤ کرانے والے افراد بھی اپنی اپنی جگہوں کی طرف بڑھ گئے..... دودا خان باری باری دونوں کو گھورنے لگا پھر محرم علی کی جانب دیکھتے ہوئے اسے وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا اور چارو ناچار محرم علی علی بخش کو زہر ناک نگاہوں سے گھورتا ہوا ہومل سے نکل گیا۔

☆=====☆=====☆

”رے سوڈھل! مجھے شہر لے چل بڑے ڈاگدر (ڈاکٹر) کے پاس..... مجھ سے اب یہ درد برداشت نہیں ہوتا.....“ عنایتاں چار پائی پر بیٹھی اپنے ستونوں جیسے بھاری بھر کم گھٹنوں کے گرد پرانے ازار بند کتے ہوئے قریباً کراہ کر اپنے شوہر سے بولی۔

”زی تو اللہ رکھی سے اپنے گھٹنوں میں تیل کی مالش کروالیا کر..... ناں.....“ سوڈھل نے گویا جان چھڑانے کی غرض سے جواباً کہا۔

”وہ تو میں اس سے صبح شام کرواتی ہوں پر افاقہ پھر بھی نہیں ہو رہا..... دودے خان نے تجھے تو اب پیسے بھی دے دیئے ہیں..... پھر کیوں نہیں لے کر جاتا مجھے شہر کے ہسپتال.....“

اس کی بات سن کر سوڈھل نے چار پائی پر لیٹے لیٹے پہلو بدلا اور بیزار کن لہجے میں بیوی سے بولا۔ ”اڑی! شہر کے ہسپتال میں کون سا آب حیات رکھا ہے..... وہاں تو پیسے

آنا شروع ہو گیا تھا۔ کافی دیر تو محرم علی چپ بیٹھا رہا..... مگر پھر جانے کیا ہوا..... اس نے ایک دم اپنا ہاتھ بڑھا کر..... ”دخل“ کی دراز سے پیسے اٹھانے کی کوشش کی تو سامنے ہی بیٹھے علی بخش نے فوراً اس کا ہاتھ روکتے ہوئے قدرے درشت لہجے میں کہا۔

”یہ کیا کر رہے ہو محرم..... پیسے چاہئیں تو مجھے بتاؤ۔“ اس کی بات سن کر محرم کی درشت آنکھوں میں طیش کی لہری چمک اٹھی اور وہ اسی لہجے میں علی بخش کو گھورتے ہوئے بولا۔

”تو کون ہوتا ہے مجھے روکنے والا..... ہاتھ پرے ہٹا پنا۔“

مگر علی بخش نے پھر بھی اس کا ہاتھ ”دخل“ پر روکے رکھا اور تیز لہجے میں بولا.....

”میں نے بابا کو حساب دینا ہوتا ہے..... یہ میری ذمہ داری ہے..... انہی پیسوں میں سے مجھے پیش گاروں کو بھی روز کی مزدوری دینی ہوتی ہے.....“

”تو ٹھیک ہے پھر بابا..... آئے گا تو اسے بتا دینا..... مجھے کچھ رقم کی ضرورت تھی میں لے گیا.....“ محرم علی نے یہ کہتے ہوئے پیش قدمی کی مگر اب علی بخش کو اس کی ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی پر طیش آ گیا تھا..... اس نے محرم علی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اسے پیچھے کی طرف دھکیلا اور محرم علی اسٹول سمیت اپنے عقب میں الٹ گیا۔

”آرام سے بات سمجھ میں نہیں آتی ہے تجھے.....“ اس کے گرتے ہی علی بخش دھاڑ کر بولا..... محرم علی نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی اس کا چہرہ خفت اور غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

”تیری یہ جرات..... تو نے مجھے دھکا دیا.....“ وہ غصے سے دانت پیستے ہوئے آگے بڑھا اور علی بخش کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا..... ”اپنی اوقات دیکھی ہے تو نے۔“ محرم علی کا لہجہ حد درجے تصفیک آمیز تھا۔

”ہاتھ ہٹالے میرے گریبان سے محرم علی۔“ علی بخش گرجدار آواز میں اس کی طرف گھورتے ہوئے بولا..... دونوں بھائیوں کو باہم دست و گریبان دیکھ کر ہومل ملازمین اور دیگر افراد بھی ان کی جانب لپکے..... محرم علی نے ہنوز علی بخش کا گریبان نہیں چھوڑا تھا..... ذیل ڈول کے لحاظ سے دونوں ایک ہی قامت کے تھے مگر علی بخش کا قد نسبتاً نکلا ہوا تھا..... اس نے جب دیکھا محرم علی اس کے گریبان سے ہاتھ نہیں ہٹا رہا تو اس نے اپنے ایک ہاتھ سے محرم کے گریبان والے ہاتھ کو مضبوطی سے جکڑ کر عجیب انداز میں اسے مروڑا تو خود ہی محرم علی نے کراہ کر علی بخش کے گریبان پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی..... پھر محرم علی نے اپنے دوسرے ہاتھ سے ایک گھونسا علی بخش کی ناک پر جڑنے کی کوشش کی مگر بروقت علی بخش



ضائع ہی کرنے والی بات ہے..... کل صبح حکیم بدھل سے تیل لادوں گا سو جواب..... تنگ نہ کر مجھے میں ذرا آج پریشان ہوں.....“

شوہر کی بات پر عنایتاں نے برا سامنہ بنا لیا..... تاہم وہ بہ غور اب اپنے شوہر کو تنگ لگی..... وہ آج واقعی کچھ زیادہ ہی گہری سوچ میں غلطاں دکھائی دے رہا تھا..... آخر کو وہ اس کا شوہر تھا لہذا عنایتاں سے رہا نہ گیا اور وہ اپنی تکلیف بھلا کر بولی..... ”سوڈھل تجھے کس بات کی گڑتی ہے آخر..... مجھے بتا..... شاید میں.....“ عنایتاں نے دانستہ اپنا جملہ پورا نہ کیا۔

اس کے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں پر تھے..... شاید وہاں درد کی تیر لہر بھی اٹھی تھی..... ادھر سوڈھل بیوی کی بات پر ذرا چونکا..... چند ثانیے اپنی فکر بھلا کر عنایتاں کو عجیب سی نظروں سے تنگ لگا..... باہر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا..... رات دبے پاؤں سرک رہی تھی..... باہر سردی زوروں پر تھی کیونکہ کسی بھی جانور کے بولنے تک کی آواز نہیں ابھر رہی تھی..... اللہ رکھی دوسری کوٹھری میں محو خواب تھی..... آج وہاں وہ اکیلی سوئی ہوئی تھی کیونکہ اکثر چاچی عنایتاں بھی اسی کوٹھری میں سوئی تھی..... کمرے میں کمزور بلب کی پیلی روشنی میں موٹی سی گرم رلی میں گردن تک ملفوف عنایتاں کے چہرے کو بغور عجیب نظروں سے تنگتے ہوئے اس کے شوہر سوڈھل کو یوں لگا جیسے وہ اپنے اندر کی ادھیڑ بن سے اپنی بیوی کو ضرور آگاہ کرے..... لہذا پھر ذرا اکھکا کر کا صاف کیا، موٹی پرانی مگر گرم رلی کو ابھی طرح اپنے کمزور سے جسم کے گرد لپیٹا اور بولا..... ”وہ عنایتاں!..... تجھے تو پتہ ہے کہ اپنی اللہ رکھی سے دودا خان کے ملاوہ موگو باری کا بیٹا ساون بھی شادی کرنا چاہتا ہے..... بلکہ اس چھوکرے ساون نے تو وڈیرے میر لکھ میر خان کے منشی میرل سے پورے پچاس ہزار دیاج پر لے کر میرے قدموں میں بھی ڈال دیئے تاکہ میں بجائے بڈھے دودا خان کے اللہ رکھی کا رشتہ ساون کو دے دوں اور میں نے ساون سے وعدہ کر کے اس کے پچاس ہزار رکھ لیے ہیں اپنے پاس..... جبکہ دودا خان بھی اسی مد میں چالیس ہزار دے چکا ہے..... پر پتہ نہیں کیوں میرا دل کرتا ہے کہ اپنی اللہ رکھی کا سنگ ان دونوں کو ہی نہ دوں.....“

سوڈھل نے اپنی بات ختم کی تو عنایتاں کی آنکھیں یکدم چمک اٹھیں جیسے سوڈھل نے اس کے دل کی بات کہہ ڈالی ہو..... لہذا وہ فوراً تائیدی لہجے میں بولی..... ”یہی تو میں بھی تجھ سے کہتی تھی..... اب بتا بھلا تو جو اللہ رکھی کو بیاہ دے گا..... تو ہم بڈھوں کی دیکھ بھال کون کرے گا..... میں تو کہتی ہوں..... دونوں کے پیسے واپس کر دے.....“

”اڑی نیک بختاں! یہی تو میں نہیں کرنا چاہتا..... میں چاہتا ہوں پیسے بھی نہ دے“ پڑیں واپس..... اور اللہ رکھی کا سنگ بھی..... اس چھوکرے ساون کے تو میں پچاس ہزار بغیر ڈکار لئے ہضم کر جاؤں گا اور وہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا..... جبکہ مردود دودے خان سے مجھے ذرا ڈر لگتا ہے..... اس کا پیسہ کھانا ذرا میز بھی کھیر ثابت ہوگا.....“

شوہر کی بات پر عنایتاں کے بھاری چہرے پر معنی خیزی مسکراہٹ کھنچ گئی اور وہ بھاری پپوٹوں تلے دھنسی ہوئی آنکھوں کو ذرا سیکٹر کر شوہر کی جانب دیکھتے ہوئے پھو ہڑپن سے بولی..... ”ہونہہ..... اب سمجھی میں..... تجھے کس بات کی گڑتی کھائے جا رہی ہے..... اس کا حل بھی میرے پاس.....“

”کک..... کون سا..... بتا مجھے جلدی..... مجھے پتہ تھا اس کا حل تو ہی نکال سکتی ہے تم عورتیں اس معاملے میں زیادہ سیانی ہوتی ہو..... بتا اچھا.....“ سوڈھل یک دم توصیفی لہجے میں بولا اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔

”سیدھ ساداصل ہے..... دونوں کو آپس میں لڑا دے.....“ عنایتاں نے جیسے اپنے تئیں بڑے نکتے کی بات کہی تھی مگر سوڈھل بیزار کن لہجے میں بولا۔

”یہی تو میں کر رہا ہوں..... لیکن مجھے معلوم ہے اس میں ساون کو ہی شکست اٹھانی پڑے گی..... وہ چھوکرہ اس کی ٹکر کا نہیں ہے..... دودا خان پھر سینہ پھلائے میرے سامنے آجائے گا..... پھر مجبوراً.....“

اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تو عنایتاں نے اسے دوبارہ اپنے گرانقدر مشورے سے نوازا۔

”اس بڈھے دودا خان کو آسے پر لگائے رکھ پھر.....“

”کرنا تو اب یہی پڑے گا..... لیکن میں چاہتا ہوں کوئی ایسا داؤ آزماؤں کہ بذات خود دودا خان اپنے کسی جھیلے میں الجھا رہے..... اور مجھے اسے راستے سے ہٹانے کا موقع مل جائے.....“ سوڈھل اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے بولا..... تو عنایتاں چند ثانیے خاموشی کے بعد دوبارہ جیسے قدرے پرجوش انداز میں بولی۔

”رے سوڈھل..... مجھے یہ بتا کہ..... دودا خان کی اپنی کوئی گھروانی زندہ ہے.....“

”ہاں..... ہے..... پہلی تو مر چکی ہے..... اس کے بطن سے ایک بیٹا علی بخش ہے جبکہ دوسری ابھی زندہ ہے..... اس سے بھی ایک جوان بیٹا محرم علی اور شادی شدہ بہن شمع ہے جو ساتھ کے گوٹھ اللہ داد..... میں بیاہی ہوئی ہے.....“

جماتے ہوئے اسے ذرا اپنے قریب کیا تو اللہ رکھی نے چونک کر اپنی شرکیں پلکیں اٹھا کر ایک لمحے کو ساون کے پُر عزم چہرے کی جانب دیکھا اور پھر اپنی گھنیری پلکوں کی چلمیں گرا دیں۔ تب اسے ساون کی بھاری اور پُر جوش آواز سنائی دی۔ ”اللہ رکھی! اگر تیرے سوڈھل چاچا نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا تو..... قسم مرشد کی..... میں اسے ہرگز زندہ نہیں چھوڑوں گا اور تجھے بھی اٹھا کر کہیں دور لے جاؤں گا۔“ ساون کے بلند آہنگ لہجے کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے جب اللہ رکھی نے چونک کر اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو ساون کا چہرہ جوش اور اٹل ارادے کی فیصلہ کن تمازت سے سرخ ہو رہا تھا اور پھر جانے کیوں بے چاری اللہ رکھی کی سیاہ آنکھوں میں ایک معصوم سا انجانا خوف سمٹ آیا۔

☆=====☆=====☆

اپنے سوتیلے بھائی محرم علی سے جھگڑے پر علی بخش کے لیے اب اپنے ہی گھر میں جگہ تنگ ہونے لگی تھی۔ ایک تو پہلے ہی گھر میں بے چارے کو مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا تھا اور اب اس کی سوتیلی ماں نے کھل کر علی بخش کو وقت بے وقت دھتکارنا شروع کر دیا تھا..... اب وہ علی بخش کے معاملے میں اپنے شوہر دودا خان کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھی..... دودا خان نے آپس میں جھگڑا کرنے پر دونوں بھائیوں کو سخت سرزنش کی تھی اور اب دونوں کے ہوٹل میں بیٹھنے کے الگ الگ اوقات مقرر کر دیئے تھے جس کے مطابق علی بخش صبح سے دوپہر تک اور محرم علی شام سے رات تک ہوٹل میں بیٹھنے لگا تھا، لیکن خیراں کو پھر بھی چین نہیں ملا اس نے اپنے تئیں چالاکی سے یہ اندازہ لگانے کی کوششیں کی کہ اس طرح صبح کے اوقات میں علی بخش کے ”اکیلے“ ہوٹل بیٹھنے سے وہ ہوٹل کی آدھی کمائی کا تنہا ”رکھوالا“ بن رہا تھا اور ”رکھوالے“ سے کیا بعید کہ وہ بہتی لنگا میں اشران کرتا رہے۔ جبکہ اس کا اپنا چیتا بیٹا محرم علی شام کے وقت ہوٹل سنبھالنے سے اس کے تئیں خالی بیگار کائنات کے مترادف تھا کیونکہ اس وقت دودا خان دن بھر گھر آرام کرنے کے بعد شام کو محرم علی کے ساتھ ہوٹل میں موجود ہوتا..... لہذا خیراں کو یہ گوارا نہ تھا کہ اس کا محرم علی ”مالک“ کی بجائے نوکر بن کر باپ کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھے..... پھر ایک دن اپنے سوتیلے بیٹے علی بخش کے خلاف اپنے شوہر کے کان بھرتے ہوئے بولی۔

”سرتاج سائیں! کھلی کمائی کے پیسے سامنے ہوں تو اچھے اچھوں کا ایمان ڈولنے لگتا ہے۔ میں علی بخش کو چور نہیں کہتی..... پر تو صبح کے وقت علی بخش کے ساتھ بھی بیٹھا کر.....“

دودا خان ایک بڑھا خراٹ شخص تھا اسے تو یہ معلوم تھا کہ اس کی بیوی اور بیٹا محرم علی

اس کی بات سن کر عنایتاں چند ٹائیے پُر سوچ انداز میں اپنے سر کو تھپی جہنم دینے لگی..... سوڈھل بدستور اپنی بیوی کا چہرہ نگے جا رہا تھا..... پھر اس نے اچانک عنایتاں کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ ابھرتے دیکھی جیسے اس نے اپنے ذہن میں کوئی پھجڑی پکائی ہو..... ”رے سوڈھل! سن رے میری بات ذرا غور سے۔“ کوٹھڑی کے پُر سکون ماحول میں عنایتاں کی گہری آواز ابھری اور سوڈھل امید بھری چمکتی نظروں کے ساتھ ہمہ تن گوش ہو گیا..... عنایتاں کے ہونٹ سرگوشیاں انداز میں تیزی سے بل رہے تھے اور دعا باز سوڈھل کے لمبوترے خاکستری چہرے پر مکارا نہ تمازت سی پھیلتی جا رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

”ساون! تجھے چاچا سوڈھل کو ابھی اتنی بڑی رقم دینی نہیں چاہیے تھی.....“ اللہ رکھی فکر مندی سے بولی۔ وہ اس وقت ڈرتے ڈرتے ندی کے کنارے پانی بھرنے آئی تھی..... ساون بھی مقررہ وقت پر وہاں پہنچا تھا..... دونوں اب اسریں کے چھتھار اور موٹے ہٹنے کے عقب میں کھڑے محو گفتگو تھے..... شام ابھی اتری نہیں تھی..... دور نارنجی افق کی سمت پرندوں کی ڈاریں تھکی تھکی اڑان کے ساتھ اپنے مسکنوں کی جانب محو پرواز تھیں..... فضا میں خاصی ٹھنڈ گھلی ہوئی تھی جو اس بات کی غماز تھی کہ آج رات کو غضب کا جاڑا پڑے گا..... دونوں پرانی اونانی چادروں میں ملفوف تھے..... اللہ رکھی اب صرف ایک ہی گھڑا بھرنے آئی تھی۔

ساون نے اللہ رکھی کی بات سنی اور جواباً عذر پیش کرتے ہوئے اللہ رکھی سے بولا..... ”شاید تو صحیح کہہ رہی ہے اللہ رکھی..... لیکن یہ بھی ضروری تھا کہ تیرے لالچی چاچا سوڈھل کی جھولی میں یکمشت پچاس ہزار کی رقم پھینک کر اس سے تیرا رشتہ لینے پر فوراً مجبور کر دوں..... کیونکہ مردود دودا خان نے بھی تیرے رشتے کے لیے ابھی تک سوڈھل کو اکٹھی اتنی بڑی رقم نہیں دی ہے اور یوں بعد میں میرا خیال درست ثابت ہوا..... کیونکہ اب تیرے لالچی چاچا سوڈھل نے تیرا مجھ سے بیاہ کرنے کی رضامندی دے دی ہے۔“

ساون نے جیسے اپنے تئیں اللہ رکھی کو خوش خبری سنائی..... لیکن اللہ رکھی کو پھر بھی تسلی نہ ہوئی اور وہ غیر مطمئن لہجے میں بولی۔ ”پتہ نہیں کیوں ساون میرا دل نہیں مان رہا کہ چاچا سوڈھل تجھ سے کیا ہوا وعدہ پورا کرے گا؟“ بالآخر اللہ رکھی نے اپنے خدشے کا برملا اظہار کر ڈالا۔

اس کی بات سن کر ساون نے اللہ رکھی کے شانوں پر اپنے ہاتھ مضبوطی کے ساتھ

سے بولا تو ڈیرے نے قدرے چونک کر نام دہرایا..... ”خانودہ چھر؟“  
 ”ہاؤ سائیں! وہی خانو دھچر جس کا ہمارے پاس بال بال قرضے میں جکڑا  
 ہوا ہے۔“ منشی میرل نے مزید وڈیرے لکھ میر خان کو بتایا۔ ”وہ ابھی ہماری اصل رقم تو کیا  
 سود بھی پورا نہیں دے سکا ہے اور دے بھی نہیں سکتا۔ وہ اب ساری عمر اپنی ادھیڑ عمر بہن  
 فضلاں کے ساتھ ہماری رہا کی کرتا رہے گا..... ساری حیاتی ہماری غلامی میں رہنے والا بھلا  
 کیسے ہماری بات رد کر سکتا ہے۔“

”منشی ذرا کھل کر بتا تو کیا کرنا چاہتا ہے۔“ وڈیرے نے قدرے الجھ کر کہا۔  
 ”سائیں معاف کرنا..... بس آپ کو کام سے غرض ہونی چاہئے میں آپ کا خادم  
 ہوں۔ آپ کیوں اپنے دماغ کو تھکاتے ہو۔ مجھے تھوڑی مہلت دو..... آپ کا ”کام“ ہو  
 جائے گا جلدی۔“ منشی خوشامدانہ لہجے میں بولا اور وڈیرے کا سرد دھیرے دھیرے اثباتی  
 انداز میں ہلنے لگا۔

☆=====☆=====☆

علی بخش اب صحیح معنوں میں ”دھندے“ اور ”روزی“ کی اہمیت کو سمجھا تھا۔ اس نے  
 اپنے آپ کو اب ہونٹل میں مصروف کر لیا تھا..... ادھر اس کی سوتیلی ماں اور بھائی محرم کی چیرہ  
 دستیاب بھی عروج پر تھیں..... مگر علی بخش انہیں خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ جان بوجھ کر اس کے  
 حصے کا کھانا ”گول“ کر دیا جاتا تھا..... اور جو پھل وغیرہ آتے تھے ان کا تو پیہ ہی نہیں چلتا  
 تھا..... غرض علی بخش کو اب اپنے گھر کا صرف پانی پینا ہی ملتا تھا لیکن اسے اس کی بھی چنداں  
 پروا نہ تھی۔ وہ اسی کی کسر ہونٹل سے پوری کر لیا کرتا تھا..... اپنے لیے اپیشل کھانا تیار کروا کر  
 کھاتا حتیٰ کہ تاشہ اور رات کا کھانا بھی اب وہ وہیں کھانے لگا تھا۔ اس نے باورچی کو خرچی  
 پانی دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا..... مگر یہ سب کچھ وہ چوری چھپے نہیں کرتا تھا۔ ایک دن  
 اچانک اس بات کو محسوس کرتے ہوئے دودا خان نے علی بخش سے استفسار کیا۔

”پٹ علی بخش! تو گھر پہ کھانا نہیں کھاتا؟“

اس وقت علی بخش ہونٹل سے دوپہر کو واپسی پر گھر پہنچا تھا اور وہ سب صحن میں بچھی  
 بڑی سی چار پائی پر کھانے مشغول تھے۔ خیراں نے یونہی علی بخش کی طرف دیکھا جب اسے  
 بھی اپنی جانب گھورتے ہوئے پایا تو گڑ بڑا کر اس نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔

”گھر پر میرے لیے روٹی ہی نہیں بچتی اسی لئے میں ہونٹل میں ہی کھا لیا کرتا ہوں۔“  
 علی بخش نے قدرے گھبرائے لہجے میں باپ سے کہا تو دودا خان متحیر ہو کر اپنی بیوی خیراں سے

اس کے بڑے بیٹے علی بخش کے خلاف ہر وقت محاذ باندھے رکھتے تھے۔ پھر بھی وہ لائق بنا  
 خاموش رہا..... شوہر کو خاموش پا کر خیراں اسے اپنی بات کی اثر پذیری سمجھی اور دوبارہ چلتر  
 پنپنے سے بولی۔ ”میں تو کہتی ہوں تو..... علی بخش کو شام میں اپنے ساتھ لگا لے اور محرم کو صبح  
 کے وقت ہونٹل بھیج دیا کر.....“

اس بار دودا خان سے نہ رہا گیا اور وہ فوراً بولا..... ”کیوں..... تیرا محرم اتنا ہی پارسا  
 ہے اس کا ایمان نہیں ڈول سکتا کھلی کمائی کے آگے.....“

شوہر کی بات پر خیراں کو جیسے آگ لگ گئی..... وہ جلتے ہوئے بھنا کر بولی۔  
 ”ہاں..... ہاں میرا لعل تو تمہیں چور نظر آتا ہے..... اور وہ موا علی بخش تو جیسے ایمان کے  
 صافے باندھے رکھتا ہے اپنے سر پہ..... ہونہہ.....“

”اچھا..... اب بند کر اپنی بکواس..... علی بخش اور محرم علی..... دونوں میری اولاد  
 ہیں..... میں انہیں جانتا ہوں کون کتنے پانی میں ہے.....“ دودا خان نے بیوی کو جھڑکتے  
 ہوئے کہا اور خیراں اپنا سامنہ لے کر رہ گئی۔

☆=====☆=====☆

”اڑے بابا منشی میرل.....“

”حاضر سائیں بھوتار.....“

”بابا اس حور پری کا پیہ کیا..... وہ پچاس ہزار روپے والی۔“

”ہاؤ سائیں! اس چھوکری کا نام اللہ رکھی ہے اور وہ اپڑیں سو ڈھل کی بھتیجی  
 ہے.....“ منشی میرل نے وڈیرے میر لکھ میر خان کو اپنی گرافندر معلومات سے نوازتے  
 ہوئے کہا اور وڈیرے کی شکرے جیسی آنکھوں میں ایک ایسی چمک عود کر آئی جیسے اپنے  
 شکار کو ہل جان کر کسی شکاری کی آنکھوں میں اتر آتی ہے۔

”ہالا بابا..... پھر کچھ سوچ منشی میرے بارے میں بھی.....“ وڈیرے نے معنی خیز  
 لہجے میں منشی سے کہا.....

منشی میرل کہنے پن سے مسکراتے ہوئے بولا..... ”ہا سائیں..... میں آپ کا غلام  
 ..... بس سو ڈھل کو لائن پر لگانا پڑے گا.....“

”اڑے بابا تو پھر لگاؤ اس کو لائن پر.....“ وڈیرا جلدی سے بولا..... اس کی غلامی  
 آنکھوں میں ایک ایسی سرخ اتر آئی تھی۔

”ہا سائیں برابر..... اس کے لیے میں نے خانو دھچر کو تیار کیا ہے.....“ منشی مستعدی

دے تو وہ تیسری کرنا بھول جائے گا۔“ علی بخش اس کا نیاں عورت کے مشورے پر انگشت بدنداں رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ماسی نوراًں چلی گئی۔ علی بخش بھی اپنی چار پائی پر آکر بیٹھ گیا۔ اس کے تئیں یہ اچھا نہیں ہوا تھا کہ اس کی سوتیلی ماں کو باپ کی تیسری شادی کرنے کا پتہ چل گیا تھا۔ اب ظاہر ہے وہ پہلے سے ہوشیار ہو جائے گی۔ بہر طور علی بخش کو آئندہ کے دیگرگوں حالات کا ادراک ہونے سے ایک عجیب سی بے چینی نے آلیا تھا۔

☆=====☆=====☆

جاڑوں کی چمکیلی دھوپ کچے مکانوں کی منڈیروں پر سرک آئی تھی۔ کچے صحن میں کھری چار پائی پر سوڈھل اور اس کی بیوی عنایتاں بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ ایک جانب اللہ رکھی پڑوس کی کتر مشین سے چارہ بنا کر کھری میں انڈیل رہی تھی جہاں دونوں بیل سانولا اور ہیرا بڑی رغبت سے منہ مار رہے تھے۔ اللہ رکھی اپنے کام میں منہمک تھی۔ عنایتاں اپنے گھٹنے چوڑے کئے تذبذب کے عالم میں اللہ رکھی کو کام کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ سوڈھل کے چہرے پر بھی عجیب سا اضطراب پھیلا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دونوں خزانہ میاں بیوی نے آپس میں کسی اہم موضوع پر گفت و شنید کرنی تھی مگر اللہ رکھی کی موجودگی کی وجہ سے بات کرنے سے کترارہے تھے۔ بالآخر عنایتاں نے اللہ رکھی کو سردست وہاں سے ”ٹالنے“ کی غرض سے مخاطب کرتے ہوئے پکارا۔ ”اللہ رکھی!.....!“

”چاچی!.....!“ اللہ رکھی نے جوابا کہا۔

”جاڑا مائی فضلاں سے تھوڑا تلوں کا تیل لے آ۔ اپنے گھٹنے کی مالش کر لوں ذرا!.....“ عنایتاں نے کہا اور اللہ رکھی۔ ”جی اچھا چاچی۔“ کہتی ہوئی چلی گئی۔

عنایتاں جھونٹے ہی پُرسرت لہجے میں اپنے شوہر سوڈھل سے بولی۔ ”سوڈھل! ماسی نوراًں نے اپنا کام کر دیا ہے وہ کل ہی دودا خان کے گھر گئی تھی اور اس کی بیوی خیراں کو اس کے شوہر کی تیسری شادی کے بارے میں بتا آئی ہے۔ اب دیکھنا دودا خان اللہ رکھی کی شادی کے سلسلے میں دباؤ نہیں ڈالے گا اور ظاہر ہے پھر تجھ سے اپنے روپوں کی واپسی کا بھی تقاضا نہیں کرے گا۔“

سوڈھل نے اپنی بیوی کی بات بڑے غور سے سنی اور قدرے غیر مطمئن لہجے میں بولا۔ ”عنایتاں! بات تو تیری درست ہے۔ پر اس سے کیا دودا خان اللہ رکھی سے شادی سے باز آجائے گا!.....؟“

اس کی بات پر عنایتاں چالاکی سے مسکرا کر شوہر سے مخاطب ہوئی۔ ”یہ بات تیری

مستفسر ہوا۔

”خیراں! تو علی بخش کے لیے روٹی نہیں رکھتی؟ ہوٹل کا کھانا تو بے چارے کا پیٹ خراب کر دے گا۔“

خیراں شوہر کی بات سن کر ایک لمحے کو گڑبڑا سی گئی مگر پھر سامنے کھڑے علی بخش کو گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے بعد شوہر سے مخاطب ہوئی۔ ”اب ایسی بات بھی نہیں کہ میں اس کے لیے روٹی نہیں رکھتی۔ خود ہی اسے ہوٹل کا چٹ پنا کھانا اچھا لگتا ہو تو میں کیا کروں۔“

علی بخش کے چہرے پر پھینکی سی مسکراہٹ عود کر آئی اور وہ خاموشی سے اندر اپنی کوٹھڑی میں چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس سے بحث فضول ہے۔ خود اس کا باپ دودا خان بھی کم ہی الجھتا تھا۔

علی بخش اپنے کمرے میں آکر چار پائی پر دراز ہو گیا۔ وہ اب شام تک فارغ تھا۔ ذرا آرام کرنا چاہتا تھا جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کی سماعت سے کسی عورت کے معنی خیز انداز میں بولنے کی آواز نکل کر آئی۔ بات تو سمجھ میں نہیں آرہی تھی البتہ آواز کے آہنگ سے علی بخش نے اندازہ لگایا کہ خاص باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ اسائی ہوئی طبیعت کے ساتھ اٹھا اور باہر نکلنے کی بجائے اندر ہی دروازے پر جھری سے آنکھ لگا کر صحن کی جانب دیکھا تو اسے وہاں چار پائی پر کوئی پڑوس نظر آئی۔ وہ خاصی ادھیڑ عمر اور تیز قسم کی لگ رہی تھی جو بار بار اپنا سر ہلا کر ہاتھ نچا کر اس کی سوتیلی ماں خیراں سے محو گفتگو تھی۔ علی بخش نے سننے کی کوشش کی تو اسے اس عورت کی آواز ذرا واضح انداز میں سنائی دی نیلگی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں خیراں!.....! خود یہ بات مجھے تیری ہونے والی سوتن اللہ رکھی کی چاچی عنایتاں سے پتہ لگی ہے کہ تیرا مرد دودا خان تیسری عورت کر رہا ہے۔ اسی اللہ رکھی سے جس کا پیویرقان سے مر گیا تھا۔“

جواب میں علی بخش کو اپنی سوتیلی ماں کی تشویش بھری آواز سنائی دی۔ ”ڑی ماسی نوراًں!.....! سچ بتا۔ تو صحیح کہہ رہی ہے۔“

”اڑی!.....! جھوٹے پُرسرشد کی لعنت ہووے۔“ علی بخش کو نوراًں نامی عورت کی آواز سنائی دی۔ ”اچھا تجھے میری بات پر یقین نہیں آتا تو..... تو اپنے مرد سے پوچھ کے دیکھ لے، مجھے یقین ہے وہ یہ بات نہیں چھپائے گا۔ پر میرا تجھے یہی مشہورہ ہے کہ بجائے اپنے مرد سے جھگڑنے کے انجان بنی رہے اور اسے گھریلو مسائل میں زیادہ سے زیادہ الجھا

☆=====☆

سوڈھل گوگوساؤڈیرے کی اوطاق میں پہنچا تو وہاں ایک بڑے سے ہال کمرے میں فرش پر کچھ ہاری بیٹھے سامنے موٹہ ہے پر براجمان رجسٹر اور قلم تھا۔ منشی میرل کو کوئی حساب کتاب لکھوانے میں مصروف تھے۔ سوڈھل نے باواز بلند منشی کو اپنی آمد کی خبر دیتے ہوئے اسے سلام کیا۔ ”سائیں منشی صاحب! خادم حاضر ہے۔“ منشی میرل نے اپنی ناک کی پھنگ پر انگلی ہوئی شفاف عدسوں کی عینک کے عقب سے گدھ جیسی آنکھوں کو قدرے اچکا کر سوڈھل کی طرف دیکھا اور اسے خفیف سے اشارے سے قریب رکھی رلی بچھی چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔ سوڈھل چہرے پر بلجابت کے ڈونڈے برساتا ہوا خاموشی کے ساتھ چارپائی کی جانب بڑھ گیا۔

کچھ دیر بعد منشی میرل ہاریوں کو فارغ کر کے سوڈھل کی جانب متوجہ ہوا۔ ”ہا بابا سوڈھل! کیسا ہے تو بال بچہ تو ٹھیک ہے نابا بابا تیرا.....“

”ہاں سائیں! دھڑیں سائیں کا کرم ہے۔ اس نے بچے سے تواب تک محروم رکھا ہے..... پھر بھی مجھے یقین ہے کہ آپ کی دعا سے سب ٹھیک ہی ہو گا۔“ سوڈھل نے خوشامدی لہجے میں کہا۔

منشی میرل نے جو ڈیرے لکھ میرخان کا مصاحب خاص بھی تھا ایک ہنکاری بھرتے ہوئے اپنے چہرے سے عینک اتاری۔ قلم کان پر اٹکایا، رجسٹر بند کر کے کھڑا ہوا اور اسے خالی موٹہ منشی پر پھینکتے ہوئے چھوٹے قدم اٹھاتا..... سوڈھل کی چارپائی کی طرف آیا۔ سوڈھل بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا..... تاہم منشی میرل نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دوبارہ اپنے ساتھ قریب ہی میں بٹھالیا اور قدرے کھکارتے ہوئے تاسف آمیز لہجے میں بولا۔ ”سوڈھل! تیری بھی کیا زندگی ہے..... نہ بال نہ بچہ..... بیوی بھی لاش کی طرح ہے۔ میری بات کا برا تو نہیں منایا تو نے۔“ منشی میرل نے مکاری سے کہا تو سوڈھل منشی میرل کی بات کی گہرائی میں کھو گیا۔ سوڈھل اپنی ادھوری گھریلو زندگی پر اداس سا ہو گیا۔ منشی اس کے چہرے پر آرزوگی کی لکیریں دیکھتے ہوئے دوبارہ بولا۔ ”اڑے سوڈھل! تو تو ایسے ہی دکھی ہو رہا ہے..... مرد اور گھوڑا بھلا کبھی بڑھے ہوئے ہیں..... تو میری مان تو دوسری شادی کر لے۔ تیرے نام سے زیادہ تو تیری عورت کی بیماری پورے گوتھ میں مشہور ہو چکی ہے۔ سچ پوچھ تو کچھ لوگ تیری عورت کی اس بیماری کو مرشد کی لنت بھی کہتے ہیں۔“ منشی میرل نے بڑی فنکاری کے ساتھ سوڈھل جیسے کائیاں شخص کو ناراض کئے بغیر اس قدر غم آمیز جذباتی بنا

سمجھ میں کیوں نہیں آتی سوڈھل کہ دودا خان نے اپنی تیسری شادی کے بارے میں دانستہ اپنی بیوی کو بے خبر رکھا تھا..... تاکہ اس کی بیوی خیراں اس کے ”کام“ میں رکاوٹ اور گھر میں جھگڑا نہ کھڑا کر دے۔“

”یہ بھلا کیا بات ہوئی..... جب دودا خان اللہ رکھی سے شادی کر لیتا تو بھلا اس کی بیوی کو نہیں پتہ چلتا۔“ سوڈھل نے جواز پیش کیا۔

”عین وقت پر پتہ چلنے کی اور بات ہوتی ہے ڈے سوڈھل.....! عورت مجبور ہوتی ہے وہ رو دھو کر خاموش ہو جاتی ہے..... پر ثواب دیکھنا مجھے یقین ہے خیراں اپنے مرد دودا خان سے جھگڑا تو نہ کرے گی بلکہ اسے اس بات کی بھی بھنگ کانوں میں نہیں پڑنے دے گی کہ اسے اس کی رام کہانی کا علم ہو چکا ہے..... وہ اندر ہی اندر دودا خان کو بڑی چالاکی سے گھریلو مسائل وغیرہ میں الجھا دے گی۔ میں نے اپنی طرف سے ماسی نوراں کو خوب سکھا پڑھا کر بھیجا تھا کہ اس نے کیا کہنا ہے۔ اب تو بے فکر رہ اور اس کے دیئے ہوئے پیسوں پر عیش کر، اور مجھے بھی جلد شہر لے جانے کا بندوبست کر، میری طبیعت دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی ہے۔“

عنایتاں کی صراحت بھری گفتگو پر سوڈھل دم بخود رہ گیا۔ وہ خود کو بڑا چالاک سمجھتا تھا پر آج اپنی بیوی کے تریا چلتر کا بھی دل سے قائل ہو گیا تاہم اسے اپنی بیوی کی شہر ہسپتال لے جانے والی بات قدرے ناگوار گزری تھی اور پھر اس سے پہلے کہ وہ جواباً اپنی بیوی عنایتاں سے کچھ کہتا، اچانک کسی نے دروازے پر دستک دینے کے ساتھ ہی اسے پکارا۔ ”سوڈھل چا چا.....! تجھے منشی میرل نے بلایا ہے وڈیرے کی اوطاق میں..... یاد کر لے، میں چلا.....“

اس شناسا آواز پر سوڈھل قدرے چونک گیا۔ یہ لائق ہاری تھا..... لیکن سوڈھل اس پیغام پر تذبذب میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اسے یوں اچانک منشی میرل نے کیوں بلایا ہے۔ بہر طور پر جانا تو پڑے گا۔ اس نے سوچا اور پھر اوطاق جانے کے لیے چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا تو اس کی بیوی عنایتاں یکدم قدرے منت کرنے والے انداز میں شوہر سے بولی۔ ”ڈے سوڈھل! کچھ میرے بارے میں بھی سوچ لے اب..... قسم دھڑیں سائیں کی..... مجھ سے اب درد بالکل نہیں برداشت ہوتا۔“

”ہاؤ..... ہاؤ..... مانٹھ کر ذرا لے جاؤں گا تجھے شہر کبھی..... ابھی تو مجھے جانے دے۔“ سوڈھل نے بیوی کی بات پر قدرے چڑچڑاہٹ سے کہا اور باہر گیا نکل۔

سوڈھل گوگو کے عالم میں اپنا سر ہلانے لگا۔

☆=====☆

ایک دن سہ پہر کو دودا خان، محرم علی کو ہوٹل چھوڑ کر ذرا جلدی ہی گھر پہنچا تو ٹھٹھک سا گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اپنے سامنے صحن میں پچھی چار پائی پر اپنی بیوی خیراں کو پیٹ پکڑے مارے درد کے کراہتے ہوئے پایا تو پُر تشویش انداز میں وہ بے اختیار اس کی جانب بڑھا۔ ”ڑی خیراں! کیا ہو گیا تجھے.....!“

”ہائے دودا خان! میرا آخری وقت آ گیا ہے..... ڈیرہ جونگل سے میرے ماں پپو اور بھراواں کو بلا لے..... آمیں..... مری.....“ خیراں درد کی شدت سے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے بولی۔ تکلیف کی شدت سے اس نے اپنے دانت بھیج لئے اور عجیب سے انداز میں کراہنے لگی۔

اس کی حالت پر دودا خان خاصا فکر مند ہو گیا وہ اسے سنبھالنے کی ناکام سعی کرتے ہوئے استفسار طلب لہجے میں بولا۔ ”خیراں..... کچھ تو بول کیا ہوا ہے تجھے..... کیا پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔“ مگر جواباً اب خیراں آنکھیں موندے نیم مردنی کی حالت میں اپنا سارا بدن ڈھیلا چھوڑے اکھڑی اکھڑی سانس لینے لگی اب دودا خان کی تشویش عروج پر پہنچ چکی تھی..... خیراں بہر حال اس کی بیوی تھی..... اس نے علی بخش کو آواز دی مگر وہ گھر پر ہوتا تو نکلتا..... جب علی بخش کو مکان کی کسی کوٹھڑی سے برآمد ہوتے نہیں دیکھا تو دودا خان نے آؤ دیکھا تاؤ مرغ بکل کی طرح لوٹ پوٹ ہوتی اپنی بیوی خیراں کو کاندھے پر اٹھا کر لادا اور سیدھا حکیم بڈھل کے مطب کی جانب دوڑا۔

دودا خان کو اپنی بیوی کو کاندھے پر لادے، گوٹھ کی کچی میزھی میزھی گلیوں میں دوڑتا دیکھ کر چند لوگ بھی ازراہ ہمدردی۔ ”اللہ خیر کرے..... دھڑیں رحم کرے۔“ کہتے ہوئے اس کے ساتھ ہوئے۔

بالآخر دودا خان نے حکیم بڈھل کے مطب میں ہی جا کر دم لیا۔ اتفاق سے حکیم بڈھل وہاں تقریباً فارغ ہی موجود تھا۔

خیراں کو ایک سپاٹ سے تحت پوش پر لٹا دیا۔ حکیم بڈھل بغور کراہتی مہٹی خیراں کو دیکھتا رہا پھر اس کی نبض ٹٹولنے کے بعد دودا خان سے مختصر اُکچھ پوچھا۔

حکیم بڈھل ایک منحنی سا شخص تھا۔ اس نے فوری طور پر خیراں کو ایک سیال نما دوا پلائی۔ پھر چند لمحوں تک اس کا معائنہ کر کے ذرا فارغ ہوا تو دودا خان نے تشویش بھر لے

دیا کہ اس کی آنکھیں یکدم بھیگ گئیں۔ ”اڑے بس کر..... روتا کیا ہے..... عورتوں کی طرح.....“ منشی نے دوستانہ تکلف سے اسے ڈانٹا۔ ”تجھے بلانے کا مقصد میرا ہرگز یہ نہیں کہ تجھے دکھی کروں۔ پتہ ہے کیا..... تو نے ہماری بہت خدمت کی ہے..... اور اب بھی کر رہا ہے..... بالکل تیری طرح ہمارا ایک رہاک (کھیت مزدور) ہے۔ اچھا نام ہے اس کا..... ہاں یاد آیا..... خانو دھچر..... بے چارہ آج کل اپنی بہن فضلاں کے بارے میں بڑا پریشان ہے۔ بہت محبت کرتا ہے اپنی بہن ہے..... بے چاری کو جوانی میں ہی بیوگی کا داغ لگ گیا تھا بچہ کوئی ہے نہیں..... خود بھی اس نے ابھی تک شادی نہیں کی..... کہتا ہے سنگ کے بدلے سنگ دوں گا۔ بس یونہی میرا خیال تیری طرف چلا گیا۔ ویسے تو ہاں کرے تو بات کر دوں تیری خانو دھچر سے، اس کی بہن فضلاں کے بارے میں..... تیری بھی تو سنا ہے ایک بھتیجی ہے اللہ رکھی۔“ منشی کہتا چلا گیا اور سوڈھل کسی اور ہی دنیا میں جا پہنچا۔

سوڈھل کو منشی میرل کی باتیں دل پر لگ رہی تھیں کیونکہ وہ اس کے درون خانہ پلنے والی اس سوچ سے میل کھا رہی تھیں کہ اسے بہر حال سہارے کی ضرورت تھی..... لہذا بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

”منشی صاحب! تمہاری باتیں تو درست ہیں لیکن.....“ چالاک میرل لوہے کو گرم ہوتا دیکھ کر اس کی بات کاٹتے ہوئے یکدم بولا۔

”سوڈھل تو راضی ہے تو اس ”لیکن“ کو میرے واسطے چھوڑ دے..... ویسے کوئی مسئلہ ہے تو بتا۔“

”ہاں سائیں مسئلہ تو یہ ہے کہ دودا خان.....“ پھر سوڈھل نے اسے ساری حقیقت بتا دی کہ وہ دودا خان سے اللہ رکھی کی بات طے کر چکا ہے..... لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس نے دودا خان کا بندوبست بھی کر لیا۔

”اڑے بابا..... تو اس کی گڑتی کیوں کرتا ہے۔“ منشی اسے تسلی دیتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ”وڈیرا سائیں بڑا اچھا آدمی ہے..... اپنے رہاکوں کی بڑی مدد کرتا ہے..... تجھے اس کا آشیر واد بھی مل جائے گا..... نہ کر کسی بات کی پروا تو..... اچھا بول پھر کب ملوؤں تجھے خانو دھچر سے.....“

سوڈھل اس کی بات پر قدرے چونکا پھر بولا۔ ”سائیں جب چاہے ملوادو۔“

”اچھا ٹھیک ہے..... تو ایسا کر کل اسی وقت آنا..... میں خود تجھے لے کر چلوں گا اس کے گھر..... آخر کو اہم بات کرنی ہے اوطاق میں تو نہیں ہو سکتی نا.....“ منشی نے کہا اور

معمول بن گیا تھا کہ جب دودا خان گھر پر موجود ہوتا یا گھر آنے والا ہوتا تو خیراں اچانک اپنے طوفانی قسم کے پیٹ درد کی تکلیف میں مبتلا ہوا کر اٹھنے لگتی اور بے چارہ دودا خان جیسے تیسے اسے لے کر حکیم بذہل کے مطب جا پہنچتا..... آخر ایک دن تنگ آ کر حکیم بذہل نے دودا خان سے خیراں کو شہر کے ہسپتال لے جانے کی ہدایت کی..... ”دودا خان..... شہر کے ہسپتال میں بڑی سہولیات ہیں..... یہ مجھے کوئی پیچیدہ مرض ہی لگتا ہے..... وہاں اس کا الزما ساؤنڈ ہوگا..... تب ہی اصل بیماری کا پتہ چل سکتا ہے.....“

حکیم بذہل گوٹھ کا پرانا اور تجربہ کار معالج سمجھا جاتا تھا..... اس کی بات حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دودا خان اس کی بات پر قدرے متفکر سا نظر آنے لگا.....

”میں شہر نہیں جاؤں گی..... وہاں سے تو لاش ہی واپس آتی ہے گوٹھ.....“ خیراں نے ایک دن اپنے شوہر دودا خان سے فیصلہ کن لہجے میں کہا..... وہ اس وقت خاصی ”تندرست“ نظر آرہی تھی..... اور یہی بات دودا خان کو بھی اچھنبھے میں مبتلا کر دیتی تھی کہ اچھی بھلی کام کاج میں مصروف خیراں کو یہ کس قسم کا درد اٹھتا تھا کہ وہ بے حال سی ہو جاتی تھی۔ اسے بھلا کیا پتہ تھا کہ خیراں اس کے ساتھ چلتے بازی کر رہی ہے..... بہر طور..... پھر بھی دودا خان نے اسے شہر کے بڑے ہسپتال چلنے کو کہا تو وہ نہ مانی جواباً دودا خان نے دوبارہ کہا۔ ”دیکھ خیراں تیری بات غلط ہے کہ وہاں سے لاش ہی آتی ہے..... زیادہ تر لوگ شفا پا کر ہی آتے ہیں شہر کے بڑے ہسپتال سے.....“ مگر خیراں پھر بھی نہ مانی تو دودا خان بھی چپ ہو رہا۔

☆=====☆=====☆

اگلے دن سوڈھل خلاف معمول علی الصباح جاگ گیا تازہ پانی کے چھینے چہرے پر مارے اور بوسیدہ سی پرانی اوٹی چادر ڈھانپنے سردی سے ٹھہرتا ہوا بابا ہر نکل گیا۔

فضاء دینز کبر کے زیر اثر بالکل دھندلی ہو رہی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا لوناٹی کی دکان پر پہنچا..... بال ترشوائے..... شیو بنوائی اور گھر لوٹ آیا گھر آتے ہی اس نے اللہ رکھی کو نیند سے جگایا اور چولہے پر نہانے کے لیے پانی گرم کرنے کو کہا اور ٹھہرتا ہوا اپنی کوشٹری میں آگیا..... بے چاری اللہ رکھی پریشان سی ہو گئی کہ آج یہ اس کے چاچا سوڈھل کو کیا ہو گیا ہے جو صبح صبح پر اسرار قسم کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ بہر طور حکم حاکم مرگ مفاجات کے تحت اللہ رکھی آنکھیں مسلتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی..... اُپلوں کی کھلی اور بھڑکتی ہوئی آگ پر پانی سے بھرا ہوا کنستری جلد ہی دھواں چھوڑنے لگا تو سوڈھل نے نہانا شروع کر

لہجے میں پوچھا۔ ”حکیم صاحب کیا ہوا اسے..... یہ چاک (ٹھیک) تو ہو جائے گی نا۔“ حکیم بذہل جو با تشفی آمیز لہجے میں بولا۔ ”پیٹ میں ایک دم گیس کی گانٹھ بن گئی تھی شاید..... دوا اور کچھ پڑیاں دے رہا ہوں..... پورا ہفتہ اسے مطب لا کر دکھانا ہوگا۔ کیونکہ بعض دفعہ گیس کی یہ گانٹھ جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی ہے۔“

”اچھا حکیم صاحب میں برابر اسے پورے سات دن مطب میں لا کر آپ سے دوائی دار و لیتا رہوں گا۔ ویسے کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے ناں.....“

”نہیں ابھی ایسی کوئی بات نہیں۔“

”حکیم صاحب کوئی پرہیز وغیرہ.....“ آخر میں دودا خان نے پوچھا..... خیراں کی حالت اب کافی سنبھلنے لگی تھی..... حکیم کی دوائی نے بڑی سرعت کے ساتھ اپنی اثر پذیری دکھائی تھی۔

حکیم اسے پرہیز وغیرہ کے بارے میں بتاتے ہوئے بولا..... ”بابا..... اسے چاول..... ماش کی دال، آلو اور جھنڈیاں مت دینا کھانے کو اور نہ بارمنہ اگر ہو سکے تو مرلیضہ کو دو تین گلاس یا جتنا پی سکے..... رات بھر رکھے گھرے کا پانی پلاتے رہو اور میری دوائیاں بھی باقاعدگی سے دیتے رہو.....“

”وڈی مہربانی حکیم صاحب..... سائیں کو کتنا ہدیہ دوں.....“ دودا خان نے اپنی جیب سے پیسے نکالتے ہوئے بڑے احترام سے پوچھا۔

”بس اللہ سائیں شفا دے..... یہی میرا ہدیہ ہے۔“ حکیم بذہل نے آہستگی سے کہا مگر دودا خان نے ایک بڑا نوٹ قریب ہی خاصے چوڑے مونڈھے پر پیچھے گدی کے نیچے پھنسا دیا..... اور پھر بیوی کو واپس گھر لے جانے کے لئے ٹیل گاڑی ڈھونڈنے مطلب سے باہر آگیا.....

☆=====☆=====☆

حکیم بذہل کے مطب میں کڑوی کیسی سی دوا پینے کے بعد خیراں میں اب اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ مطب سے ساتھ لائی ہوئی دوائی زہر مار کر پی اس لئے کہ اسے کوئی بیماری تھی ہی نہیں..... اس نے تو اپنے شوہر دودا خان کو پریشان کرنے کی مہم کا آغاز کیا تھا جو اسے نوراں سمجھا کر گئی تھی..... اب خیراں نے بڑی شدت کے ساتھ اپنی فکری کے جوہر دوسرے تیسرے دن دکھانے شروع کر دیئے تھے..... وہ اچانک اکثر بیماری کے بہانے کبھی دودا خان تو کبھی اپنے بیٹے محرم علی کے ساتھ باقاعدگی سے مطب جانے لگی..... اب

دیا۔ نہادھو کر اور نئے کپڑے بدل کر..... جب وہ بالکل تیار ہو گیا تو اسی وقت اللہ رکھی اس کے لیے چائے اور پاپے لے آئی تو دنگ رہ گئی..... سوڈھل چا چا کی تو نور ہی بدلی ہوئی تھی۔ کتنی کے دانتوں میں خواب مسواک رگڑی ہوئی تھی۔ کچھڑی سے بالوں کو تیل لگا کر اٹا کنگھا پھیرا ہوا تھا..... اور تو اور آنکھوں میں سرے کی لکیر اس پر سوتھی۔ سوڈھل کی جانب دیکھتے ہوئے اللہ رکھی کی آنکھوں میں حیرت سی سمت آئی تھی تاہم وہ جلدی سے چائے وغیرہ اس کے سامنے رکھ کر چلی گئی۔

ہلکے پھلکے ناشتے سے فارغ ہو کر سوڈھل باہر نکل آیا..... دور مشرق کی سمت پو پھٹ رہی تھی..... چہار سو کھرا پھیلا ہوا تھا..... وہ خراماں خراماں چلتا ہوا اوطاق جا پہنچا..... منشی میرل سے ملنا ہے مجھے.....“ وہاں ایک کھری چار پائی پر بے سدھ سوئے ایک کمدار کو ہلاتے ہوئے پوچھا..... جو محض ”اوں..... آں.....“ کر کے دوبارہ خراٹے لینے لگا..... اسے سوتا دیکھ کر سوڈھل کو بھی جانے کیوں جھانپاں سی آنے لگیں۔ قریب ہی ایک اور آدمی کھری چار پائی پر موٹا سا بوسیدہ لحاف پڑا ہوا تھا..... سوڈھل نے سوچا..... منشی آئے گا تو آخر کار اسی اوطاق میں؟ کیوں نہ ادھر ہی تھوڑا آرام کر لینا چاہئے۔ یوں وقت بھی کٹ جائے گا..... بس پھر کیا تھا یہ سوچ کر سوڈھل جب کھری چار پائی پر لحاف اوپر لئے لیٹا تو اس کا یہ ”تھوڑا آرام“ گھنٹوں پر محیط ہو گیا..... آنکھ کھلی تو کوئی اسے جھجھوڑ کر اٹھا رہا تھا..... یہ اوطاق کا کمدار ہا کو موالی تھا۔ ”اٹھو بابا..... دن چڑھ آیا ہے۔“ اس نے کہا اور سوڈھل یک دم آنکھیں مسلتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

تھوڑی دیر بعد منشی میرل بھی آ گیا..... کچھ باری ہاتھ باندھے اس کے عقب میں تھے..... انہیں بھگتانی کے بعد میرل اور سوڈھل اوطاق سے نکلے۔ باہر سفید رنگ کی پوٹو باری جیب موجود تھی۔ اس میں سوار ہو کر یہ لوگ ایک جانب چل پڑے مختصر سے دورانے کے سفر کے بعد جیب ایک کچے مگر قدرے کشادہ مکان کے سامنے رک گئی..... وہاں ایک سانولی رنگت کی عورت ایلے تھا پ رہی تھی..... وہ پینتیس چالیس کے پیٹے میں تھی اور مذکورہ گھر کی مکین ہی معلوم ہو رہی تھی کیونکہ جیب کورکتے دیکھتے ہی وہ تیزی کے ساتھ اندر چلی گئی۔ منشی میرل شاید اس کو پہچانتا تھا اس لیے چند ٹائے کھڑا رہا۔

اگلے ہی لمحے اس عورت کی اطلاع پر ایک ٹھگنے سے قد کا کالا بھنگ شخص نمودار ہوا..... اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے ابھی وہ منشی میرل کے قدموں پر اپنی ناک رگڑنی شروع کر دے گا۔ اس کی عمر چالیس سے متجاوز ہی تھی..... وہ ”سائیں بھلیکار.....“

بھلیکار، کہتا ہوا منشی میرل اور سوڈھل سے مصافحہ کرنے کے بعد ہاتھ جوڑ کھڑا ہو گیا۔ ”اڑے خانو دھچر! بھلا کھبے کی طرح کیا کھڑا ہو گیا ہے تو اندر نہیں لے کر چلے گا کیا.....؟“ میرل نے جھٹکے دار لہجے میں کہا اور خانو دھچر نامی شخص ایک بار پھر فرش راہ ہو گیا اور بولا۔

”کیوں نہیں سائیں مٹھا! سر آنکھوں پر آؤ آپ نے تو میرے غریب خانے کو رونق بخشی ہے..... آؤ..... آؤ سائیں۔“

پھر وہ دونوں خانو دھچر کے ہمراہ اس کے گھر کی چوکھٹ پار کرتے ہوئے اندر آ گئے..... اور کچے محن میں ہی رلی بچھی چار پائیوں پر براجمان ہو گئے۔ ایک جانب پھونس کے چہرے تلے بھینس جگالی میں مصروف تھیں..... اندرونی دیواروں پر بھی ایلے تھے ہوئے تھے اور ایک عجیب ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ منشی نے بمشکل اپنے چہرے کے ناگوار تاثرات چھپا رکھے تھے..... وہ بہت برداشت کر رہا تھا..... یہی وجہ تھی وہ بوتل کے جن کی طرح کھڑے خانو دھچر سے چھوٹے ہی بولا..... ”اڑے بابا خانو..... کسی شے کی لوڑ نہ کرنا ہم ذرا جلدی میں ہیں..... بابا..... یہ سوڈھل ہے جس کی میں نے تجھ سے بات کی تھی..... اور سوڈھل یہ خانو دھچر ہے..... بہت اچھا انسان ہے..... اب ایسا ہے کہ تم دونوں ادھر ہی بیٹھ کر جو باتیں کرنی ہیں کر لو..... میں چلتا ہوں..... مجھے پھر بعد میں اوطاق میں آ کر باری باری اپنی مرضی کے بارے میں بتا دینا..... اور کسی بات کی گڑنی نہ کرنا.....“ یہ کہتے ہوئے منشی اٹھ کھڑا ہوا اور خانو دھچر اسے روکتا ہی رہ گیا مگر وہ مصروفیت کا عذر پیش کرتے ہوئے چلا گیا۔

”اور سنا بھاسوڈھل کیسے ہو..... مجھے لگتا ہے میں نے تجھے دیکھا ہے۔“ بالآخر خانو نے گفتگو کی ابتداء کرتے ہوئے کہا اور پھر وہیں بیٹھے بیٹھے باواز بلند بولا..... ”ڑی فضلا..... چاں پاڑیں (چائے وغیرہ) لے آدھر ہی..... ہاں بھاسوڈھل اور سنا.....“ سوڈھل نے اس کی بات پر پہلے ذرا ترچھی نظروں سے رسوئی کی جانب دیکھا پھر بولا..... ”بھاسوڈھل..... ظاہر ہے ایک ہی گوتھ کے ہم رہنے والے ہیں..... دیکھے بھالے میں بھلے کبھی ہم آپس میں ملے نہ ہوں پر جانتے تو ہیں نا کچھ نہ کچھ ایک دوسرے کو..... ویسے مولاسائیں کا کرم ہے..... زندگی مزی گزر رہی ہے.....“

سوڈھل کی بات پر خانو دھچر اثبات میں سر ہلانے لگا اور بولا..... ”ویسے اپڑاں دڑیرا سائیں بڑا اچھا آدمی ہے..... اپنے رہا کوں کا بڑا خیال رکھتا ہے کوئی بھی مسئلہ ہو فوراً



حل کرنے کی کوشش کرتا ہے.....“

اس کی بات سن کر سوڈھل بھی گفتگو کو آگے بڑھانے کی غرض سے اس کی تائید میں بولا..... ”ہاؤ خانو..... تیری بات درست ہے..... ویسے نشی سائیں بھی اچھا ہے..... میں نے اسے اپنی پریشانی کیا بتائی کہ فوراً بے چارہ فکر مند ہو گیا اور.....“ اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی..... کیونکہ اگلے ہی لمحے فضلاں چائے وغیرہ کے برتن اٹھائے وہاں آگئی اور چارپائی پر رکھ کر سر جھکائے واپس چلی گئی..... سوڈھل کی دزدیدہ نظروں نے مذکورہ عورت کو فوری بھانپتے ہوئے اندازہ لگایا تھا کہ وہی عورت تھی جو کچھ دیر پہلے باہر دیواروں پر اگلے تھاپ رہی تھی اور بلاشبہ یہ خانو دھچر کی وہی طلاق یافتہ ادھیڑ عمر بہن تھی جس کے بارے میں نشی میرل اسے بتا چکا تھا۔ ”اچھی ہے“..... سوڈھل کے اندر کسی نے معنی خیز انداز میں سرگوشی کی..... اور وہ چائے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”تو ٹھیک کہتا ہے بھائی سوڈھل!“ خانو اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا..... ”میں نے بھی اپنی ایک پریشانی کا ذکر نشی صائب سے کیا تھا..... اور تمہارے بارے میں بھی اس نے مجھے بتایا تھا..... یہ بسکٹ تو اٹھانا بھائی سوڈھل۔“ خانو نے دانستہ اپنی ہی بات کاٹتے ہوئے سوڈھل سے کہا۔

”ہاں بھائو خانو..... میری بھی پریشانی تم سے مختلف نہیں.....“ سوڈھل سامنے پلیٹ میں رکھے سستے قسم کے بسکٹ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا..... وہ دونوں اب بتدریج اپنے مطلب کی بات پر آرہے تھے۔

”پریشانی کیا ہے؟ بس گھر بسانے والی بات ہے..... گھر والی کے بغیر گھر..... گھر نہیں لگتا..... بچپن میں ماں باپ مر گئے..... میری بہن تھی..... یہی فضلاں..... بے چاری کا نصیب ہی ایسا نکلا کہ گھر والا بری عادتوں میں پڑ کر جانے کہاں غرق ہوا کہ آج برسوں بیت گئے مگر اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا..... پھر کسی گونٹھائی ہمراہ کے ذریعے پتہ چلا کہ مرادے (فضلاں کا شوہر) کو پولیس مقابلے میں گولی چاٹ گئی ہے..... بہن کو بیاہنے کے چکر میں، میں نے بھی اب تک شادی نہیں کی۔ سوچتا ہوں کوئی ایسا رشتہ ملے جو سنگ کے بدلے میں سنگ دے دے.....“ خانو دھچرا تابتا کر چپ ہو گیا۔

سوڈھل بغور ہمہ تن گوش تھا۔ معارضوں کی میں سے خانو کی بہن فضلاں کے ہولے سے کھانسنے کی آواز ابھری تو یونہی سوڈھل کا بھی جی کھکارنے کو چاہا مگر کچھ سوچ کر اس نے اپنی اس خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔ ادھر خانو اب اپنی سنا کر سوڈھل کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

پھر سوڈھل نے اس کی گھورتی ہوئی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہنا شروع کیا..... ”بھائی خانو! تو ٹھیک کہتا ہے کہ گھر والی کے بغیر گھر نہیں لگتا..... لیکن ذرا تصور کر گھر والی ہوتے ہوئے بھی مرد کو تنہا زندگی گزارنی پڑ جائے تو کتنی مصیبت ہوتی ہے۔ میری بیوی ایک موزی بیماری میں مبتلا ہو کر چارپائی سے لگ گئی ہے..... اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہو گیا ہے..... میری ایک ہی بھینچی ہے اللہ رکھی..... بیاہنا چاہتا ہوں اسے..... لیکن وہی تیرے والی بات کہ میں بھی اپنا گھر بسانا چاہتا ہوں..... میرا مطلب ہے دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں..... اب سوچتا ہوں اپنی اللہ رکھی کے بدلے میں سنگ ہی لوں اپنے لئے.....“

”بات تو پھر صحیح ہے ہم دونوں ٹھیک ٹھیک کر رہے ہیں.....“ خانو جھٹ سے درمیان میں بولا..... ”بول پھر کیا کہتا ہے..... اس نیک کام میں اب نہ دیر ہونی چاہئے نہ زیادہ سوچنا..... میری بہن فضلاں کو تو تو دیکھ ہی چکا ہے..... ضرور تیری اللہ رکھی بھی اچھی ہوگی۔ آگے تیرے مرضی.....“ سوڈھل اس کی بات پر کچھ سوچتے ہوئے اپنا سر ہولے ہولے ہلانے لگا۔

”کیا سوچ رہا ہے بھائو سوڈھل.....!“ خانو نے دریافت طلب لہجے میں پوچھا تو بالآخر مکار سوڈھل اپنے دل کی بات زبان پر لے ہی آیا۔

”مجھے کوئی اعتراض تو نہیں پر..... میری مالی حالت آج کل کچھ ٹھیک نہیں..... اس لئے میں سوچ رہا تھا کوئی ایسا سنگ مجھے بدلے میں ملے جس میں مجھے سنگ کے ساتھ اوپر بھی کچھ مل جائے کیونکہ خانو بھائی دیکھو نہ مجھ گریب کا گزارا یہی چند جریب زمین پر رہا کی کرنے پر ہے اس لئے تھوڑی مالی مدد لینا تو میرا بھی حق ہے۔ آخر میری جوان کنواری دھی ہے.....“ سوڈھل نے آخری الفاظ پر زور لہجے میں ادا کئے تھے گویا ان کی اہمیت جتانے کی کوشش کر رہا ہو۔

خانو دھچرا اب لالچی سوڈھل کو کچھ کچھ سمجھنے لگا..... وہ اس کی بات پر پہلے تو چند ثانیے خاموش رہا پھر ایک ہنکاری اپنے حلق سے خارج کرتے ہوئے سوڈھل کو مخاطب کر کے بولا..... ”سوڈھل! بے شک تو اوپر کا حق دار ہے..... میرے پاس تو بس یہی کچھ ہے جو تو دیکھ رہا ہے..... ہاں تجھ سے میں بھی نہیں چھپاؤں گا کچھ..... میری بہن فضلاں کے نام جھوٹا سازمین کا ٹکڑا ہے..... وہی تجھے مل سکتا ہے۔“

زمین کے ٹکڑے کی بات پر حریص سوڈھل کے اندر مسرت کی لہری اٹھی..... ”واہ..... زن بھی اور زمین بھی..... اور مجھے کیا چاہئے.....“ اس کے اندر کسی نے خوشی سے

میرل نے اسے مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔  
 ”دیکھ سوڈھل! اب تو دودا خان اور ساون وغیرہ سے جلد پیچھا چھڑالے بلکہ میں تو کہتا ہوں انہیں اب زیادہ آسے میں رکھ ہی نہیں..... صاف جواب دے دے.....“  
 سوڈھل اس کی بات پر..... تشویش آمیز سوچ میں غلطاں ہو گیا۔

”کیا سوچتا ہے بابا سوڈھل.....“ معا میرل نے اسے چونکا دیا..... ”اڑے بابا تو ڈرتا ہے کیا ان سے؟ بس کہہ دینا بھوتار سائیں کا کوئی خاص مازوں (آدمی) تھا..... اور وڈیرے سائیں کے کہنے کو میں نہیں ٹال سکتا بس..... گھبراتا کیوں ہے تو بابا..... ہم تمہارے ساتھ ہیں..... بس اب جا اور بے فکر ہو جا.....“

سوڈھل مطمئن ہو کر چلا آیا..... وہ اس بات پر خوش تھا کہ اسے اس سلسلے میں وڈیرے سائیں کا بھی آشر واد حاصل تھا۔ اب کوئی بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ نہیں سکتا..... بھلے اب وہ دودا خان کو بھی صاف جواب دے دے..... انہی خیالوں میں غلطاں جب وہ اپنی گلی کے نکل پر پہنچا تو سامنے نگاہ پڑتے ہی ٹھک گیا۔

سامنے سے دودا خان آ رہا تھا..... سوڈھل نے اگلے ہی لمحے خود کو سنبھال لیا اور اپنے چہرے پر بے رخی سی طاری کر لی۔ دودا خان اسے دیکھ چکا تھا..... وہ قریب آتے ہی اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا..... ”سوڈھل! میں تیرے گھر سے آ رہا ہوں..... تو آج کل ملاقات ہی نہیں کر رہا..... میرا خیال ہے تو شہر بھی نہیں گیا ہے اب تک بھا جانی کو لے کر علاج کے واسطے.....“

سوڈھل نے اس کی بات سنی اور سپاٹ سے لہجے میں بولا..... ”ہاں..... کچھ کام ہو گیا تھا اس لیے نہیں جا سکا.....“

”سوڈھل! میرے کام کا کیا ہوا.....؟ میرا خیال ہے ہوٹل ہی چلتے ہیں وہی آرام سے بات کرتے ہیں.....“ دودا خان بغور سوڈھل کے سر پر چہرے کو تکتے ہوئے بولا تو اس بار سوڈھل نے قدرے رکھائی سے کہا۔

”دودا خان! اب مل کر بیٹھنے کا کوئی فائدہ نہیں.....“

”کیا مطلب.....؟“ دودا خان کے لہجے میں ایک ایسی درشتگی اتر آئی..... مگر سوڈھل اسے ذرا بھی خاطر میں نہیں لایا اور بولا..... ”اس لیے کہ اب اللہ رکھی کا سنگ وڈیرے سائیں کے ایک خاص آدمی نے مانگ لیا ہے..... اور خود وڈیرے نے.....“

”سوڈھل.....! تو جانتا ہے کیا کہہ رہا ہے!“ معا دودا خان اس کی بات کاٹتے

کہا..... مگر سوڈھل نے دانستہ اپنی مسرت کا اظہار نہیں کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پڑا اس کا بھاری ہے..... وہ یونہی کچے صحن کی ایلوں سے تھیں ہوئی دیواروں کو دیکھنے لگا..... اسی لمحے خانو..... معذرت کر کے ذرا دیر کے لیے..... وہیں صحن کے ایک کونے میں بنی سرکنڈوں کی آڑ میں چلا گیا..... جو حوائج ضروریہ کے طور پر مستعمل تھا۔ اس کے وہاں سے ملتے ہی ایک بار پھر باورچی خانے سے فضلاں کے کھکانے کی آواز ابھری اور بے اختیار سوڈھل کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں..... پھر اس نے دیکھا فضلاں وہاں سے برآمد ہوئی اور اس کی جانب آنے لگی۔ شاید وہ چا پرائی پر رکھے چائے وغیرہ کے خالی برتن اٹھانے آرہی تھی۔

سوڈھل اسے اپنی جانب آتے ہوئے دیکھنے لگا..... فضلاں قریب آ کر ذرا جھکتے ہوئے اس کے آگے سے برتن سمیٹنے لگی..... اس کا چہرہ سوڈھل کے چہرے کے بالکل قریب ہو گیا تھا اس کی سانولی رنگت اور پکی عمر کے باوجود اس میں اب بھی ایک ایسی کشش پائی جاتی تھی جو دھڑکتے دل کو ایک لمحے میں کئی بار دھڑکا کر رکھ دیتی تھی۔ اس کے بھرے بھرے گالوں میں سوڈھل کو ایک عجیب سی کشش انگیز چمک نظر آئی۔

پھر واپس مڑتی ہوئی فضلاں نے بھی سوڈھل کی جانب دیکھا اور اسے محو دید پا کر ہلکی سی مسکان ہونٹوں پر پھیلائے واپس جانے لگی تو سوڈھل کی نظروں نے رسوائی تک جاتی فضلاں کا تعاقب کیا..... ایک ایسی سوڈھل کو یوں لگا جیسے وہ جوان ہونے لگا ہو..... اسے اپنے دل پر عرصے سے چھایا ہوا گلہ شمر پگھلتا ہوا محسوس ہونے لگا..... اتنے میں خانو دچھر سرکنڈوں کی آڑ سے کھانستا ہوا برآمد ہوا۔ پھر اس کے بعد دونوں میں کوئی خاص بات نہ ہوئی بجز اس کے کہ انہیں اب پہلی فرصت میں منشی میرل کو اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں آگاہ کرنا تھا۔

سوڈھل ایک موقع پرست شخص تھا..... اسے ہر لحاظ سے خانو دچھر کے ساتھ رشتے داری کا ٹھننے میں فائدہ نظر آ رہا تھا..... لہذا اس نے فوراً اوطاق پہنچ کر منشی میرل کو اپنی ”مرضی“ کے بارے میں آگاہ کرنا ضروری سمجھا نیز خانو دچھر کی زمین کے ٹکڑے والی بات بھی گوش گزار کر دی اور مزید پُر زور لہجے میں بولا..... ”منشی سائیں! خیال رہے خانو دچھر کہیں اپنی زبان سے مکر نہ جائے.....“

”اڑے نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے ہمارے ہوتے ہوئے.....“ منشی میرل نے اسے تسلی دی اور پوچھا..... ”پھر تجھے قبول ہے نابابا.....“  
 ”ہاؤ سائیں! مجھے انکار نہیں ہے۔“ سوڈھل نے پُر زور لہجے میں جواب دیا اور منشی

ہوئے دھاڑ کر بولا..... ”تُو نے پہلے مجھے زبان دی تھی.....“ اس نے جیسے یاد دلایا۔  
 ”مجھ سے زیادہ اونچے لہجے میں بات نہ کر دودا خان.....“ سوڈھل بھی جواباً غراتے  
 ہوئے بولا..... منشی میرل کے ذریعے وڈیرے کی حمایت حاصل ہوتے ہی سوڈھل کا تورویہ  
 ہی یک دم بدل گیا تھا۔

”جانتا ہوں میں اچھی طرح تو کس کے بل پر اکڑ رہا ہے..... لیکن یاد رکھنا  
 سوڈھل..... میرا نام بھی دودا خان ہے..... اور اللہ رکھی..... میرے لئے اب میری غیرت  
 کا معاملہ بن چکی ہے..... تجھے ہر حالت میں اب اس کا سنگ مجھے ہی دینا ہوگا۔“ دودا خان  
 غیظ آلود لہجے میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی شعلوں جیسی تپش عود کر آئی تھی..... مگر  
 سوڈھل اس کے غیظ و غضب کو ذرا بھی خاطر میں نہیں لایا..... اور اٹل لہجے میں گویا اس سے  
 جان چھڑانے کی غرض سے بولا۔

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں دودا خان کہ تو میرے بارے میں کیسے اندازے قائم  
 کرتا ہے..... اور نہ ہی مجھے اس بات کی پروا ہے کہ تو میرا کچھ بگاڑے گا..... میں نے  
 وڈیرے سائیں کے آدمی کو زبان دے دی ہے۔ اب تو نے جو کہنا ہے..... اوطاق جا کر  
 وڈیرے سائیں سے کہہ..... میرے آگے اب مت آنا.....“ سوڈھل دیدہ دلیری سے کہتا  
 ہوا آگے بڑھ گیا اور دودا خان عالم طیش میں اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں یوں بھینچنے لگا جیسے اس  
 میں سوڈھل کی گردن دبی ہوئی ہو..... وہ اپنی جگہ کھڑا قہر آلود نگاہوں سے سامنے جاتے  
 ہوئے سوڈھل کو گھورے جارہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ دغا باز سوڈھل کا یہیں  
 خاتمہ کر دے۔

☆=====☆=====☆

”بھوتار سائیں مبارک ہو آپ کا کام تو بڑے پچل طریقے سے انجام پا رہا ہے.....“  
 منشی میرل نے سامنے آسریں کی چار پائی پر حریری گاؤں کے سے ٹیک لگائے نیم دراز وڈیرے  
 میرلکھ میرخان سے قدرے خوشامدانہ لہجے میں کہا تو وڈیرا کھر کھراتے ہوئے بولا۔  
 ”منشی..... آدمی تو تو میرا وڈا پکا ہے..... یہ تو بتا..... خانو دھیر سے تو نے بات تو کر لی  
 ہے نا..... ایسا نہ ہو کہ عین وقت پر کاوٹ کھڑی کرے میرے لئے.....“

”ناسائیں نا..... اس بے چارے رہا کہ کیا مجال جو آپ کے شوق کے آڑے  
 آئے۔ ویسے میں اسے طریقے سے راستے پر لے آؤں گا..... پہلے ذرا اس حور پری اللہ  
 رکھی کو اس کی بیوی تو بننے دو..... بھوتار سائیں.....“ منشی میرل نے معنی خیر لہجے میں کہا.....

اور وڈیرا لکھ میرخان اس کی جانب دیکھ کر اپنی گھنی مونچھوں کو مروڑتے ہوئے عجیب انداز  
 میں مسکرانے لگا۔

☆=====☆=====☆

شام کا وقت تھا..... اللہ رکھی پانی کا کلسا تھا پانی بھرنے لگی ہوئی تھی..... اور کپے  
 صحن میں بچھی کھری چار پائی پر لیٹی ہوئی چاچی عنایتاں مارے تکلیف کے دہری ہوئے  
 جارہی تھی اور کراہتے ہوئے بمشکل اپنے شوہر سوڈھل کو پکارے جارہی تھی..... ”ہائے  
 رے سوڈھل! مجھ پر رحم کر..... میری تو جان منہ کو آگئی ہے ہائے..... میرا دل بھی بیٹھنے لگا  
 ہے اب تو.....“

سوڈھل اندر کوٹھڑی میں موجود تھا..... چند لمحوں بعد وہ وہاں سے برآمد ہوا تو اس کی  
 وضع قطع ہی بدلی ہوئی تھی، اس نے نئے کپڑے..... اور نئے جوتے پہن رکھے تھے.....  
 تازہ شیو بنائی ہوئی تھی..... گئے چنے بالوں میں تیل لگا کر الٹا کنگھا پھیرا ہوا تھا۔ اس نے  
 بڑی بے رحمی کے ساتھ ایک اچھتی ہوئی نگاہ سامنے چار پائی پر درد کے مارے دھری پڑی  
 اپنی بیوی عنایتاں کی طرف دیکھا اور اس کی سنی ان سنی کرتا ہوا..... گھر کی چوکھٹ پار کر کے  
 باہر آ گیا..... گھر سے باہر نکلتے نکلتے اسے اپنے کانوں میں اپنی بیوی کی بددعائیں کی دی.....  
 ”ڑے سوڈھل! بے رحم..... دھڑیں کرے تجھے گھر کی چوکھٹ دوبارہ نصیب نہ ہو.....“  
 مگر سوڈھل ایک تضحیک آمیز ”ہنہ“ اپنے منہ سے خارج کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

شام کلار رہی تھی..... سردی میں آج اتنی کاٹ نہ تھی..... اگرچہ سوڈھل نے ہلکا پھلکا  
 اونی سویٹر پہن رکھا تھا..... وہ خانو دھیر کی طرف جارہا تھا..... فضلاں کا سراپا ہنوز اس کے  
 تصور میں جاگزیں تھا..... گلی خاصی ویران تھی..... وہ اپنی ہی دھن میں مگن خوش آئند  
 خوابوں کے تانے بانے بنتا ہوا خراماں خراماں جارہا تھا کہ اچانک پُر سکوت فضا گولی چلنے  
 کے دھماکے سے گونج اٹھی..... اور سوڈھل کو اپنی کمر میں انگارے بھرتے ہوئے محسوس  
 ہوئے..... اس کے حلق سے اذیت ناک چیخ نکلی اور وہ بھر بھری زمین پر لہرانے لگا..... اسی  
 وقت..... ایک اور فائر ہوا اور دوسری گولی اس کی گردن میں پیوست ہو گئی..... حیرت انگیز  
 طور پر سوڈھل سخت جان واقع ہو رہا تھا دو گولیاں پیوست ہونے کے باوجود وہ موت سے  
 نیچے اور زندگی کی جستجو میں اپنے دونوں ہاتھ غیر ارادی طور پر پھیلائے دائیں بائیں ڈول  
 رہا تھا..... اچانک پھر تیسری اور سر میں لگنے والی گولی نے اس کا پیچھے اڑا دیا..... اور وہ تیورا  
 کر زمین بوس ہوتا چلا گیا۔

پہلے ہی سے بھیج دیا گیا ہے۔“

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ محلے کی چند عورتوں کے ساتھ اللہ رکھی اور اس کی چاچی عنایتاں روتی بیٹتی وہاں آن موجود ہوئیں۔ پھر تو وہاں جیسے روزِ محشر کا مناظر ہوا گیا۔ اللہ رکھی اور چاچی عنایتاں، سوڈھل کی لاش پر باقاعدہ مین کرنے لگیں۔ یہ منظر خاصا رقت آمیز ہو گیا تھا۔

☆=====☆=====☆

ٹھٹھرتی ہوئی سرمئی شام دھیرے دھیرے رات کے پُرہیت اندھیروں میں مدغم ہو رہی تھی۔ ایسے میں بوسیدہ سی موٹی رلی کی بکل مارے وہ شخص کچے ہار نیم پختہ گھروں کی ٹیڑھی میٹھی گلیوں سے تیز تیز گزرتا ہوا بالآخر گوٹھ کے قبرستان کی طرف جانے والے کچے راستے پر ہولیا۔ اس کی حرکات و سکنات خاصی مشکوک تھیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے اپنے ارد گرد چوروں جیسی نگاہ ڈال رہا تھا۔

قبرستان کی طرف جاتے ہوئے راستے پر دبیز کھرا چھایا ہوا تھا۔ اب قبرستان کی حد شروع ہو چکی تھی۔ سامنے جا بجا جھاڑ جھکاڑ سا پھیلا ہوا تھا۔ خود رو پودوں کی بہتات تھی۔ کیکر اور ٹی کے ٹنڈ منڈ بوجھل سے درختوں کی جٹاؤں ایسی شاخیں قبروں پر آسیب کی طرح جھول رہی تھیں۔ معاوہ شخص ایک ٹوٹی پھوٹی سی قبر کے پاس آ کر رک گیا۔ ماحول میں گہرا سکوت طاری تھا۔ اس شخص نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ پھر رلی کے پیچھے سے اس کا ہاتھ برآمد ہوا جس میں پستول دبا ہوا تھا۔ پھر بڑی سرعت کے ساتھ اس نے وہ پستول ٹوٹی پھوٹی قبر کے اندر پھینک دیا۔ وہ قبر اتنی پرانی اور خستہ حالت میں تھی کہ اس کے اندر خود رو جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔

آخری تاریخوں کے چاند کی دھیمی روشنی میں وہ شخص اپنا کام نمٹا کر واپس پلٹا۔ اب اس کا رخ دوبارہ گوٹھ کی جانب تھا۔ چند فرلانگ پر واقع گوٹھ کے قبرستان سے واپس گوٹھ کی طرف لوٹنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ اب وہ واپسی پر اپنا راستہ بدلتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر ذرا دیر بعد وہ دودا خان کے ہوٹل پہنچ چکا تھا۔ ہوٹل میں وی سی آر چل رہا تھا۔ لوگ کسی فلم میں پوری طرح مگن تھے۔ رلی پوش مشکوک شخص سیدھا کاؤنٹر کے ”دخل“ پر بیٹھے دودا خان کی طرف بڑھا۔ دودا خان اس وقت روپوں کی گنتی کر رہا تھا۔ محرم علی کو آج اس نے جلدی گھر بھیج دیا تھا۔

”بابا جاں پنی ہے میں نے۔“ اس رلی پوش نے دودا خان سے دھیرے سے کہا اور

☆=====☆=====☆

سوڈھل کی خون میں لت پت اور خاک آلود لاش کے گرد کافی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ کچھ کمزور دل حضرات سوڈھل کے عبرتاک انجام پر اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ تلا کر رہے تھے۔ نامعلوم قاتل اپنا ”کام“ کر کے جائے وقوع سے کب کا فرار ہو چکا تھا۔ ”اڑے بابا یہ تو آڑاں سوڈھل ہے۔“ وہاں موجود ایک شخص سوڈھل کی لاش کو پہچانتے ہوئے بولا۔

”لگتا ہے اسے ”کارو“ کر کے مارا ہے کسی نے۔“ ایک جوان سے شخص نے بے رحمانہ تبصرہ کیا۔

”بھلا اسے اس عمر میں کون کارو کر سکتا ہے؟“ ایک دوسرے شخص نے خیال ظاہر کیا۔

”واہ ڈے تیری عقل کو بھی سلام ہے۔ اڑے یہاں تو بوڑھی عورتیں تک ”کاری“ کر دی جاتی ہیں۔“

”یہ تم لوگ کس بیکار کی باتوں میں الجھ گئے ہو۔ ضروری نہیں یہ ”کارو“ ہی ہوا ہو۔ کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔“ کسی اور نے بھی بولنا ضروری سمجھا۔

ایک پختہ العمر شخص آگے بڑھا اور مجمع کو مخاطب کر کے بولا۔ ”تھانے بھی کسی نے اطلاع کی ہے یا ایسے ہی اپنی اپنی ہانکنے میں لگے ہوئے ہو۔“

اس کی اس بات پر پورے مجمعے کو جیسے سانپ سونگھ گیا چونکہ یہ قتل کی واردات تھی اس لئے لاش کو پہچانتے ہوئے بھی کوئی اس کے قریب نہیں پھنک رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس پختہ العمر شخص کی بات پر وہاں موجود لوگوں کو ایک چپ سی لگ گئی تھی۔

تاہم چند ثانیے کے سکوت کے بعد ایک شخص نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”ماما سائیں! تھانے بھلا کون اور کیوں اطلاع دے گا۔ جا کر پھنسا ہے کیا کسی نے تھانے کچہری کے چکروں میں۔“ مذکورہ شخص نے جیسے وہاں موجود لوگوں کو نصیحت کی اور وہ سب اس کی نکتہ آفریں بات پر اپنے سروں کو ہولے ہولے اثبات میں جنبش دینے لگے اور پھر جیسے اس پختہ العمر شخص کو بھی اس ایسے کا ادراک ہوا اور بالآخر بولا۔

”اڑے بابا کم از کم اس کے گھروالوں کو تو اطلاع کر دو اور اوطاق میں بھی وڈیرے سائیں کو خبر کر دو تو اچھا ہے۔ ویسے بھی اس کا گھر کون سا دور ہے۔“

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ ایک اور بولا۔ ”ماما سائیں! اس بد نصیب کے گھر فیضو کو

تب دودا خان کی نظریں اپنے ہاتھ میں دبے روپوں سے ہٹ کر ایک دم اس رلی پوش پر پڑیں تو اسے دیکھ کر دودا خان ذرا چونکا پھر اس کے چہرے کے تاثرات سے یوں لگا جیسے وہ اس رلی پوش ہی کا منظر تھا۔ بہر حال اس نے فوراً اسے اپنے قریب کے اسٹول پر بٹھادیا اور محتاط نظروں سے ہوٹل میں موجود لوگوں کو دیکھا۔ پھر قدرے دھیمے لہجے میں قریب بیٹھے رلی پوش سے پوچھا۔ ”کام ہو گیا؟“

”ہاں، رلی پوش نے مختصر کہا۔“

”شاباش۔ کسی نے دیکھا تو نہیں۔ میرا مطلب ہے کوئی پیچھے تو نہیں لگا تیرے؟“

دودا خان نے پھر پوچھا۔ ”لہجہ ہنوز دھیمہ ہی تھا۔“

”جس وقت میں نے اپنا کام کیا اس وقت کوئی گلی میں موجود نہ تھا۔ اسی لئے مجھے چپکے سے نکلنے کا موقع مل گیا۔“ رلی پوش نے کھر درے سے لہجے میں جواب دیا۔ اس نے اب رلی کو اپنے چہرے سے قدرے سرکا دیا تھا مگر اب بھی وہ دوسروں کو یہ تاثر دے رہا تھا جیسے وہ کوئی بیمار اور مدقوق شخص ہو۔

”تجھے یقین ہے پورا کہ سوڈھل مر چکا تھا؟“ دودا خان نے معاکھی خیال کے تحت پوچھا۔

”ہاں سائیں! اسی لئے تو میں نے تیسری اور آخری گولی اس کے سر میں لگائی تھی۔“

بھجے باہر کر دیا تھا اس تیسری گولی نے۔“ رلی بہ دوش کے لہجے میں حد درجے سفاکی اتر آئی تھی۔

”آلہ قتل؟“ دودا خان جیسے ہر طرح سے اپنی تسلی کرنا چاہتا تھا۔

اس کی بات سن کر رلی بدوش بولا۔ ”اسے قبرستان میں ایک ٹوٹی پھوٹی مگر گہری قبر میں پھینک آیا ہوں۔“

دودا خان کا چہرہ اب جوش سے ایکایک تھمتانے لگا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی کسی اندرونی جہالت کو تسکین مل رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک عود کر آئی تھی۔ اس نے رلی بہ دوش شخص سے مزید کچھ نہیں پوچھا اور چائے لانے کے لیے پیش گار کو گھنٹی بجادی۔

☆=====☆

گوٹھ داد پور کی آبادی تھی ہی کتنی، بمشکل چند سونفوس۔ یہی وجہ تھی کہ سوڈھل کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرف پورے گوٹھ میں پھیلتی چلی گئی۔ گوٹھ کے برسوں پرانی پیل

عمارت والے تھانے میں کچھ لوگوں نے ہمت کرتے ہوئے اجتماعی طور پر اطلاع دے دی تھی اور وہاں موجود ایک قدرے منحنی سے تھانہ انچارج انسپٹر ارشد لاشاری نے اپنے ہمراہ چند کانسیبل لئے اور وقوعے والی جگہ پہنچ کر ضابطے کی کارروائی منماتے ہوئے چند لوگوں سے کچھ سوالات کئے۔ پھر سوڈھل کے گھر پہنچ کر اللہ رکھی اور مقتول سوڈھل کی بیوہ چاچی عنایتاں سے بھی بہ طور خانہ بڑی تفتیش کی اور واپس تھانے آ کر..... کیس کی فائل دور نمیل پر بیچ دی اور میز پر دونوں ٹانگیں پھیلا کر جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ بھلا اسے کیا ضرورت تھی ایسے ”اندھے معاملے“ میں اپنا سر کھانے کی کہ جس میں نہ کسی کے خلاف رپورٹ درج کروائی گئی تھی اور نہ ہی کسی پر سوڈھل کو قتل کرنے کا شبہ ظاہر کیا گیا تھا اور تو اور اسے قاتل کو جلد سے جلد پکڑ کر سزا دلوانے کی عاجزانہ درخواست بھی نہیں کی گئی تھی۔

انسپٹر ارشد لاشاری ایسے کیسوں کو ”آرام طلب“ کیس کا نام دیتا تھا۔ مگر یہ اس کا خام خیال ہی نکلا کیونکہ اگلے دن صبح ہی اسے وڈیرے میر لکھ میر خان کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ وڈیرے سے اس کے خاصے دوستانہ بلکہ ”بے تکلفانہ“ تعلقات تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بلاوا آتے ہی وہ وڈیرے کی اوطاق جا پہنچا۔ اسے دانستہ تنہا اور سادہ کپڑوں میں بلایا گیا تھا لہذا تھوڑی دیر بعد وہ وڈیرے کے سامنے والے سرکنڈوں کے بنے مونڈھے پر براجمان محو کلام تھا۔ اس وقت وڈیرے سمیت اس کا مصاحب خاص منشی میرل بھی موجود تھا۔

”اڑے بابا انسپٹر صاحب! لگتا ہے تم نے تو سوڈھل کے قتل والا معاملہ ہی دبا دیا ہے۔“ چند ثانے خاموشی کے بعد وڈیرے نے کھر کھراتی آواز میں انسپٹر ارشد لاشاری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر انسپٹر ارشد لاشاری چونکا اور پھر ہولے سے سانس خارج کر کے کہنا شروع ہوا۔ ”وڈیرا سائیں! ہم نے اس سلسلے میں پوری تفتیش کی تھی اور کافی محنت بھی..... لیکن مقتول کی ایک زنانی اور اس کی بیٹی غالباً اللہ رکھی نام تھا اس کا، وہ کسی پر شبہ ہی نہیں کر پار ہیں..... اب آپ ہی بتائیں سائیں ہماری تفتیش کی گاڑی کو جب تک شے کی پٹری نہیں ملے گی تو وہ کیسے آگے بڑھے گی۔“

”کہتے تو تم بھی ٹھیک ہو۔ پر تم کو اس معاملے میں اب ذرا ذاتی دلچسپی لینے پڑے گی۔“ اس بار وڈیرے نے قدرے معنی خیز لہجے میں کہا اور منحنی سے ارشد لاشاری کے چہرے پر باریک سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”سائیں! آپ حکم کرو، کس پر ڈنڈا گھمانا ہے۔ میں آج ہی سے شروع ہو جاؤں

”یہ ہوئی نایاروں والی بات۔“ وڈیرہ کھرکھراتے لہجے میں قدرے خوشدلی سے بولا۔

”سائیں! ہم آپ کے خادم، حکم کرو۔“ انسپکٹر ارشد نے کہا تو وڈیرے نے اپنی گھٹی بھنوں تلے آنکھیں سیکڑ کر کہا۔

”اس کا نام دودا خان ہے اور ویسے بھی مجھے اسی پر شبہ ہے۔“

”شبے کی کوئی خاص وجہ؟“ انسپکٹر ارشد نے کسی خیال کے تحت پوچھا اور اس کی بات پر وڈیرے میر لکھ میر خان کے چہرے پر یک دم ایک رنگ سا آ کر منجمد ہو گیا اور وہ عجیب سی نظروں کے ساتھ انسپکٹر ارشد کو تنکے لگا۔ پھر ارشد کو بھی شاید اپنی کبی بات کا جلد احساس ہو گیا اور وہ بات بناتے ہوئے ترنت بولا۔ ”میرا مطلب یہ تھا سائیں کہ اگر آپ وجہ بتا دیتے تو ہم آسانی سے بہت جلد اپنے مطلوبہ شخص یعنی مجرم تک پہنچ سکتے تھے۔“

اس کی بات سن کر وڈیرے نے اپنے حلق سے ایک معتدل سا ہنکار اٹکا لا اور سر کو تھپی جینش دیتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری بات درست ہے۔“ پھر وہ انسپکٹر ارشد کو دودا خان پر اپنے شبے کی مفصل وجہ سمجھانے لگا۔

☆=====☆=====☆

سوڈھل کو قتل ہوئے تیسرا دن تھا۔ ٹھہرتی ہوئی سردرات جیسے سسکتی ہوئی دبے پاؤں گزر رہی تھی۔ اللہ رکھی اور عنایتاں چاچی دونوں گرم لحاف اوڑھے ایک ہی چار پائی پر سو گوار سے بیٹھے تھے۔ کمرے میں بلب کی بیماری روشنی پھلی ہوئی تھی۔ اللہ رکھی کی سیاہ آنکھوں میں آنسوؤں کی جھللاہٹ اتری ہوئی تھی جب کہ چاچی عنایتاں لیٹی ہوئی ہوئے ہوئے سسک رہی تھی۔ شوہر کے قتل کے بعد وہ بالکل ادھ موٹی ہو کر رہ گئی تھی۔ گہرے غم و اندوہ کے باعث کبھی کبھی اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی کراہ نکل جاتی۔ دکھ کی پرچھائیاں جیسے اس کے چہرے پر ثبت ہو کر رہ گئی تھیں۔ حتیٰ کہ کمرے کے درود یوار بھی ماتم کناں محسوس ہو رہے تھے۔ سامنے کی کھری چار پائی پر محلے سے آئے ہوئے کھانے کے برتنوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا جیسے انہیں چھونے کی بھی کوشش نہیں کی گئی ہو وہ ویسے کے ویسے چار پائی پر پڑے تھے۔ دو دن سے ایک لقمہ بھی ان کے حلق سے نہیں اتر سکا تھا۔ عذر خوانی (تقریریت، پُرسا) پر آنے والی محلے کی عورتوں نے انہیں کچھ کھلانے پلانے کی بھی سعی کی تھی مگر بے سود۔

”دھیئے! تو ہی کچھ کھالے۔“ معا کمرے کی غمناک فضا میں چاچی عنایتاں کی لرزیدہ سی آواز ابھری۔ شوہر کی موت کے بعد اس کا رویہ حیرت انگیز طور پر بدل گیا تھا۔ اللہ رکھی چاچی عنایتاں کی بات پر اپنی آب گریہ سے تر آنکھوں کو چادر کے گوشے سے پونچھتے ہوئے بولی تو اس کی آواز قوت آمیز ارتعاش سے بوجھل ہو رہی تھی۔ ”چاچی! میرا جی نہیں کر رہا۔ تو بول تو تجھے کھلا دوں۔“

”نہیں دھیئے! ہائے کاش میں نے اس کو بد دعا نہیں دی ہوتی۔ مجھے کیا معلوم تھا میری زبان اتنی کالی ہوگی۔ ہائے ڈی میرے سر کا سائیں چلا گیا۔ ہائے میرا گھر دھڑیں (مجازی خدا)“ چاچی عنایتاں اب باقاعدہ بین کرنے لگی اور اللہ رکھی سسکتی ہوئی اس کے سر ہانے سرک آئی اور اسے سنبھالتے ہوئے بولی۔

”چاچی! مت رو۔ چاچی۔ میرا آپڑاں (اپنا) دل بھی بیٹھا جا رہا ہے۔“

”ہائے۔ دھیئے! اب ہمارا کیا بنے گا۔ ہم تو سوڈھل کے بعد اکیلے رہ گئے اس دنیا میں ڈی۔“

چاچی عنایتاں کے نالہ و فغاں سے اللہ رکھی کا دل اور گھبرانے لگا۔ چاچا سوڈھل کی اچانک موت نے اسے بھی غمزہ کر دیا تھا وہ جیسا بھی تھا، تھا تو اس کا چاچا جس کی صورت میں اسے اپنے باپ کی شبیہ نظر آتی تھی۔ چاچا سوڈھل کو یاد کرتے ہوئے اس بے چاری کو وہ اندھیری اور سردرات بھی یاد آ گئی۔ جب وہ اور چاچا سوڈھل اس کے بیمار باپ کو نیل گاڑی میں ڈالے بغرض علاج شہر لے جا رہے تھے اور اس کا راستہ ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ سوڈھل کے مرنے کے بعد یہ بھیا نک اور گھناؤنا راز بھی اس کے ساتھ ہی دفن ہو گیا تھا کہ وہ جسے اپنا چاچا سمجھتی آرہی تھی وہ درحقیقت اس کے باپ کا قاتل تھا۔ بہر طور سوڈھل مکافات عمل سے دوچار ہو چکا تھا۔

”دھیئے! مجھے اپنی گزرتی نہیں ہے۔ تیری ہے۔ میرے بعد تیرا کیا بنے گا؟ میں تو خود بیمار رہتی ہوں۔“ چاچی عنایتاں کی آہ و فغاں جاری تھی۔

”چاچی تیکوں رب دادا اسطہ ایسی بات نہ کر تجھے کچھ نہیں ہوگا تو ٹھیک ہو جائے گی۔ میں خود تجھے شہر وڈے ڈاگدر کے پاس لے جاؤں گی۔“ اللہ رکھی اپنی چاچی کو حوصلہ دیتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولی۔ تو بے اختیار چاچی عنایتاں اس کی بات پر زار و قطار رونے لگی۔

”ہائے ڈی دھیئے! تو نے آج مجھے اولادوں جیسی خوشی دے دی۔ آج میری اپنی کوئی اولاد ہوتی تو وہ بھی یہی کہتی۔ اللہ رکھی تو میری دھی ہے۔ ناں۔ معاف کر دینا مجھے،

ہوں۔“ وہ گہرے دکھ اور رندھے ہوئے لہجے کے ساتھ بولی۔

ساون اس کے دکھ اور اندوہ کو محسوس کرتے ہوئے ملائمت بھرے لہجے میں بولا۔  
”نہیں اللہ رکھی! ایسا مت بول۔ میں ہوں ناتیرا۔ کیا تو مجھے اپنا نہیں سمجھتی؟“

”نہیں ساون! تو ہی اب میرا سب کچھ ہے، میری ساری حیاتی کا سنگی۔ تجھے اپنا سمجھ کر ہی تو آنسو بہا رہی ہوں تیرے سامنے۔“ جواباً اللہ رکھی نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

ساون کا دل پسچ گیا وہ اللہ رکھی کے نازک وجود کا ارتعاش اور اس کی سرگیں آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی نمی کو اپنے شانوں پر صاف محسوس کر رہا تھا۔ اللہ رکھی کافی دیر تک اپنے غم کا بوجھ ہلکا کرتی رہی۔ پھر اس سے علیحدہ ہوئی اور ساون کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ساون! میرا دم اب گھٹنے لگا ہے۔ میں اور زیادہ تجھ سے دور نہیں رہ سکتی۔ مجھے کبھی کبھی بہت ڈر لگتا ہے..... اکیلے پن سے۔ ایک خوف کی سی کیفیت طاری رہتی ہے مجھ پر ہر سے۔“

ساون اس کی بات کا مطلب یہ خوبی سمجھتا تھا لہذا اسے تسلی دیتے ہوئے ملائمت سے بولا۔ ”اللہ رکھی! توں گڑتی (فکر) نہ کر وہ وقت اب دور نہیں رہا جب ہم ایک ہو کر زندگی گزاریں گے۔ بس ذرا چاچا سوڈھل کا چالیسواں گزرنے دے، میں خود اپنی امز کے ساتھ تیری چاچی سے تیرا سنگ لینے آؤں گا۔“

پھر جیسے اچانک اللہ رکھی کو کچھ یاد آیا ہو وہ فوراً بولی۔ ”ساون! تو نے میرے سنگ کے لیے سوڈھل چاچا کو پچاس ہزار بھی تو دیئے تھے۔ پتہ نہیں چاچا نے چاچی کو ان پیسوں کا بتایا بھی تھا کہ نہیں۔ اگر چاچی کو اس کا علم ہوا تو وہ میں اس سے واپس لے کر تجھے دے دوں گی۔“

اس کی بات سن کر ساون ذرا چونکا۔ پھر عام سے لہجے میں بولا۔ ”نہیں اللہ رکھی، اپنی چاچی سے بھلے ان روپوں کا ذکر کر دینا مگر اس سے واپس نہ لینا۔ رہنے دینا بے شک۔“  
”لیکن ساون! یہ زیادہ ہیں چاچا سوڈھل نے میرے سنگ کے لیے پچاس ہزار تجھ سے زیادہ مانگ لئے تھے۔ میں پھر ایسا کروں گی کہ دس ہزار رہنے دوں گی باقی تجھے لا دوں گی۔ پتہ ہے ساون! چاچی کا رتاؤ اب مجھ سے کافی اچھا ہو گیا ہے۔“

اب دونوں کے درمیان کچھ دیر پہلے کی چھائی ہوئی کبیدگی زائل ہونے لگی تھی۔ ساون کی سوچ میں غلطاں تھا۔ اسے خاموش پا کر اللہ رکھی نے دوبارہ کہا۔ ”مجھ معلوم ہے ساون کہ تو نے پچاس ہزار روپے وڈیرے کے منشی سے بھاری ویاچ (سود) پر قرض لئے

میں نے تیرے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔“ چاچی عنایتاں کی رقت انگیز باتوں نے اللہ رکھی کا دل چیر کر رکھ دیا اور وہ اس سے بے اختیار لپٹنے ہوئے، رو کر کہنے لگی۔  
”چاچی! میں تیری دھی (بیٹی) ہی تو ہوں۔ یہی صورت میں مجھے ماں ہی دکھائی دیتی ہے۔“

چاچی عنایتاں کو آج جانے کیوں شرمساری اور ندامت کا بھی دکھ نڈھال کئے دے رہا تھا۔ پھر کافی دیر تک کوٹھڑی نما کمرے میں دونوں کی غمناک سسکیاں گونجنے لگیں۔  
کمرے کا محدود ماحول ایک بار پھر ماتم کا سا منظر پیش کر رہا تھا۔

☆=====☆=====☆

دور نارنجی پڑتے مغربی افق پر اتحاد اور تنظیم کا درس دیتی ہوئیں پرندوں کی یکساں اور ہموار ڈائریس محور وارتھیں۔ دور تک پھیلے ہوئے چاولوں کے کھیتوں میں ”سنگ“ جاری تھی..... کہیں کہیں ہاری لوگ ”دیرہ“ کر چکے تھے اور اب چنوں، مٹروں اور گندم وغیرہ کی ”پھٹک“ جاری تھی۔ ایک جانب ٹیڑھے میٹرھے کچے راستوں پر جو سیدھا راکس واہ کی طرف جاتا تھا۔ اللہ رکھی کلسا پہلو میں دبائے، اداس اداس سی بوجھل قدموں کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اس نے ایک موڑ کاٹا اور پھر کن انکھیوں سے اطراف کے مگرز را دور کھیتوں میں کام سے فارغ ہو کر لوٹتے ہوئے ہاریوں کی جانب دیکھا اور پھر ایک ذیلی پگڈنڈی پر مڑ گئی جو راکس واہ کے اونچے کراڑے تک چلی جاتی تھی۔ یہاں کیکر، ڈھینگر اور آسریں کے پیڑوں کی بہتات تھی۔ گوٹھ کی عورتیں پانی کے گھڑے اور کلسے اٹھائے آ جا رہی تھیں۔ اگرچہ ان کی تعداد اب شام ہونے کی وجہ سے کم ہوتی جا رہی تھی۔ اللہ رکھی خاموشی سے کراڑے کو پار کر کے نہر کے کنارے سے اپنا گھڑا بھرنے لگی۔ وہ جانتے بوجھتے ہوئے دیر کر رہی تھی وہاں اکا دکا اور بھی عورتیں اپنا گھڑا بھر رہی تھیں۔ دو ایک نے ازراہ ہمدردی چاچا سوڈھل کی موت پر اظہار افسوس کیا اور لوٹ گئیں۔

آخر میں اللہ رکھی اپنا گھڑا اپنی ٹیکلی کمرے کے خم میں اٹکائے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ وہ خاصی مضطرب نظر آ رہی تھی۔ چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کی شدت سے منتظر ہو..... اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ایک لئے کے تنے سے ساون اچانک طلوع ہو کر اللہ رکھی کے سامنے آ گیا اور اسے اپنے سامنے دیکھتے ہی اللہ رکھی نے فرط جذبات سے اپنا پانی سے بھرا گھڑا ایک جانب رکھا اور بے اختیار ساون سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ”ساون! میرا چاچا سوڈھل گزر گیا۔ میں تو اب بالکل یتیم و بے سہارا ہو گئی

ہیں۔“

اس بار ساون سے چپ نہ رہا گیا اور جب وہ بولا تو اس کا لب و لہجہ بے لوث محبت کے جذبے سے سرشار تھا۔ ”اللہ رکھی! یہ پچاس ہزار تو بہت معمولی رقم ہے تجھے حاصل کرنے کے لیے تو میں ساری دنیا.....“

”لیکن ساون! میں تمہیں مقروض بنا کر تمہارے گلے کا ہار نہیں بننا چاہتی۔“ اللہ رکھی نے اس کی بات کاٹی پھر دونوں میں مزید کوئی گفتگو نہ ہوئی اور اللہ رکھی رخصت ہونے کے لیے زمین سے اپنا گھڑا اٹھانے لگی۔ دور آسمان کی پنہائیوں میں سنائے دار اندھیرے اتر رہے تھے۔

☆=====☆=====☆

سوڈھل کی موت کا دودا خان کی بیوی خیراں کو بھی علم ہو چکا تھا اور اس نے بہ ظاہر کلمہ افسوس کا کہنے کے بعد درون خانہ کلمہ شکر بھی بجالائی کہ چلو کچھ عرصے تک سہی، دودا خان کی تیسری شادی کا معاملہ تو ٹلا اور انہیں تو کم از کم چالیس دنوں تک اس کا کوئی ”خطرہ“ نظر نہیں آتا تھا اور خیراں ان دنوں کو مہلت جانتے ہوئے فائدے اٹھانا چاہتی تھی۔ یعنی وہ اب اپنے بیٹے محرم علی کی شادی کے سلسلے میں دودا خان کو الجھانا چاہتی تھی..... مگر اس کے لیے اپنے بیٹے محرم علی کی رائے بھی معلوم کرنا چاہتی تھی لیکن پھر یہ کام ایک دن خود ہی اس کے بیٹے نے حل کر دیا۔

”امڑ گودی! تم بیمار بھی رہنے لگی ہو اور اوپر سے اکیلی پورا گھر بھی سنبھالتی ہو، ضرور تھک جاتی ہوگی۔“

کانیاں خیراں بیٹے کی شوخ سی مکاری پر مسکرائیں اور دل میں خوش بھی ہوئی کہ اچھا ہے بیٹے نے خود ہی اپنی مرضی ظاہر کر دی مگر پھر بھی وہ انجان بن کر بولی ”ہاں پٹ۔ کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔ سوچتی ہوں کام کاج کے لیے کوئی ماسی رکھ لوں۔“

محرم علی ماں کے تجاہل عارفانہ کو نہ سمجھ سکا لہذا حسب توقع ایک دم بولا۔ ”ماسی کی کیا ضرورت ہے امڑ۔ وہ.....“ اس کی بات باعث شرم ادھوری رہ گئی اور تب مسکراتے ہوئے خیراں نے اس کا کان پکڑ لیا اور پوچھنے لگی۔

”یہ بول کہ بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔ بڑا آیا میرا خیال رکھنے والا۔“ ماں کی مصنوعی خفگی سے اسے ذرا حوصلہ ہوا لیکن سردست چپ ہی رہا۔ ”کوئی دیکھی بھی ہے یا مجھ بیمار ہی کو دیکھنی پڑے گی۔“ بالآخر اس کی ماں نے پوچھا تو وہ جھٹ سے بولا۔

”امڑ تجھے ڈھونڈنے کی تکلیف نہیں اٹھانی پڑے گی۔ وہ ہے نا۔ چاچا پریل اس کی دھی ہے۔ سس..... سوڑھناں ہے اس کا..... وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔“

اس کی بات سن کر خیراں کچھ سوچنے لگی۔ پریل کے نام پر وہ ذرا چوکی اور پھر جیسے تصور میں اس کا پورا خاندان مع شجرہ نسب کے..... اجاگر ہونے لگا اور پھر وہ قدرے مطمئن ہو کر اپنے سر کو نقیبہ جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ”ہاں۔ کچھ یاد تو آتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں کبھی بات کروں گی جا کر، تیری سوڑھ..... کے ہاں..... بلکہ تیرے پیو کو بھی ہمراہ لے جاؤں گی۔“ ماں کو رضامند دیکھ کر محرم علی خوش ہو گیا اور بے اختیار ماں کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بولا۔ ”میری اچھی ماں۔“ اور خیراں پیار سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ پھیرنے لگی۔

☆=====☆=====☆

”اڑے منشی تیری پکائی ہوئی کچھڑی کی ہنڈیا ہی الٹ گئی اب میرے کام کا کیا ہو گا؟“ وڈیرے لکھ میرے معنی خیز لہجے میں کہا۔

منشی اور وہ دونوں اوطاق میں اس وقت تنہا بیٹھے تھے۔ منشی میرل سامنے چار پائی پر بیٹھا تھا جب کہ اس کے سامنے سرکنڈوں کی چوڑی پشت گاہ والے مونڈھے پر وڈیرا براجمان تھا۔ اس نے راسلک کا بیش قیمت سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ منشی میرل وڈیرے کی بات پر اپنے گول گول عدسوں والے چشمے کے پیچھے سے اپنے آؤں جیسے دیدے گھماتے ہوئے بولا۔ ”سائیں بھوتار! بے شک سوڈھل بیچارے کی اچانک موت سے آپ کا کام ذرا کھٹائی میں پڑ گیا ہے..... لیکن سائیں! آپ بے فکر ہو میں کوئی اور چال سوچوں گا۔ ویسے آپ کو کچھ دن صبر کرنا پڑے گا۔ آخر کو بیٹھا“ پھل“ بھی تو کھانا ہے نا سائیں۔“

”اڑے منشی تو بس آسرے دیئے جا رہا ہے مجھے۔ اچھا ٹھیک ہے..... اس میں تیرا بھی کوئی قصور نہیں۔ ویسے منشی تیرا کیا خیال ہے سوڈھل کے قتل کے کیس میں دودا خان کو پھنسا کر ہمیں کون سا فائدہ ملے گا۔ ویسے تیری تجویز کے مطابق میں نے پولیس کو دودا خان کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔“

وڈیرے نے اپنی بات ختم کی تو منشی میرل یونہی اپنی عینک درست کرتے ہوئے بولا۔ ”سائیں پھنسانا کیسا.....! سوڈھل کو قتل ہی دودا خان نے کروایا ہے۔“

”تم اتنے یقین سے یہ کیسے کہہ سکتے ہو۔“ وڈیرے نے اس کی بات پر چونک کر پوچھا تو منشی نے ایک ہنکاری بھرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔



”تیرا کام کرنے کا یہی انداز مجھے اچھا لگتا ہے منشی.....! کہ سانپ بھی مر جائے اور لاشی بھی نہ ٹوٹے.....“

منشی اپنی تعریف پر ”کھی کھی“ کرنے لگا۔

☆=====☆=====☆

شام سے ہی ہوٹل کے ”دخل“ پر بیٹھے ہوئے دودا خان کو جانے کیوں اپنا دل گھبراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے اندر عجیب سی بے کلی بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا گھر جا کر ذرا دیر آرام کرنا چاہئے..... اور ابھی وہ کاؤنٹر سے نکل کر باہر ہی آیا تھا کہ اچانک پولیس کی ایک نیلے رنگ کی ڈائن ہوٹل کے قریب آ کر کی اور انسپٹر ارشد لاشاری کی معیت میں چند سپاہی ڈائن سے اتر کر اس کی جانب تیزی کے ساتھ آنے لگے۔ پولیس کو بڑی پھرتی کے ساتھ اپنی جانب آتے دیکھ کر دودا خان بری طرح ٹھنک گیا۔ اس کے سامان و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ پولیس اتنی جلدی اس کا ”جرم“ بھانپ لے گی یہ سوچ کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جی میں تو آئی کہ فوراً بھاگ اٹھے مگر پھر اگلے ہی لمحے اس نے یہ بچکانہ خیال اپنے دل سے جھٹک دیا اور خود کو ذہنی طور پر اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار کرنے لگا۔

پولیس نے ہوٹل کے احاطے میں پہنچتے ہی دودا خان کو یکدم گھیرے میں لے کر اس کے دونوں ہاتھوں میں جھکڑیاں ڈال دیں..... دودا خان اپنے چہرے پر حیرت اور پریشانی کے ڈونگرے برساتے ہوئے احتجاجی لہجے میں انسپٹر ارشد سے بولا۔ ”یہ..... یہ کیا ہے سب۔ مجھے جھکڑیاں کیوں لگائی ہیں، میرا جرم کیا ہے؟ انسپٹر صاحب.....“ وہ خاصا بوکھلا گیا تھا۔

انسپٹر ارشد اس کی جانب گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”صدقے تھیاں..... قربان و نجان..... تیری فنکاری پر..... بندہ پھڑکا کر رکھ دیا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے جھکڑیاں کیوں پہنائی گئی ہیں۔ لے چلو اسے تھانے ساری فنکاری اس کی ناک کے راستے نکال دوں گا۔“ آخری جملہ انسپٹر ارشد نے دانت پیس کر دودا خان کو گھورتے ہوئے اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

اور وہ اسے کھینچ کر پولیس ڈائن کی طرف لے جانے لگے تو دودا خان ایک بار پھر احتجاجی انداز میں قدرے چلا کر بولا۔ ”آخر مجھے کس جرم میں اور کیوں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ میں نے کیا کیا ہے؟“

”لگتا ہے سائیں! آپ کو تفصیل بتانی پڑے گی۔ درحقیقت دودا خان سوڈھل کی خوبصورت بھتیجی اللہ رکھی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ سوڈھل کو، اللہ رکھی کے سنگ کے سلسلے میں آدھے سے زیادہ پیسے دے چکا تھا اور لالچی سوڈھل نے موگوہاری کے جوان بیٹے ساون سے بھی اسی سلسلے میں پورے پچاس ہزار بڑے لئے تھے اور متواتر اس نے دونوں کو آسرے پر لگایا ہوا تھا۔ میں دودا خان کو جانتا ہوں وہ بڑا پھنڈے باز آدمی ہے۔ سوڈھل نے اپنی بے وقوفی میں آکر اسے ضرور دو ٹوک لفظوں میں اللہ رکھی کا سنگ دینے سے انکار کر دیا ہوگا اور جوش انتقام میں دودا خان نے اسے پھڑکا کر رکھ دیا ہوگا۔“ منشی میرل چند لمحے کے لیے خاموشی ہوا۔

وڈیرا اپنی مونچھوں کو تادیتے ہوئے گہری سوچ میں غلطاں تھا وہ شاید منشی کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ اس نے منشی کے خاموش ہوتے ہی پوچھا۔ ”منشی! آخر تمہیں ان باتوں کا کیسے علم ہوا؟“

”سائیں وڈا! آخر آپ کا پرانا خادم اور نمک خوار ہوں جو بھی کام کرتا ہوں دل اور دماغ لڑا کر کرتا ہوں۔ بھلا ان ساری باتوں کا پتہ چلانا میرے لئے کون سا مشکل کام ہے۔“

”اچھا۔ اچھا آگے بول۔“ وڈیرا شاید اب اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

”ہا سائیں! میں کہہ رہا تھا کہ.....“ منشی نے جدھر سے اپنی بات منقطع کی تھی وہیں سے جوڑ کر دوبارہ کہنا شروع ہوا۔ ”اب دودا خان کو پولیس میں الجھا دینے سے ہمارا..... میرا مطلب ہے آپ کا ”راستہ“ اور ”کام“ اور بھی صاف ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ دودا خان ہمارے ”منصوبے“ میں آگے چل کر رکاوٹیں ڈالتا۔ ہم نے پہلے ہی اس کا بندوبست کر ڈالا۔ اب میرا خدا نخواستہ یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہم دودا خان جیسے بوڑھے گدھے سے ڈر رہے ہیں لیکن وہ ذرا دماغ کا کریک ہے۔ جب خود ہی ہمارا کام ہل طریقے سے ہو رہا ہے تو اس سے خواہ مخواہ الجھنے کا کیا فائدہ..... اب رہا سوال اس چھوکرے ساون کا، تو وہ پہلے ہی ہم سے اتنا بھاری قرض لے کر پھنس چکا ہے کہ وہ ہمارے منہ کو آبی نہیں سکتا، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ہم پہلے جس مقصد کے لیے خانو دھچر کو استعمال کر رہے تھے اب وہی کام ساون کے ذریعے ہو جائے گا۔“ منشی میرل اتنا کہہ کر وڈیرے کی جانب دیکھتے ہوئے چال بازی سے مسکرانے لگا اور وڈیرا لکھ میر خان اسے توصیفی نظروں سے دیکھ کر عجیب انداز میں مسکرایا اور تعریفی لہجے میں بولا۔

عنایتاں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”چاچی! تو ٹھیک کہتی ہے..... میں بھی یہی چاہتی تھی..... کہ یہ روپے نہ رکھوں.....“

”یہ پورے اسی ہزار ہیں..... میرا خیال ہے اس میں سے 30 ہزار دودا خان اور باقی کا پچاس“..... چاچی عنایتاں ایک دم کچھ کہتے کہتے رک گئی اور چوری نظروں سے اللہ رکھی کی جانب دیکھنے لگی تھی شاید اس میں اللہ رکھی کو یہ بتانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اس کے لالچی شوہر سوڈھل نے اس کے سنگ کے عوض دودا خان کے علاوہ ساون سے بھی رقم لی تھی..... اور دونوں کو محض جھوٹے آسرے پر لگا رکھا تھا..... تاہم اللہ رکھی فوراً اپنی چاچی کی خفت بھانپتے ہوئے اسے مزید شرمساری سے بچانے کی خاطر بولی۔

”چاچی میں جانتی ہوں سب..... اور سچے دل سے اپنے چاچا کو معاف کرتے ہوئے اللہ سائیں سے اس کی بخشش کے لیے بھی دعا کرتی ہوں.....“ یہ کہتے ہوئے اللہ رکھی کی آواز لرزی گئی اور آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں۔

عنایتاں نے اللہ رکھی کی بات پر بے اختیار آگے سرک کر اسے اپنے گلے سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی..... کوٹھڑی کے محدود اور سوگوار سکوت میں رونے کی آواز اچھے بھلے انسان کا دل دہلا دینے کے لیے کافی تھی۔

☆=====☆=====☆

”دودا خان کو سوڈھل کے قتل کے سلسلے میں پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔“ یہ وہ دوسری اور اچانک خبر تھی جس نے سوڈھل کی موت کی خبر کی طرح ایک ایک چار سو پھیل کر لوگوں کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔ جب دودا خان کے گھر یہ خبر پہنچی تو خیراں نے یکدم اپنے گھر کے کچے صحن پر بیٹھ کر رونا پیننا شروع کر دیا..... اس وقت گھر میں علی بخش اور محرم علی دونوں موجود تھے..... دودا خان کی گرفتاری کی خبر ان کے ہوٹل کے ملازم نے ہی پہنچائی تھی۔ بے چارے دونوں بھائی باپ کی اچانک گرفتاری کی خبر پر حیران و پریشان ہو گئے..... ان کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں؟ ماں کو سنبھالیں یا تھانے جا کر باپ کی خبر لیں..... اسی اثناء میں خیراں کے رونے پینے پر محلے کی عورتیں بھی اندر آ گئی تھیں۔

”محرم..... تو یہاں بیٹھا امڑ کے پاس میں تھانے جاتا ہوں.....“ بالآخر علی بخش نے کہا اور تیزی سے گھر سے نکل گیا۔

وہ گھر سے تھانے جانے کے لیے نکل تو آیا تھا لیکن..... اب یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ وہ وہاں جا کر کیا کر سکے گا؟ پولیس کے جانبدارانہ رویے سے وہ بہ خوبی واقف

”دودا خان! تمہیں سوڈھل کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ سیدھی طرح سے تھانے چلتے ہو یا.....“ انسپکٹر ارشد نے گویا اس پر اپنے تئیں فرد جرم عائد کرتے ہوئے گرجتی ہوئی آواز کی میں کہا اور اس کے ساتھ ہی حیران پریشان دودا خان کو پولیس ڈائن میں سوار کر دیا گیا۔ ہوٹل میں موجود سب لوگ اس اچانک افتاد پر دم بخود رہ گئے تھے۔ اس وقت ہوٹل میں دودا خان کا کوئی بیٹا موجود نہ تھا۔

☆=====☆=====☆

کچے صحن کے در و دیوار پر اداس اور سوگوار سی شام اتری ہوئی تھی..... اللہ رکھی باورچی خانے میں بے دلی کے ساتھ کھانا بنا رہی تھی..... آج صحن میں سکد اسی چاولوں کی مہک بھی نہیں رچی ہوئی تھی..... اللہ رکھی نے مٹی کے چولہے پر چڑھی ہوئی موگ کی پتلی دال کی دہی اتاری اور چاولوں کی دہی چڑھا کر دم پر رکھ دی۔ اس کے بعد چولہے کی آگ کم کرنے کے لیے اس نے کچھ ادھ جلے دھواں اڑاتے اپلوں کو چپنے سے پکڑ کر باہر نکال کر انہیں بجھایا پھر باورچی خانے سے نکل کر اندر کوٹھڑی میں آگئی جہاں ایک چار پائی پر چاچی عنایتاں بیٹھی ہوئی تھی..... اس کا ژولیدہ چہرہ آج بڑے گہرے دکھ کی غمازی کر رہا تھا۔ اللہ رکھی جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی عنایتاں نے بوجھل سی آواز میں اسے قریب بلایا۔ ”اللہ رکھی!“

”جی چاچی۔“ کہتی ہوئی اللہ رکھی اس کے پاس ہی چار پائی پر بیٹھ گئی..... عنایتاں گرم موٹی سی رلی اوڑھے بیٹھی تھی۔ پائنتی میلی سی رضائی لمبی رکھی تھی۔ اللہ رکھی کے چار پائی پر بیٹھے ہی چاچی عنایتاں نے رلی کے نیچے سے ایک کپڑے کی چھوٹی سی گٹھڑی نکالی..... اور اللہ رکھی کے سامنے اسے کھولنے لگی..... اللہ رکھی خاموشی سے چاچی عنایتاں کو گٹھڑی کھولتے دیکھنے لگی اور جب چاچی عنایتاں نے گٹھڑی پوری کھول دی تو اللہ رکھی ٹھنک سی گئی..... اس کی نظروں کے سامنے اب بہت سارے نئے اور میلے سے نوٹوں کی گڈیاں بندھی رکھی تھیں..... معاً چاچی عنایتاں افسردہ آمیز آواز میں اپنے سامنے پھیلے ہوئے نوٹوں کی جانب دیکھتے ہوئے بولی..... ”اللہ رکھی! یہ نوٹ نہیں ہیں..... یہ سانپ ہیں..... جنہوں نے میرے گھر دھڑیں (سرتاج) کو ڈس لیا..... یہ لے..... میں انہیں رکھنا نہیں چاہتی..... یہ جن کے ہیں انہیں لوٹانا چاہتی ہوں میں۔“

عنایتاں اتنا کہہ کر خاموشی ہوئی کمرے میں ایک ایک سناٹا طاری ہو گیا تھا۔

بلب کی کمزوری روشنی میں اللہ رکھی نے نوٹوں کی طرف دیکھا اور پھر اپنی چاچی

داخل ہونے کی اجازت دی۔

”آخر میں کب تک تمہارے صاحب کا انتظار کروں.....؟“ بالآخر علی بخش سے نہ رہا گیا اور وہ آخر تک آکر ایک سپاہی سے بولا..... تو اس کی اس ”بدتمیزی“ پر ایک سپاہی نے اس زور کا چائنا علی بخش کے گال پر مارا کہ وہ چند قدم پیچھے کی طرف لڑھک گیا۔

”کتے کی طرح چلاتا ہے یہاں..... چل دفع ہو جا یہاں سے.....“ مذکورہ سپاہی نے علی بخش کو چائے کے ساتھ گالی سے بھی نوازتے ہوئے کہا۔

”چچ..... چچ.....“ ایک دوسرا کالا بھنگ سپاہی عقب سے علی بخش کو تھامتے ہوئے طنز یہ انداز میں پچکارا..... اور اپنے ساتھی سپاہی کو آنکھ مارتے ہوئے بولا..... ”اڑے بخش..... اس نرم و نازک چھوکرے..... کو کیوں مارتا ہے..... تو نے اس کے نرم گال پر چائنا سید کر کے اچھا نہیں کیا.....“

”اڑے مٹھو..... تو تو ہے ہی پھدے باز..... جا پھر اس کا کام کر دے..... یہ تیرا کردے گا.....“ بخش نامی سپاہی نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور وہاں اس اثناء میں آن موجود ہوئے دیگر چند سپاہی معنی خیز انداز میں، مارے خفت اور پیش میں سرخ پڑتے علی بخش کی طرف دیکھ کر..... ”کھی..... کھی..... کھی.....“ کرنے لگے..... بے عزتی اور عزت نفس کی مجروح تصویر بنا علی بخش..... وہاں سے جانے لگا تو قید خانے کے سلاخ دار دروازے کے پیچھے سے ایک قیدی نے باواز بلند علی بخش سے کہا۔

”ڑے جوان.....! یہاں سے چلا جا..... ورنہ یہ سور لوگ مل کر تجھے گندا کر دیں گے..... جا چلا جا.....“ وہ قیدی اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ کھڑا علی بخش کو اپنے ہاتھ کے اشارے سے اسے وہاں سے چلے جانے کو کہہ رہا تھا۔ اسے غالباً علی بخش کی بے بسی اور اس بے حس قانون کے رکھوالوں..... کے ہاتھوں زک اٹھاتے دیکھتے رہا نہ گیا تھا..... مجبوراً علی بخش اپنے اندر کے ابال پر قابو پاتا ہوا تھانے سے بے مراد ہی لوٹ گیا۔

☆=====☆=====☆

اللہ رکھی چاچی عنایتاں کے اس اقدام سے بہت خوش تھی وہ ساری رقم دودا خان اور ساون کو لوٹا دینا چاہتی تھی..... سب سے پہلے یہ خوش کن اطلاع وہ اپنے محبوب ساون کو دینا چاہتی تھی..... ویسے بھی اللہ رکھی آج بہت خوش تھی اور ساون سے ملنے کو بہت بے چین تھی..... کیونکہ آج چاچی عنایتاں نے اسے ”خاص“ ہدایت دی تھی کہ وہ ساون کو گھر بلائے تاکہ اس کے پچاس ہزار اس کے حوالے کئے جائیں..... اور ان دونوں کے بارے میں

تھا۔ پھر اچانک اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ ڈیرے لکھ میرخان کے سامنے جا کر اپنی فریاد ڈالے..... آخر کو وہ گوٹھ کا کھ سردار تھا..... بہر طور..... جب وہ وہ ڈیرے کی اوطاق پہنچا تو اسے وہاں اوطاق میں موجود ملازموں کے سوا کوئی نہ ملا۔ علی بخش وہاں سے مایوس ہو کر سیدھا تھانے کی جانب چل پڑا۔ گوٹھ داد پور کا تھانہ جنوبی سمت شہر جانے والی پکی سڑک کے سرے پر واقع تھا۔

”مجھے انسپکٹر صاحب سے ملنا ہے.....“ علی بخش وہاں موجود ایک باوردی سپاہی سے بولا۔

”صاحب اندر نہیں ہے.....“ روکھے پن سے کہا گیا۔

”اگر آنے والے ہیں تو میں یہیں بیٹھ کر ان کا انتظار کر لوں.....؟“ علی بخش نے پوچھا۔

”کر لو.....“ پھر روکھے پن سے جواب ملا..... علی بخش کو اس نامعقول سپاہی کے طرز تخاطب پر غصہ تو بہت آیا مگر وہ ضبط سے کام لیتا ہوا کمرے کے باہر ہی برآمدے کی بوسیدہ سی دیوار سے نصب سنگی بیچ پر بیٹھ گیا۔

شام ابھی پوری طرح سے گہری نہیں ہوئی تھی..... علی بخش کو وہاں صرف دو ہی کمرے نظر آسکے تھے جن کی چوکھٹ پر چھتیں جھول رہی تھیں..... ایک جانب اسے چھوٹا سا سلاخ دار قید خانہ نظر آیا جدھر اسے بھانت بھانت کے کچھ قیدی سانحورہ سے فرش پر تاش کھیتے اور سگریٹ کا دھواں اگلتے ہوئے نظر آئے۔

علی بخش کو قریباً نصف گھنٹہ ہو چکا تھا وہاں بیٹھے ہوئے..... وہ اٹھنا چاہتا تھا کہ قید خانے کے قریب جائے کہ اچانک اسے کمرے باہر اٹین شن کھڑے اسی بددماغ سپاہی کی کرخت آواز سنائی دی وہ اسے درشتگی سے مخاطب کرتے ہوئے بولا..... ”اے جھوکر..... بابا ادھر کہاں جا رہا ہے..... تو..... اندر ہونے کا شوق ہے تو بول.....“

علی بخش کے بڑھتے ہوئے قدم وہیں رک گئے اور وہ دوبارہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا واپس اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔

ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی..... بالآخر علی بخش کو وہاں بیٹھے بیٹھے رات ہو گئی اور وہ بددماغ سپاہی بھی کہیں غائب ہو گیا۔ بلکہ سپاہیوں پر مشتمل عملے کی ڈیوٹی بدل گئی تھی..... علی بخش نے نئی ڈیوٹیاں سنبھالنے والوں سے بھی استفسار کیا..... حتیٰ کہ اپنے باپ کے بارے میں بھی پوچھا مگر کسی نے کچھ بتانا تو درکنار سیدھے منہ بات بھی نہیں کی اور نہ ہی کسی کمرے میں

بھی کچھ سوچا جائے۔

اللہ رکھی اپنی چاچی کی آخری بات کا مطلب بہ خوبی سمجھتے ہوئے سرخ ہو گئی تھی اور وہ اب وہ جلد سے جلد ساون سے مل کر اسے دونوں خوش خبریاں سنانا چاہتی تھی کہ تقدیر بعض مرتبہ اس طرح اچانک بھی مہربان ہو جاتی ہے۔

بہر طور..... اللہ رکھی نے جلدی جلدی گھر کے ضروری کام نمٹائے پھر گھڑا اٹھایا..... اور نہر سے پانی بھرنے..... بہ الفاظ دیگر ساون سے ملنے کے لیے..... اس نے دروازے کی طرف ابھی اپنے قدم بڑھائے ہی تھے کہ معاذ دروازے پر کسی نے دستک دی۔

اللہ رکھی دروازے کی جانب بڑھتے بڑھتے ایک لمحے کو ٹھٹک کر رک گئی..... اور سوچنے لگی کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے.....؟ تاہم دوسری بار کی دستک پر آگے بڑھی اور دروازے کی اندرونی کنڈی کھول کر دونوں پٹ وا کر دیئے..... پھر سامنے نگاہ پڑتے ہی وہ الجھن میں مبتلا ہو گئی..... اس کے لیے وہ دونوں اجنبی تھے..... جو دروازے کی چوٹ کے پار کھڑے اس کی جانب عجیب انداز میں دیکھ کر مسکرا رہے تھے..... ان میں ایک مرد اور دوسری ذرا پختہ عمر کی عورت تھی..... یہ دونوں بہن بھائی خانو دھیر اور فضلاں تھے۔

ان دونوں کو دیکھ کر اللہ رکھی ایک لمحے کو ٹھٹکی ضرور مگر فوراً اندازہ لگاتے ہوئے اس نے سوچا کہ مذکورہ دونوں افراد یقیناً اس کے چاچا سوڈھل کی تعزیت کے لیے آئے ہوں گے تاہم اللہ رکھی استفہامیہ نگاہوں سے ان کی جانب تنکے لگی۔ معا مرد کے ساتھ کھڑی پکی عمر کی عورت جو بلاشبہ فضلاں ہی تھی مسکرا کر اللہ رکھی کو مخاطب کر کے بولی۔ ”ادی..... میرا ناں فضلاں ہے اور یہ میڈا بھراں خانو ہے۔“ فضلاں اچانک کہتے کہتے رکی اور ساتھ کھڑے اپنے بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے یوں تنکے لگی جیسے اب اسے بولنے پر اکسار ہی ہو..... خانو دھیر..... بہن کا اشارہ پاتے ہی جھٹ سے بولا۔

”سوڈھل سائیں میرا محسن اور دوست تھا..... کیا یہ اس کا ہی گھر ہے.....“

”ہا.....“ اللہ رکھی نے مختصر کہا۔

”اور..... تو! اللہ رکھی..... سوڈھل کی بھاری (بھتیجی) ہے.....“ خانو نے تصدیق چاہی..... تو اللہ رکھی ایک کالے اور بدبیت اجنبی شخص کی زبان سے اپنا نام سن کر ذرا ٹھٹکی..... تاہم اس نے مختصر اسی جواب دینے پر اکتفا کیا..... ”ہا.....“ جواب دینے سے پہلے اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے ہمراہ کھڑی اس کی بہن نے اپنے بھائی کو قدرے گھور کر دیکھا تھا۔

”ڑی اللہ رکھی..... کون ہے دروازے پر..... کس سے باتیں کر رہی ہے.....“ معاذ عقب سے چاچی عنایتاں کی آواز بلند ہوئی اور اللہ رکھی نے جواباً کہا..... ”چاچی کوئی مہمان ہیں..... چاچا کے پڑے کے لیے آئے ہیں.....“ اتنا کہتے ہوئے اللہ رکھی ان دونوں بھائی بہنوں کو اندر آنے کی راہ دیتے ہوئے ایک جانب کھڑی ہو گئی تو وہ دونوں اندر آ گئے..... اندر صحن میں خاصی ٹھنڈا تری ہوئی تھی..... اللہ رکھی نے اندر کوٹھڑی میں چلنے کا اشارہ کیا..... تو فضلاں اپنے لنگور سے بھائی خانو دھیر کو باہر ہی صحن کی چار پائی پر بیٹھ جانے کا کہتی ہوئی اللہ رکھی کے ساتھ اندر کوٹھڑی میں آ گئی..... جدھر ایک کھاٹ پر چاچی عنایتاں بوسیدہ سی رضائی اوڑھے نیم دراز تھی..... جوڑوں کے درد کی تکلیف سے اس کا چہرہ بالکل سٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”سلام ماسی.....!“ فضلاں نے بڑے مٹھاس بھرے انداز میں چاچی عنایتاں کو سلام کیا..... چاچی عنایتاں کے لیے بھی بلاشبہ وہ عورت اجنبی تھی..... تاہم وہ سلام کا جواب دیتے ہوئے بولی۔

”آؤ..... آؤ..... بیٹھو..... کم بخت اس جوڑوں کے درد اور بخار نے بالکل ادھ موا کر کے رکھ دیا ہے.....“

”ماسی..... آپ کے مڑس (شوہر) کی اچانک وفات کا پتہ چلا..... بہت دکھ ہوا..... وہ میرے بھراں خانو کا چرانا جوڑی دار (لنگوٹیا) دوست تھا..... اسی ناتے ہمارے ہاں آیا کرتا تھا..... ویسے اس کی ٹنسی سے دشمنی تو نہیں ہو سکتی تھی..... وہ تو بہت شریف اور سیدھا سادہ بندہ تھا.....“ اس کی تعزیت پر عنایتاں کے چہرے پر افسردگی کے تاثرات ابھر آئے..... پھر وہ قریب کھڑی اللہ رکھی کو مخاطب کر کے بولی۔

”دھیئے..... جا..... مہمانوں کے لیے کوئی چاں پاڑیں کر لے.....“ متعجب سی کھڑی اللہ رکھی یک دم چاچی عنایتاں کی بات پر چونکی اور واپس جانے کے لیے پلٹی ہی تھی کہ اسے فضلاں کی بے تکلفانہ آواز سنائی دی.....

”نا..... نا..... رہن دے..... چاں پاڑیں کی کوئی لوڑ نہ کر..... بس ہم تو اپنا فرض پورا کرنے آئے تھے..... ایک گھٹھ کے رکھو اسی ہیں آخر..... اپنوں کی خبر چاری میں تو آنا ہی پڑتا ہے.....“

جانے کیوں اللہ رکھی کو دونوں بھائی بہن ایک آنکھ نہیں بھار ہے تھے شاید اسی لئے کہ ایک تو ان لوگوں کی پہلے سے کوئی شناسائی نہ تھی۔ دوسرے اس عورت کا کالا بھنگ بھائی

خانہ..... اسے انتہائی نامعقول سا لگ رہا تھا..... وہ اسے کبھی کبھار بڑی عجیب و غریب نظروں سے گھورتا اور پھر بڑے معنی خیز انداز میں اپنے کالے اور مونٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی سجالتا تھا۔ اس وقت بھی یہی ہوا..... اللہ رکھی جیسے ہی چاچی عنایتاں کے ایما پر چائے وغیرہ کے لیے کوٹھڑی سے باہر آئی تو سامنے مچھن میں بچھی کھری چار پائی پر بیٹھا ہوا خانو اسے عجیب سی نظروں سے گھور کر مسکرایا..... مگر اللہ رکھی ایک دم اپنا چہرہ دوسری جانب پھیر کر رسوئی میں چلی گئی..... حالانکہ اب وہ خانو کے سامنے سے ہٹ چکی تھی مگر جانے کیوں رسوئی کی چار دیواری میں بھی اللہ رکھی کو خانو کی تیز نظریں اپنا تعاقب کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے یہ سوچ کر حیرت ہو رہی تھی کہ آخر ان دونوں بہن بھائیوں کی اس کے مرحوم چاچا سوڈھل سے بھلا کس نوع کی اور کب کی واقفیت تھی..... وہ تعلق داری تو یوں جتا رہے تھے جیسے برسوں کی جان پہچان ہو..... اللہ رکھی نے منہ بسور کر سوچا..... اس کا تو چائے بنانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔

پھر اچانک اللہ رکھی کو جو چوہے پر چڑھی چائے کی دیگچی پر سر جھکائے بیٹھی تھی..... یوں لگا جیسے کوئی دھیرے دھیرے چلتا ہوا رسوئی کے مختصر سے داخلی راستے پر آ کر کھڑا ہو گیا ہو..... اس نے ٹھنک کر اپنی گردن گھمائی اور سامنے خانو کو دیکھ کر بری طرح چونک پڑی جو اپنی بھدی صورت اور مونٹے دیدے پھاڑے اللہ رکھی کو گھورے جا رہا تھا۔ اللہ رکھی کو اس کی تیز نظریں اپنے وجود میں سرایت کرنی محسوس ہوئیں..... وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی..... وہ اس بد ہیئت اجنبی مہمان کے بے باکانہ انداز پر غصے سے لال پیلی ہو گئی تھی اور پھر اس سے پہلے کہ اللہ رکھی اس کے ساتھ بری طرح پیش آتی معا اندر کوٹھڑی نما کمرے سے چاچی عنایتاں کے زور زور سے بولنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ پُر سے کے طور پر آئی ہوئی مہمان عورت فضلاں پر گرم ہو رہی تھی اور اسے بری طرح لعن طعن کر رہی تھی..... اللہ رکھی اس صورت حال پر پریشان اور متعجب بھی ہوئی کہ آخر ایسی کیا بات ہو گئی تھی فصا یکدم بد مزہ اور نکدر ہو گئی..... اس نے دیکھا خانو بھی چاچی عنایتاں کے زور زور سے بات کرنے پر پریشان اور فکر مند سا نظر آنے لگا تھا یہی نہیں بلکہ وہ اب رسوئی کی چھوٹی سی چوکھٹ سے پرے ہٹ گیا تھا..... اللہ رکھی بھی جلدی سے رسوئی سے باہر نکل آئی..... اور اسی اثناء میں اس نے دیکھا کہ فضلاں نامی اس اجنبی عورت کا چہرہ خفت اور بے عزتی کے احساس سے مسخ ہو چکا تھا۔ وہ کوٹھڑی نما کمرے سے یوں اچانک باہر نکلی تھی جیسے اندر اگر مزید کچھ دیر رکتی تو جانے کیا ہو جاتا..... پھر اللہ رکھی نے دیکھا کہ چاچی عنایتاں بھی لپکتی جھکتی بہ دقت تمام باہر

برآمد ہوئی اور جسے دیکھ کر فضلاں پھر ٹھٹکی۔

”تم ابھی تک یہاں ہو..... میں کہتی ہوں دفع ہو جاؤ..... یہاں سے کینوں کی اولاد.....“ چاچی عنایتاں کا پارہ ساتویں آسمان تک پہنچا ہوا تھا اور اللہ رکھی بری طرح متحیر تھی کہ آخر یہ اچانک چاچی کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ کیوں ان مہمانوں کے درپے ہو گئی تھی..... اس بار فضلاں کے بھائی خانو نے غصے سے پھری ہوئی چاچی عنایتاں کو مخاطب کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

”ماسی..... ہم سوڈھل کی وجہ سے تم لوگوں کو پوچھنے آ گئے تھے..... اس کا مطلب یہ نہیں ہے تم ہمیں یوں بے عزت کر کے نکالو..... آخر پتہ تو چلے بات کیا ہوئی ہے؟“

”ابھی بتاتی ہوں کینے..... ٹھہر ذرا.....“ چاچی عنایتاں غصے سے سرخ ہوتے ہوئے خانو کی طرف بڑھی اور شدت جوش میں وہ اپنے گھٹنوں کے درمیان بھی بھلا بیٹھی تھی وہ خانو کو مارنے کے لیے لپکی..... مگر اللہ رکھی نے فوراً چاچی کا راستہ روکتے ہوئے اسے سنبھال لیا..... پھر وہ قدرے درشت لہجے میں فضلاں سے بولی جواب اپنے بھائی کے قریب کھڑی تھی۔

”تم لوگ مہربانی کر کے چلے جاؤ یہاں سے..... میری چاچی کی طبیعت صحیح نہیں ہے..... جاؤ..... جاؤ..... یہاں سے.....“ اللہ رکھی کے لہجے کا ان دونوں بہن بھائیوں پر خاطر خواہ اثر ہوا وہ اپنے منہ سے ایک خفت آمیز ”ہونہہ.....“ کی آواز نکالتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

اللہ رکھی نے محسوس کیا کہ چاچی عنایتاں کا وجود غصے کی شدت سے کپکپا رہا تھا..... وہ جان گئی تھی کہ ضرور فضلاں نامی اس عجیب عورت نے چاچی کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات کی ہوگی جس نے چاچی کو بھڑکا کر رکھ دیا تھا ورنہ وہ ایسی ہرگز نہیں تھی کہ گھر آئے اور وہ بھی مڑے کے لیے آئے مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتی..... بہر طور ان دونوں بہن بھائیوں کے نکلتے ہی اللہ رکھی چاچی عنایتاں کو سہارا دیتے ہوئے واپس کمرے میں لے آئی..... چاچی کا غصہ ابھی تک سرد نہیں ہوا تھا۔

وہ اب بھی انہیں کوسنے دیتے ہوئے بڑبڑائے جا رہی تھی..... ”بے غیرت نہیں کے..... آئی تھی کسی اور مقصد کے لیے..... اور کہتی تھی پُر سے پر آئے ہیں..... مجھے تو ان دونوں کے بھائی بہن ہونے پر بھی شک ہے.....“ عنایتاں چار پائی پر بیٹھتے ہوئے زہر خند لہجے میں بولے جا رہی تھی..... تاہم اللہ رکھی نے چاچی کو پُر سکون رہنے کو کہا..... پھر وہ فوراً اس

اندر سے نسوانی آواز ابھری جسے ساون پہچان چکا تھا لہذا درمیانے آہنگ میں بولا..... ”میں ہوں..... اللہ رکھی..... درکھول.....“

اگلے ہی لمحے دروازے کے دونوں پٹ وا ہو گئے سامنے اللہ رکھی سرخوشی کے عالم میں کھڑی تھی..... مسرت کے شگوفے اس کے گلابی گالوں پر دکھتے ہوئے ساون کو بڑے بھلے محسوس ہوئے..... اللہ رکھی کے رخ روشن پر انتظار کی صوفشانی دمک رہی تھی..... بہر طور دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں..... معنی خیز پیغامات کا تبادلہ ہوا پھر وہ اللہ رکھی کے راستہ دیتے ہی اندر داخل ہو گیا۔

”چاچی تو ہے نا گھر پر.....“ ساون نے خالی صحن میں آکر ہولے سے پوچھا۔  
 ”ہاں اندر ہے..... آجا.....“ اللہ رکھی ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹیں بکھیرتی ہوئی بولی اور پھر ساون کو اپنے عقب میں لئے اندر کوٹھڑی میں لے آئی جہاں دو چار پائیوں کے درمیان ایک انگلیٹھی رکھی ہوئی تھی..... جس میں ایلے دھیمی آج میں سلگ رہے تھے اور اس کی وجہ سے کمرے کی فضاء بھی خاصی حرارت بخش ہو رہی تھی..... ایک چار پائی پر حسب معمول چاچی عنایتاں نیم دراز تھی۔

”سلام چاچی..... میں ساون ہوں.....“ ساون نے کمرے میں داخل ہوتے ہی چاچی کو سلام کیا اور پھر سامنے کی چار پائی پر خاموش سا بیٹھ گیا..... چاچی عنایتاں نے قدرے نرم لہجے میں اس کے سلام کا جواب دیا..... اللہ رکھی اسی اثناء میں کوٹھڑی سے باہر چلی گئی تھی۔

کمرے میں ایک لمحے کو سکوت سا چھایا رہا پھر ساون نے ازراہ ہمدردی پوچھا.....  
 ”چاچی تیری طبیعت اب کیسی ہے..... اللہ رکھی بتا رہی تھی کہ..... تجھے جوڑوں کا آزار ہے.....“

”ہا..... پٹ ساون..... لگتا ہے یہ جوڑوں کا درد اب مجھے قبر میں ہی لے جا کر چھوڑے گا.....“ چاچی عنایتاں آہ بھرتے ہوئے بولی۔

”نہیں چاچی، دھڑپیں سائیں خیر کرے گا..... ایسا نہ بول.....“ ساون کی درد آویز گفتگو نے چاچی عنایتاں کی آنکھیں نمناک کر دیں جنہیں وہ اپنی رلی کے کونے سے صاف کرنے ہوئے قدرے رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔

”ساون پٹ تجھے دیکھ کر اولاد کا سادہ محسوس ہوتا ہے..... میری اولاد آج اگر ہوتی تو وہ بھی بالکل تیری طرح میری بون نمگساری کرتی۔“

کے لیے پانی کا گلاس بھر لائی اور اس کے بعد جب اس نے محسوس کیا کہ اب چاچی عنایتاں کا غصہ ذرا ٹھنڈا پڑ گیا ہے تو اس نے اس بد مزگی کی وجہ دریافت کی۔

”اپنے لنگور سے بھائی کے لیے..... تیرا سنگ مانگنے آئی تھی اور کہتی تھی کہ اس کے بدلے میں مجھے..... بس اللہ رکھی اب آگے مجھ سے کچھ نہ پوچھ..... اگر دوبارہ کبھی یہ دونوں دروازے پر نظر آئیں تو انہیں اسی طرح جوتے مار کر نکالنا.....“ چاچی عنایتاں تقریباً ہانپتے ہوئے بولی اور اللہ رکھی کو بھی اس بد مزگی کی اصل وجہ سن کر بہت غصہ آیا..... اس نے سوچا اگر وہ دونوں بہن بھائی اس وقت اس کے سامنے موجود ہوتے تو وہ ان دونوں کا منہ نوچ لیتی۔ پھر اچانک اس نے دیکھا کہ چاچی عنایتاں سسک پڑی اور اپنی اجرک کے کونے سے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولی۔

”اللہ رکھی..... اگر تیرا چاچا سوڈھل آج حیدرہ (زندہ) ہوتا تو ایسے لوگوں کو یہاں آنے کی جرات نہ ہوتی.....“ اور وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی..... اب اس بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ وہ دونوں یعنی خانودہ چھر..... اور اس کی ادھیڑ عمر بہن فضلاں درحقیقت آئے ہی اس کے شوہر سوڈھل کی وجہ سے تھ..... اور نہ ہی وہ یہ بات جانتی تھی کہ اس کے مرحوم شوہر سوڈھل نے نہ صرف اللہ رکھی کی شادی کا فیصلہ اس لنگور سے خانودہ چھر..... کے ساتھ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور بدلے میں اپنی بھی شادی اس کی بہن فضلاں سے کرنے پر تیار تھا۔ مگر وائے قسمت یا وادہ قسمت! کہ سوڈھل اپنے کسی نادیدہ دشمن کی گولی کا شکار ہو کر جہاں ن فانی سے کوچ کر گیا اور بعد میں یہ دونوں بہن بھائی اس کی باقیات پر امید رکھے یہاں تک آن پہنچے تھے مگر انہیں بے نیل و فرام یہاں سے رخصت ہونا پڑا تھا۔

☆=====☆

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی پھلکی بخ بستی کا احساس ہو رہا تھا۔ ساون دوپہر کے کھانے سے جلدی جلدی فارغ ہوا اور نئے کپڑوں پر اجرک اور ٹوپی پہن کر باہر نکل آیا..... اس کا رخ اللہ رکھی کے گھر کی جانب تھا..... کل ہی اللہ رکھی سے ملاقات پر اس نے ساون کو خوشی خوشی بتایا تھا کہ عنایتاں چاچی نے اسے کل یعنی بعد دوپہر اپنے گھر بلایا ہے اور اللہ رکھی نے اشاروں کنایوں میں ساون کے یہ بھی گوش گزار کر دیا کہ یہ بلاوا ایک خوش خبری کا باعث بن سکتا ہے..... لہذا ساون آج سرمست سا اللہ رکھی کے گھر چلا جا رہا تھا..... پھر تھوڑی دیر بعد وہ اس کے گھر کے سامنے کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

”کیہ آ..... (کون ہے؟)“

کھڑا ہوا اور آگے بڑھ کر چاچی عنایتاں کے سر پر روایتاً اپنا ہاتھ دھر کر بولا..... ”چاچی! میں اللہ رکھی کو خوش رکھنے کی پوری کوشش کروں گا..... لیکن تُو ان روپوں میں سے کچھ رقم اللہ رکھی کے سنگ کے لیے رکھ لے..... میرا دل خوش ہو جائے گا.....“

اس کی بات پر چاچی عنایتاں نے نمناک آنکھوں اور قدرے ستے ہوئے چہرے سے ساون کی طرف دیکھا پھر سارے نوٹوں کو ایک پٹچی میں لپیٹ کر ساون کی طرف بڑھاتے ہوئے قطعیت سے بولی۔ ”نہیں ساون! میں اب یہ پیسے نہیں لوں گی تیری جو مرضی ہو کر لے.....“

ساون نے خاموشی سے روپوں کی پوٹلی تھامی اس وقت..... اللہ رکھی کمرے میں داخل ہوئی..... ساون نے آہستگی سے پوٹلی کھولی اور اس میں سے پندرہ ہزار نکال کر چاچی عنایتاں کے قریب ہی چار پائی پر رکھتے ہوئے بولا..... ”چاچی! یہ میں اپنی خوشی سے تجھے دے رہا ہوں..... پندرہ ہزار ہیں..... رکھ لے اسے۔“

قریب کھڑی اللہ رکھی خاموش تھی چاچی بھی چند ثانیے پر سکوت رہی پھر اپنے قریب رکھے نوٹوں کی طرف دیکھا اور قریب کھڑی اللہ رکھی کو مخاطب کر کے بولی۔ ”دھیے! پٹ ساون کو میں نے سارے پیسے واپس کر دیئے ہیں..... پر یہ اپنی خوشی سے تیرے سنگ کے لیے پندرہ ہزار روپے دے رہا ہے..... تیری کیا مرضی ہے.....؟ یہ میں تجھ پہ چھوڑتی ہوں.....“

اللہ رکھی چاچی عنایتاں کی بات سن کر چند ثانیے خاموش کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر پاس کھڑے ساون سے بولی۔ ”ساون! بس تُو سنگ کے لیے صرف پانچ ہزار روپے دے باقی اٹھا لے۔“

ساون نے اللہ رکھی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر التجا تھی کہ ہر صورت میں ساون اس کی بات مان لے..... لہذا ساون نے پھر پانچ کی بجائے دس ہزار چھوڑے اور بقیہ چالیس ہزار کی پوٹلی اٹھالی اور چاچی کو سلام کر کے باہر صحن میں آ گیا۔

اللہ رکھی اسے دروازے تک چھوڑنے آئی تو اسے رخصت کرتے ہوئے تاکیداً بولی ”ساون! یہ پیسے ابھی جا کر منشی میرل کو لوٹا دے..... اور اپنے ہمراہ کوئی گواہ ضرور لے جانا..... ابھی ان روپوں پر اتنا ”ویاج“ (سود) نہیں چڑھا ہو گا..... میری بات مانے گا.....“

آخر میں وہ قدرے رساں سے بولی تھی اور سادہ نے اس کی جانب محبت پاش

”ارے چاچی..... مجھے بھی اپڑاں پٹ..... اور اولاد ہی سمجھ..... تُو میری امڑ جیسی ہے.....“ ساون نے اس کا دل رکھا..... اسی اثنا میں اللہ رکھی چائے وغیرہ کی ٹرے لئے اندر داخل ہوئی..... پھر ذرا دیر بعد وہ تینوں اکٹھے چائے پینے لگے۔

سب سے پہلے چاچی عنایتاں نے اپنی چائے ختم کی اور پھر اپنی چار پائی ہی کے کسی کونے سے ایک پٹچی سی نکالی اور اسے کھولنے لگی..... اللہ رکھی اور ساون کی نگاہیں ایک لمحے کو چار ہوئیں اور وہ پھر چاچی کو بغور پٹچی کھولتے دیکھتے رہے..... تھوڑی دیر بعد انہوں نے دیکھا کہ چاچی عنایتاں نے نوٹوں کی دو تین بھاری گڈیاں نکالیں اور ساون کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”پٹ ساون! یہ تیرے پچاس ہزار ہیں..... جو تُو نے میرے شوہر سو ڈھل کو دیئے تھے..... یہ تُو رکھ لے.....“

ساون یہ دیکھ کر ہکا بکا سا رہ گیا چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد پھر رساں سے بولا..... ”چاچی..... یہ میں نے چاچا سو ڈھل کو اللہ رکھی کے..... اپنے سنگ کے واسطے دیئے تھے..... یہ تُو رکھ لے میں نہیں لوں گا انہیں۔“

ساون کی بات سن کر چاچی نرم لہجے میں بولی۔ ”نہیں ساون پٹ..... یہ بہت زیادہ ہیں..... اور میں جانتی ہوں تُو ایک غریب ہاری کا بیٹا ہے..... یہ میں اپنی خوشی سے تجھے لوٹا رہی ہوں..... لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے میں تجھے اللہ رکھی کا سنگ دینے سے انکار کر رہی ہوں..... میں جانتی ہوں اچھی طرح سے کہ اللہ رکھی تیرے ساتھ بہت خوش رہے گی۔“ آخری الفاظ چاچی عنایتاں نے سرخ ہوتی اللہ رکھی کی طرف دیکھتے ہوئے ادا کئے تھے..... اور جن کی حدت محسوس کرتے ہوئے اللہ رکھی خاموشی سے چائے کے برتن اٹھا کر کوشٹری سے باہر چلی گئی۔

ساون خاموش تھا..... چاچی پھر ملائمت سے استفسار طلب لہجے میں ساون کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”پٹ ساون!“

”جی چاچی.....“ ساون جھٹ بولا۔

”پٹ..... یہ بتا..... کہ اللہ رکھی کے بیاہ سے تیرے گھر والے تو راضی ہیں ناں..... میرا مطلب ہے کہ کبھی اپنے ماں باپ کو کبھی یہاں لا..... تاکہ میں اللہ رکھی کے فرض سے سبکدوش ہو سکوں۔“

ساون نے محسوس کیا یہ کہتے ہوئے چاچی کے لہجے میں رقت سی عود کر آئی تھی..... ساون نے خاموشی سے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ پھر ہامی بھرتے ہوئے جانے کے لیے اٹھ

نظروں سے دیکھ کر دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔

پھر لگ بھگ کوئی نصف گھنٹے بعد وہ ایک شخص رجیمو کو بہ طور گواہ لے کر اوطاق پہنچا۔ اتفاق سے منشی فارغ ہی بیٹھا تھا۔ ساون نے اسے چالیس ہزار روپے لوٹائے تو منشی یوں چونک اٹھا جیسے کسی بچھونے ڈس لیا ہو۔ ساون نے دیکھا اس کا چہرہ قدرے ناگوار سا ہو گیا تھا۔ تاہم اس کی چندھی آنکھوں میں ایک کرخت آمیز حیرت بھی سمٹ آئی تھی جیسے اسے یقین نہیں آ رہا ہو کہ ساون اتنی جلدی اتنی بڑی رقم لوٹا دے گا۔

”منشی صاحب۔۔۔۔۔ یہ پورے چالیس ہزار ہیں۔۔۔۔۔ دس میں بعد میں دے دوں گا۔“ ساون نے بالآخر کہا اور پھر اچانک اس کی بات سن کر منشی نے اپنے چہرے کا رنگ گرگٹ کی طرح بدلتے ہوئے کھی کھی بھی کرتے ہوئے اس سے بولا۔

”اڑے۔۔۔۔۔ بابا چھوڑا۔۔۔۔۔ اتنی جلدی بھلا کیا تھی لوٹانے کی۔۔۔۔۔ ابھی بے شک رکھ لے۔۔۔۔۔ دو چار سال بعد دے دینا۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے منشی میرل ساون کی جانب بہ غور دیکھنے لگا۔ مخاطب وہ ساون سے ہی تھا پر درحقیقت۔۔۔۔۔ وہ درون خانہ اسی ادھیڑ بن میں غلطاً تھا کہ آخر ساون یہ رقم اتنی جلدی کیونکہ لوٹا رہا ہے۔ کیا اس کا ارادہ اللہ رکھی سے شادی کرنے کا نہیں ہے۔

معاں اس کی سماعت سے ساون کی پُرمتانت۔۔۔۔۔ آواز ٹکرائی وہ جواب اس سے کہہ رہا تھا۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ منشی۔۔۔۔۔ تیری وڈی مہربانی۔۔۔۔۔ پر اب یہ روپے میں واپس ہی کر کے رہوں گا۔۔۔۔۔ جتنے چاہئے تھے اتنے میں نے رکھ لئے ہیں۔۔۔۔۔ اب ذرا تو لکھت پڑھت کر لے تو میں جاؤں۔۔۔۔۔“

پھر طوعاً و کرہاً منشی نے اپنی گول گول عدسوں والی عینک کے پیچھے سے اپنے الوؤں جیسے دیدوں کو گردش دی اور گود میں رکھا رجسٹر کھولا۔۔۔۔۔ پھر ساون سے روپے لے کر گئے اور رجسٹر میں کچھ اندراج کیا۔۔۔۔۔ اور ساون کو رجسٹر سے کاغذ کا ایک پرزہ پھاڑ کر حوالے کر دیا۔۔۔۔۔ ساون نے کاغذ اس سے لے کر پڑھا تو اس میں واپسی کی رقم بجائے چالیس کے تینتیس ہزار لکھی تھی۔

وہ حیرت آمیز پریشانی سے منشی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”منشی سائیں! یہ کیا میں نے تو آپ کو پورے چالیس ہزار دیئے ہیں آپ نے تو۔۔۔۔۔ تینتیس۔۔۔۔۔“

”ہاؤ بابا ہاؤ۔۔۔۔۔ باقی سات ہزار ویاچ (سود) کے کاٹے ہیں۔۔۔۔۔“ منشی اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”لیکن منشی صاحب! یہ تو ظلم ہے قہر۔۔۔۔۔ ہے۔۔۔۔۔ ابھی مجھے آپ سے پچاس ہزار لئے عرصہ ہی کتنا ہوا ہے جو آپ نے اتنا ویاچ کاٹ لیا۔۔۔۔۔ اور پھر پورے چالیس میں نے یکدست بھی تو ادا کر دیئے آپ کو۔“ ساون کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی اس کے ہمراہ گواہ کے طور پر آیا ہوا رجیمو بھی اچنبھے میں مبتلا تھا مگر ہنوز وہ خاموش ہی تھا۔

”اڑے بابا چھو کر۔۔۔۔۔ اتنی لمبی رقم لے کر پھر جلدی سے لوٹا دینا۔۔۔۔۔ ہمارے لئے بھی نقصان دہ ہی ہوتا ہے۔۔۔۔۔“ منشی میرل۔۔۔۔۔ دو اور دو چار والا لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔۔۔۔۔ ”اگر تو تین چار سال بعد بھی دیتا تو ویاچ کے طور پر اتنی ہی کٹوتی ہوتی۔۔۔۔۔“

”اس کا مطلب تو پھر یہ ہوا کہ یہ چالیس ہزار روپے میں اپنے پاس ہی رکھ لوں ویاچ تو ویسے بھی تین سال والا ہی کٹ رہا ہے۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔“

”اب تو میری بات سمجھانا چھو کر۔۔۔۔۔“ منشی جھٹ بولا جیسے اس کی دیرینہ مراد برآئی ہو۔۔۔۔۔ درحقیقت وہ یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح سے ساون یہ قرض اتارنے کی بجائے چالیس ہزار واپس اپنے ساتھ لے جائے اور قرض کا طوق ساون کے گلے میں پھنسا کر اسے وڈیرے کا غلام بنا دے تاکہ۔۔۔۔۔ ”وڈے سائیں کا کام“ مزید۔۔۔۔۔ آسان ہو سکے۔۔۔۔۔ اور ساتھ ہی وہ اس کی خوشنودی بھی حاصل کر لے۔۔۔۔۔ لہذا وہ مزید بولا۔۔۔۔۔ ”اس لئے تو کہہ رہا ہوں کہ تو یہ چالیس ہزار بھلے ابھی مجھے نہ لوٹا۔۔۔۔۔ ویاچ تو تجھ پر ویسے ہی لگ چکا ہے چاہے ابھی لوٹا یا بعد میں۔۔۔۔۔ تو بہتر یہی ہے تیرے واسطے کہ تو ابھی ان روپوں کو رکھ لے تیرے کام آئیں گے۔۔۔۔۔ ابھی تو شادی بھی کرے گا۔۔۔۔۔ تیری ضرورت بڑھے گی۔۔۔۔۔ کوئی ڈھور ڈنگر ہی خرید لینا یا۔۔۔۔۔ نیل گاڑی۔۔۔۔۔ سو کام نکل سکتے ہیں تیرے۔۔۔۔۔“

ساون چالاک اور عیار منشی میرل کی باتوں میں آکر اپنا سر دھیرے دھیرے اثبات میں ہلاتے ہوئے سوچنے لگا کہ منشی ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔۔۔۔۔ سود تو ویسے ہی کٹ رہا ہے تو کیوں نہ یہ پیسے ابھی اپنے پاس ہی رکھ لوں۔۔۔۔۔ کبھی کام ہی آجائیں گے۔ انسان پر مشکل وقت آتے دیر تھوڑا ہی لگتی ہے۔۔۔۔۔ لہذا پھر ساون نے منشی کی دی ہوئی رسید پھاڑ ڈالی اور اس سے چالیس ہزار واپس لئے۔۔۔۔۔ گواہ رجیمو کا شکریہ ادا کیا پھر۔۔۔۔۔ گھر کی جانب ہو لیا۔۔۔۔۔ گھر لوٹتے لمحے اس کے ذہن میں یہی بات بار بار گردش کر رہی تھی کہ اللہ رکھی کو اس کا منشی کو قرض لوٹاتے لوٹاتے دوبارہ واپس لے لینا ہرگز اچھا نہیں لگے گا۔ لہذا سر دست ساون نے اپنے تئیں مطمئن اسے اس بات سے آگاہ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔



بھی نیل گاڑی سمیت اللہ رکھی کے ساتھ ہوتے تھے۔ چاچی کے لیے اللہ رکھی دوپہر کا کھانا بنا کر گئی تھی۔ جن دنوں گوٹھ کے کھیتوں میں کام زیادہ ہوتا تھا تو لوگ منہ اندھیرے ہی مزدوری کے لیے نکل جاتے تھے اور گھر کے باقی ماندہ افراد صبح صادق کا بنا ہوا کھانا دس گیارہ بجے ہی کھا کر فارغ ہو جایا کرتے تھے۔ لہذا چاچی عنایتاں بھی گیاہ بجے سے پہلے پہلے کھانا کھا چکی تھی۔ وہی ان کا ناشتہ بھی ہوتا تھا اور دوپہر کا کھانا بھی۔

اس وقت چاچی عنایتاں ایک گہری سوچ میں مبتلا تھی۔ اور اس نے اس مسئلے کے لیے پڑوس سے اپنی ایک دیرینہ جاننے والی مائی عجیباں کو بلایا تھا۔ چاچی عنایتاں کو درحقیقت یہ مسئلہ درپیش تھا کہ وہ ساون کو اس کے پیسے لوٹا چکی تھی اب دودا خان کے روپے کیسے لوٹائے۔؟ ابھی وہ اسی سوچ بچار میں تھی کہ اس کی پڑوسن مائی عجیباں بھی آگئی۔

رکھی علیک سلیک کے بعد اس نے عجیباں کے سامنے اپنا مسئلہ رکھ دیا اور مشورہ مانگتے ہوئے پوچھا۔ ”زری عجیباں! ہن تو ہی بتا مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اس مردود دودے کے پیسے کس طرح لوٹاؤں۔۔۔۔۔ وہ مو تو جیل میں بند ہے۔“

”جا کر اس کی گھر والی کو دے دے میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔۔۔۔۔ بلکہ دونوں ساتھ ہی چل کر دے آئیں گے۔“ مائی عجیباں نے رائے دی۔ اس کی عمر پینتالیس سے متجاوز تھی۔ رنگ سانولا اور جسم فربہ مائل تھا۔ چاچی عنایتاں نے اس کی بات دھیان سے سنی اور گمان آمیز لہجے میں بولی۔

”کیا ہم اس کی گھر والی کو روپے واپس کرتے ہوئے اسے یہ بتائیں کہ یہ اس کے شوہر نے اللہ رکھی کے ساتھ شادی کے لیے ہمیں دیئے تھے۔“

”ظاہر ہے عنایتاں، یہ تو بتانا ہی پڑے گا اسے۔۔۔۔۔“ مائی عجیباں مدھم گردو ٹوک لہجے میں بولی۔ ”ویسے عنایتاں میں کہتی ہوں تو خواہ مخواہ اور بیکار کی الجھنوں میں پڑ رہی ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے۔۔۔۔۔ یہ روپے دودا خان کے گھر والوں کو لوٹا دے۔۔۔۔۔ ویسے بھی اس موڈی دودا خان کو ادا سوڈھل کے قتل کے جرم میں پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ یہی موقع ہے اپنی جان چھڑانے لگا۔“ اس کی بات پر چاچی عنایتاں تقبیہ انداز میں اپنا سر ہلانے لگی۔ اور چند لمحوں بعد فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

”ٹھیک ہے عجیباں۔۔۔۔۔ اللہ رکھی کو ذرا آنے دے۔۔۔۔۔ پھر ساتھ ہی چلتے ہیں۔۔۔۔۔ تُو بیٹھ میں تیرے لئے چائے پاڑیں کا بندوبست کرتی ہوں۔۔۔۔۔“ چاچی عنایتاں ابھی اٹھنے ہی لگی تھی کہ مائی عجیباں اسے روکتے ہوئے خلوص سے بولی۔

”واہ ڈے منشی میرل۔۔۔۔۔ کیا دماغ ہے تیرا بھی۔۔۔۔۔ وہ چھو کر اتنی جلدی قرض کا طوق اپنے گلے سے اتارنے آیا تھا اور تو نے دوبارہ اس کی گردن میں وہ طوق پھنسا دیا۔۔۔۔۔“ وڈیرا لکھ میر خان ایک چوڑے پشت والے سرکنڈوں کے مونڈھے سے ٹیک لگاتے ہوئے بھاری لہجے میں منشی سے بولا اور پاس کھڑا منشی میرل بھی کھی کرنے لگا۔۔۔۔۔ وڈیرے کے منہ سے اپنی تعریف سن کر بہت خوش ہو رہا تھا۔

وہ بولا۔ ”ہاسا میں وڈا۔۔۔۔۔ میں تو ایک دم پریشان سا ہو گیا تھا جب یہ چھو کر اساون اکٹھی چالیس ہزار کی رقم لوٹانے آگیا۔۔۔۔۔ میں حیران ہوں کہ ابھی تک اس کے پاس اتنی رقم قرضے کی کیونکر سنبھلی ہوئی ہے۔۔۔۔۔؟“ پھر منشی خود ہی کچھ سوچ کر اپنے سوال کا جواب وڈیرے کو دیتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ ”میرا خیال ہے سائیں وڈا۔۔۔۔۔ سوڈھل کے قتل۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے مرنے کے بعد۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ کہ اللہ رکھی نے اسے وہ روپے لوٹا دیئے ہوں جو اس کے سوڈھل چاچا۔۔۔۔۔ نے اس کے سنگ کے بطور معاوضہ ساون سے لئے تھے اور جس کی وجہ سے ساون ہم سے قرض لینے پر مجبور ہوا تھا۔۔۔۔۔“

”ہوں۔“ وڈیرے نے ہنکاری بھرنے پر اکتفا کیا جیسے وہ منشی کو مزید اپنی بات جاری رکھنے کا ارادہ رکھتا ہو۔۔۔۔۔ مگر منشی اتنا بتا کر خاموش ہو گیا تو بالآخر وڈیرے نے کچھ سوچتے ہوئے گہرے انداز میں منشی سے کہا۔ ”منشی! کیا تو سمجھتا ہے کہ اگر ساون اللہ رکھی سے شادی کر لے تو ہمارا کام مزید آسان ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔؟“

وڈیرے کی بات پر منشی میرل جھٹ موڈ بانہ لہجے میں بولا۔ ”ہاؤ سائیں برابر۔۔۔۔۔ کیوں نہیں بھلا۔۔۔۔۔ بس ایک بار اسے ہمارے قرضے کے شکنجے میں جکڑ جانے دو۔۔۔۔۔ پھر دیکھنا یہ خود ہی بے دست و پا ہو کر اللہ رکھی کو آپ کے قدموں میں ڈال دے گا۔۔۔۔۔ اور یوں آپ کی دیرینہ آرزو بھی پوری ہو جائے گی۔“

وڈیرا لکھ میر خان کی آنکھوں میں منشی کی بات پر یکبارگی شکرے جیسی چمک عود کر آئی۔۔۔۔۔ وہ تصور ہی تصور میں اپنے سامنے نازک اندام اور معصوم اللہ رکھی کو سر جھکائے کھڑا دیکھ رہا تھا اور ایک جانب اسے ساون قرض کے بوجھ تلے ہاتھ جوڑے کھڑا نظر آ رہا تھا۔

☆=====☆=====☆

صبح میں چمکیلی دھوپ اتری ہوئی تھی چاچی عنایتاں کھری چار پائی پر بیٹھی دھوپ سینک رہی تھی۔ جبکہ اللہ رکھی صبح صادق ہی کھیت پر لا بھ کرنے جا چکی تھی۔ ہیرا اور سانولا

”اڑی بیٹھ تو..... تو خود اٹھنے سے لاچار ہے..... میں ہی بنا کر لاتی ہوں..... دودھ تو بے ناکھا.....“

”ہا..... ہے..... باورچی خانے میں.....“ عنایتاں اسے ممنونیت بھری نظروں سے نکتے ہوئے بولی۔

☆=====☆=====☆

دودا خان کو سوڈھل کے قتل کے جرم میں گوٹھ داد پور کے تھانہ لاک اپ ہوئے آج پورے پانچ روز ہو چکے تھے..... تھانہ انچارج انسپٹر ارشد لاشاری جواب مکمل طور پر وڈیرا لکھ میر خان کا زرخرید غلام بن چکا تھا۔ اب اسی کے ایماء پر وہ دودا خان پر باقاعدہ قتل کا مقدمہ چلانا چاہتا تھا جس کے لیے اس نے سب سے پہلے اسے شہر کی ڈسٹرکٹ جیل منتقل کرنے کا بندوبست کرنا شروع کیا۔ اس دوران علی بخش کی سر توڑ کوشش اور مٹھی گرم کرنے کی پالیسی نے بالآخر ایک دن اس کے باپ دودا خان سے ملاقات کروا ہی دی۔

”پٹ علی بخش..... اللہ رکھی کا سنگ میرے لئے اب غیرت کا مسئلہ بن چکا ہے اور تیرے لئے بھی عزت کا معاملہ ہے اب..... کیا تو چاہے گا کہ جس عورت کو تیرا باپ اپنی بیوی کی نظر سے دیکھ چکا ہے وہ کسی اور کی بیوی کہلائے.....؟“ ملاقات ہونے پر علی بخش کے باپ دودا خان نے بیٹے سے گھن گرج کے ساتھ کہا جس نے علی بخش کی رگ حمیت پھڑکا کے رکھ دی..... تاہم اس کے چہرے پر ایک جوش بھری گہری خاموش طاری رہی..... دودا خان بیٹے کو خاموش یا کر دوبارہ مگر قدرے ہولے سے بولا..... ”پٹ علی بخش..... یہ سلاخیں میرا کچھ نہیں لگاؤ ستیں مگر میں ابھی مجبور ہوں..... ورنہ اس چھوکرے ساون کو بھی سوڈھل کی طرح ختم کر چکا ہوتا..... بس ایک بار میں باہر آ جاؤں۔“

اس کی بات سن کر علی بخش بری طرح چونک گیا..... اس کا باپ علی الاعلان اس بات کا اعتراف کر رہا تھا کہ سوڈھل کو اس نے ہی جوش غیرت میں آکر قتل کر دیا تھا..... علی بخش کے اندر آندھیاں سی چلنے لگیں تاہم اس نے باپ سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی غیرت (اللہ رکھی) کو کسی اور کی عزت نہیں بنے دے گا۔ چاہے اس کا دوست ساون ہی کیوں نہ ہو۔

اس سے ایک سپاہی نے ڈنڈا فرش پر بجا کر ملاقات ختم ہونے کا اعلان کیا اور جب علی بخش باپ سے رخصت ہونے لگا تو دودا خان نے اس کے کان کے قریب منہ لا کر کہا کہ ہر جمعرات کی رات کو جب اس کے ہوٹل میں شراب کی خفیہ محفل لگتی ہے تو اس رات اس کا ایک جاننے والا شخص آتا ہے جو درحقیقت بدنام۔ اکو دھاڑیل کے نام سے جانا

جاتا ہے..... اسے میرے حال کی اطلاع کر دینا..... وہ ضرور ہمارے آڑے وقت میں کام آئے گا۔

علی بخش باپ سے وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا..... اب اچانک اسے یہ خبر ملی کہ اس کے باپ کے خلاف شہر کی عدالت میں باقاعدہ قتل کا مقدمہ چلنے والا ہے تو وہ ٹھنک گیا..... یہ خبر بھی اسے تھانے کے سپاہی نے مٹھی گرم ہونے پر دی تھی..... علی بخش کے دل و دماغ میں اب اپنے باپ دودا خان کی باتیں گردش کر رہی تھیں..... ”علی بخش..... اللہ رکھی..... تیرے باپ کے لیے غیرت بن چکی ہے اور تیری ماں کے برابر عزت بھی کیا تو چاہے گا کہ تیری ماں.....“

”نہیں..... میں خون کر دوں گا اس کا.....“ معاً یک دم علی بخش چلایا اور ہوٹل کے چند ملازم اس کی جانب دوڑے آئے کہ پتہ نہیں چھوٹے مالک کو اچانک کیا ہو گیا..... کیونکہ جس وقت علی بخش کے دل و دماغ میں خیالات کی یلغار ہو رہی تھی اس وقت وہ اپنے ہوٹل کے ”دھل“ پر موجود تھا..... علی بخش کو اب بے چینی سے کل کا انتظار تھا کیونکہ کل جمعرات تھی اور اس کے باپ کا خاص آدمی اکو دھاڑیل نامی شخص نے آنا تھا جس سے علی بخش نے اپنے باپ کی رہائی کے سلسلے میں مدد چاہنے تھی۔

بالآخر صدیوں پر محیط مذکورہ دن کی بھی رات آ گئی..... اس دن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا علی بخش کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ اس کے دو دن بعد اس کے باپ کو گوٹھ داد پور کے تھانے سے ڈسٹرکٹ جیل منتقل کر دیا جانا تھا جبکہ علی بخش اس سے پہلے اپنے باپ کے دوست اکو دھاڑیل سے مل کر کوئی ایسی حکمت عملی طے کرنا چاہتا تھا جس سے تھانہ ہی میں مک مکا ہو جائے اور اس کا باپ باعزت رہا ہو جائے۔

اس رات معمول کے مطابق دودا خان کے ہوٹل کی عقی کوٹھڑی میں کسی قسم کی ”محفل خاص“ نہیں ہو سکی تھی۔ وجہ ہوٹل کے مالک دودا خان کی گرفتاری تھی..... تاہم علی بخش رات گئے تک ہوٹل میں موجود رہا..... جب گوٹھ کے گلیارے اور شکستہ راستے ویران ہو کر دبیز کبر سے میں لپٹ گئے اور ہوٹل میں بھی برائے نام گا بک باقی رہ گئے تو اچانک دھل پر بیٹھے علی بخش کے کان میں ایک ملازم نے ہوٹل کی عقی کوٹھڑی میں ایک ”مہمان“ کی آمد کی اطلاع دی..... علی بخش کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا..... وہ حیران تھا کہ اس نے تو کسی کو بھی اپنے ہوٹل میں داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ بہر نوع..... وہ جلدی سے اٹھا اور کوٹھڑی کی جانب ہولیا..... اس نے اندازہ لگایا تھا کہ رات کی پراسرار اور تیرے تارکی میں آنے

عے.....؟“ علی بخش جیسے اپنے تئیں اندازہ لگاتے ہوئے اکودھاڑیل سے بولا۔  
 ”اگر اس کی ضرورت پڑی بھی تو تھانے کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں دریغ نہیں کروں گا..... مگر جب مکہ سے معاملہ حل ہو رہا ہے تو بلا وجہ خون خرابے سے کیا فائدہ جو ان۔“

علی بخش اس کی بات سن کر نہ صرف خوش ہو گیا تھا بلکہ اس سے خاصا متاثر بھی نظر آ رہا تھا..... اس نے دل میں سوچا ایسے ہوتے ہیں دوست..... جو اپنے دوستوں کے لیے بالا بالائی جان دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

”میں ابھی چلتا ہوں ذرا ٹکڑا ہوں اور تجھ سے صرف یہی کہنے آیا تھا کہ تو کسی قسم کی گڑتی نہ کر۔“ معا اکودھاڑیل نے رخصت ہونے کے لیے کھڑے ہوتے ہوئے کہا.....  
 ”کل تک میرا ساتھی پولیس تھانے سے رپورٹ لے کر آئے گا کہ انسپکٹر..... ارشد کتنے نکوں میں دودا خان کو رہا کرنے پر راضی ہوا ہے.....“

علی بخش اس کی بات سن کر مطمئن ہو گیا..... اکودھاڑیل نے ایک سیاہ موٹی چادر اپنے جسم کے گرد لپیٹی..... اجرک کا ڈھانٹا چہرے پر باندھا..... اور اپنی ہیوی مشین گن سنبھالتے ہوئے علی بخش کو تاکید آ بولا..... ”جوان! میں پھر کل اسی وقت آؤں گا..... میرا انتظار کرنا.....“ اتنا کہہ کر اکودھاڑیل وہاں سے چلا گیا۔

☆=====☆=====☆

اگلے دن حسب وعدہ پہررات میں اکودھاڑیل ہوٹل پہنچا..... علی بخش یہ دیکھ کر ٹھنک سا گیا کہ اکودھاڑیل کے ساتھ پندرہ بیس مسلح ساتھی بھی تھے اور وہ سب سیاہ رنگت کے اہل گھوڑوں پر سوار تھے..... وہ سب کے سب ہوٹل کی عقبی بلند دیوار کے ساتھ کھڑے دبیز کمر میں لپٹی ہوئی تاریکی ہی کا حصہ دکھائی دے رہے تھے..... ہوٹل اس وقت دیران تھا تھا کہ ملازمین بھی سب اپنے گھروں کو جا چکے تھے..... آج جاڑا بھی غضب کا اترا ہوا تھا ماحول میں غضب ناک سکوت سا طاری تھا..... آج لوگ باگ بھی وقت سے پہلے اپنے اپنے گھروں میں جا دیے تھے..... آج کی سناٹے دار رات جانے کیوں فیصلہ کن گھڑی کا پڑا خیمہ محسوس ہو رہی تھی..... اکودھاڑیل اپنے ساتھیوں کو باہر ہی کھڑا کر کے خود اندر دھڑکی میں در آیا۔ جدھر علی بخش سوالیہ نشان بنا اسی کا منتظر تھا۔

”اکو چا چا..... خیریت تو ہے.....؟“ علی اسے دیکھتے ہی استغناء منہ لہجے میں بولا۔  
 ”ہا..... خیر ہی ہے..... کل ہمارے ایک آدمی نے ہمیں آکر یہ خوشخبری دی ہے کہ

والا اکودھاڑیل کے سوا کون ہو سکتا تھا۔ علی بخش خود اعتمادی سے چلتا ہوا کونٹری میں داخل ہوا..... اندر بلب کی روشنی میں کچے فرش پر پچھی کچھی کی چٹائی پر ایک بھاری بھر کم شخص اجڑک کی بکلی سی مارے بیٹھا ہوا تھا..... اس کے قریب ہی ایک زوی ساخت کی ہیوی گن رکھی ہوئی تھی..... یہ صوبائی شہرت یافتہ ڈاکو اکو تھا۔ علی بخش کے باپ دودا خان نے اسے اس شخص سے ہی موجودہ حالات کے سلسلے میں تبادلہ خیالات کرنے کی تاکید کی تھی۔

”سائیں بسم اللہ میں علی بخش ہوں دودا خان کا پٹ.....“ علی بخش اس کے قریب کر بولا تو وہ چٹائی پر بیٹھا ہوا شخص اپنا چہرہ اوپر کر کے ایک لمحے علی بخش کو گھورنے کے سے انداز میں تنکے لگا..... اس کی تیز نگاہیں علی بخش کو اپنے وجود میں سرایت کرتی محسوس ہوئیں..... علی بخش نے اس کی گھورتی ہوئی آنکھوں میں جھانکا تو وہ اس قدر سرخ انگارہ ہو رہی تھیں جیسے اس نے بھنگ کا پورا کونڈا چڑھا رکھا ہو..... اسی وقت..... وہ شخص جو بلاشبہ اکودھاڑیل ہی تھا ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے دونوں بازو علی بخش سے معافتے کے لیے پھیلا دیے..... دونوں کے درمیان ایک گرم جوش معافتہ اور پھر مصافحہ ہوا۔ اس کے بعد رسمی گفتگو کے دوران جب علی بخش اسے اپنے باپ کے بارے میں بتانے لگا تو اکودھاڑیل ایک دم اپنی لھر کھراتی آواز میں علی بخش سے بولا۔

”مجھے سب معلوم ہے جوان..... ہم یاروں کے یار ہیں..... جنگلوں میں ضرور بے سرا کرتے ہیں لیکن اپنے یاروں کی بھی خبر رکھتے ہیں.....“  
 ”کیا..... اس کا مطلب ہے تم جانتے ہو کہ بابا جیل میں.....“ علی بخش نے دانہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو اکودھاڑیل جھٹ بولا۔

”ہاں..... مجھے نہ صرف معلوم ہے بلکہ میں نے دودا خان کو جیل سے رہا کرانے بھی بندوبست کر لیا ہے.....“

”کک..... کیا..... تم صحیح کہہ رہے ہو اکو چا چا.....“ علی بخش نے مسرت آمیز جیر سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پہلی بار اسے ”اکو چا چا“ پکارتے ہوئے کہا اور اکودھاڑیل علی بخش کو خوشی سے محظوظ ہوتے ہوئے دیکھ کر اس کے کاندھے پر اپنا بھاری بھر کم ہاتھ ڈکڑا کر بولا۔

”ہاں..... جوان..... تو گڑتی نہ کر اب..... کل تک تیرا پیو (باپ) اور ہمارا پیو خان جیل کی سلاخوں سے باہر ہو گا.....“  
 ”مگر چا چا..... کس طرح؟ کیا تم اپنے ساتھیوں سمیت تھانے میں بلے

پھر وہ نور اعلیٰ کوٹھڑی کے پرلے دروازے سے باہر تاریکی میں آگیا جہاں خنک سی چاندنی طلسم بکھیرے ہوئے تھی..... سامنے اکودھاڑیل اپنے سیاہ پوش ساتھیوں کے ہمراہ گھوڑے دوڑاتا ہوا اس کے قریب آگیا..... علی بخش نے ہلکی ہوئی نگاہوں سے گھوڑے پر بیٹھے اکودھاڑیل کو دیکھا تو بری طرح اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا..... اکودھاڑیل کی سرخ انگارہ آنکھیں بھیجی ہوئی تھیں..... اس کے ساتھ ایک گھوڑے کی کمر پر کسی کی خون میں لت پت لاش اوندھی دھری ہوئی تھی جس کی باگیں اکو نے تھام رکھی تھیں..... علی بخش کی سنائے دار نگاہیں گھوڑے پر دھری خون آلود لاش پر جم سی گئیں۔

”علی بخش..... ہمارے ساتھ دھوکا ہو گیا ہے۔ پولیس نے تیرے پیو دودا خان کو گولی مار دی ہے۔“ رات کے گمان آمیز سنائے میں اکودھاڑیل کی غم اور رقت میں ڈوبی ہوئی آواز نے ایک ٹک کھڑے علی بخش کی سماعتوں کو چیر کر رکھ دیا اور علی بخش بے اختیار دوڑ کر گھوڑے کی پیٹھ پر دھرے اپنے باپ کے خون میں لت پت وجود سے لپٹ گیا اور غم و اندوہ کے شدید احساس سے مغلوب ہو کر اس نے اپنے باپ کی لاش کو چمٹانے کے لیے کھینچا تو دودا خان کی لاش کے غیر معمولی وزن نے اس کے قدم یکدم ڈگمگا دیئے اور علی بخش، باپ کے جسد خاکی سمیت بھر بھری زمین پر آ رہا۔ علی بخش کے کپڑے بھی باپ کے خون سے رنگ چکے تھے۔ وہ اب بھی اپنے باپ کی لاش سے چمٹا ہوا تھا۔ شدید اور اچانک غم ناگہاں کے باعث اس کی آنکھیں پھیل سی گئی تھیں اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ ہونٹوں پر ایک غم آمیز ارتعاش نمایاں تھا وہ اب زمین پر اکڑوں بیٹھا باپ کا سر اپنے خون آلود زانوؤں پر رکھے ایک ٹک دکھ بھری نظروں سے باپ کے مردہ چہرے کو تنکے جارہا تھا۔ پھر معاً چند ثانیے بعد اس کا غم آمیز سکتہ ٹوٹا۔

”بابا سائیں یہ کیا ہو گیا؟ آنکھیں کھولو بابا اپنی..... میرا کون ہے تیرے سوا؟ بابا اللہ کے واسطے کچھ تو بول۔ بابا..... بابا۔“ علی بخش ایک دم زار و قطار رونے لگا۔ اس کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ اٹھائے راہ شکست خوردہ سا اکودھاڑیل اپنے گھوڑے سے نیچے اترا، علی بخش کے قریب آیا اور اس کے کاندھے پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے ازراہ شفقی بولا۔

”جوان داپٹ..... خود کو سنبھال، حوصلہ رکھ بابا۔“ اکودھاڑیل مزید کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکا۔ وہ خود شرمسار تھا۔ علی بخش اب گھٹے گھٹے انداز میں سسک رہا تھا غمناک رات دبے پاؤں سرک رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

انسپکٹر ارشد دودا خان کو روکڑ (رشوت) کے عوض چھوڑنے پر رضامند ہو گیا ہے..... مگر چونکہ دودا خان ایک قتل جیسی سنگین واردات میں ملوث ہے لہذا اس کو آسانی سے رہا کر دینا لوگوں کو اور خود متعلقہ محکمہ پولیس کو شک میں مبتلا کر سکتا ہے..... اس لیے اب انہوں (پولیس والوں) نے ہمیں پیغام دیا ہے کہ ہم پہلے اپنے کچھ مسلح ساتھیوں کے ہمراہ تھانے کی غمارت میں بلہ بول دیں پھر شخص دکھاوے کے لیے ہمارا پولیس مقابلہ ہوگا پھر اسی ہنگامے کے دوران درون خانہ یعنی تمہارے باپ کو ہمارے حوالے کر دیا جائے گا.....“ اکودھاڑیل نے ایک تقاضا آمیز مسکراہٹ کے ساتھ علی بخش کو تفصیل بتائی مگر جانے کیوں علی بخش کو پھر بھی تسلی محسوس نہ ہوئی کہ یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو جائے گا..... تاہم وہ جلدی سے بولا۔

”اکو چا چا..... کیا میرا پیو رہا ہو جانے کے بعد..... میرا مطلب ہے کہ اس طرح جھوٹ موٹ کے فرار کے بعد کیا وہ ایک مفرو کی حیثیت سے ساری زندگی گزارے گا؟“ اس کی بات سن کر اکودھاڑیل بولا..... ”اڑے نہیں جوان.....! یہ تو تیرے باپ کو جیل سے رہا کرنے کا ایک بہانہ ہوگا اسے تو خود پولیس فرار کرائے گی..... ہمارا تو شخص یہ نام ہوگا کہ ڈاکو دودا خان کو چھڑا کر لے گئے..... لہذا پھر بعد میں خود ہی پولیس بھی اس کیس کو دبا دے گی..... ویسے کچھ روز تو تیرے پیو دودا خان کو روپوشی کے گزارنے ہی ہوں گے..... اچھا میں اب چلتا ہوں مرشد خیر کرے..... اور ہاں..... وہ جاتے جاتے رکا.....“

”تو ادھر ہی موجود رہنا ہم تیری تسلی کی خاطر تیرے پیو دودا خان کو سب سے پہلے یہاں لے کر آئیں گے تاکہ تم دونوں مل لو ایک دوسرے سے.....“ اتنا کہہ کر اکودھاڑیل وہاں سے چلا گیا۔

علی بخش دم بخود سا کھڑا رہ گیا۔ جانے کیوں اتنی تسلی کے باوجود اس کا دل کسی انجانے خطرے کے مارے بری طرح دھڑکے جارہا تھا۔ وہ بار بار خود سے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سوال کر رہا تھا کہ کیا یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو جائے گا..... جس طرح اکو چا چا نے اسے بتایا تھا.....؟ وہ وہیں چٹائی پر بیٹھ گیا..... ہوٹل کا راز داں اکلوتا ملازم خیرد..... اس کے لیے چائے بنا لایا..... جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا..... علی بخش کے اعصاب و سوسوں کے زیر اثر شل سے ہو رہے تھے..... کہرے میں لپٹی دبیز اور سنائے دار رات بھاری سل کی طرح سرک رہی تھی۔

اکو ساڑیل کو گئے کافی دیر ہو چکی تھی..... باہر ہر سوسنائے کا راج تھا کہ اچانک علی بخش کو کہیں دو..... سے بگٹتے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور علی بخش ٹپک پٹپٹ

ایک دن خیراں کے بھائیوں میں سے ایک دوست محمد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ تو اس کے دوسرے بھائی محمد علی نے بھی بہن کو اکساتے ہوئے کہا۔

”بلکہ ادی میں تو کہتا ہوں کہ یہ گھر اور ہوٹل کو فروخت کر کے اپنے گوٹھ ہی آ جاؤ۔ وہاں کم از کم ہم تیرے اپنے تو ہیں نا۔ ہم ہیں، ماں پو ہیں تیرے۔ ادا دودا خان تھا تو ہمیں تیری اتنی گڑنی (فکر) نہ ہوتی پر اب۔“ اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو خیراں کچھ سوچتی ہوئی نگاہوں سے اپنے دونوں بھائیوں کی جانب باری باری دیکھتے ہوئے بولی۔

”ادا..... چاہتی تو میں بھی یہی ہوں۔ پر علی بخش۔“ اپنے سوتیلے بیٹے کے نام پر وہ یکدم چپ ہو رہی تو اس کے قریب بیٹھے محرم علی نے جھٹ کہا جو خود بھی اپنے دونوں ماموں کی بات سے متفق تھا۔

”امز..... بھلا علی بخش کون ہوتا ہے ہمیں روکنے والا۔“ وہ شاید اپنی ماں کے ادھورے جملے کا مطلب جان گیا تھا۔

”ہم کوشش کریں گے اسے بھی منانے کی۔“ دوست محمد بولا۔ ”اور اسے ہماری بات مانی پڑے گی۔ آخر کو تو بھی اس کی ماں لگتی ہے اس واسطے ہم بھی اس کے بڑے لگتے ہیں۔ بھلے سوتیلے سہی۔“ دوسرے بھائی محمد علی نے کہا۔

”لیکن ہم اس کے ساتھ زبردستی بھی نہیں کر سکتے۔ اگر وہ اڑ گیا تو۔“

”تو ہم بھی اس سے نمٹ لیں گے اچھی طرح۔“ معا خیراں کے بھائی دوست محمد نے اپنی بہن کی بات کاٹتے ہوئے سخت لہجے میں کہا وہ اس کا بڑا بھائی تھا جبکہ محمد علی خیراں سے چھوٹا تھا۔ دوست محمد کی بات پر محمد علی اور محرم علی اس کی بات پر اپنا سراسر اثبات میں ہلانے لگے۔

ابھی یہ باتیں جاری تھیں کہ معا علی بخش اندر داخل ہوا۔ وہ سب اسے دیکھ کر بری طرح ٹھٹکے تھے۔ انہیں یوں لگا جیسے علی بخش نے ان کی باتیں سن لی ہوں۔ علی بخش کے کاندھوں پر کلہاڑی نکی ہوئی تھی اور وہ نہنگ کے چوڑے درخت کی طرح تنا کھڑا انہیں عجیب سی نظروں سے گھورنے لگا۔

☆=====☆=====☆

دودا خان کی موت پر ساون کو محض اس حد تک دکھ ہوا تھا کہ وہ اپنے گوٹھ کا آدمی تھا بے شک وہ ناپسندیدہ اور متنازع شخصیت تھا مگر انسانیت کے ناتے بہر طور ساون کو اس کی موت پر افسوس ہوا تھا۔ اب ساون نے جلد سے جلد اللہ رکھی کو حاصل کرنے کی اپنی کوششیں

پہلے سوڈھل اور پھر اب دودا خان کی اچانک تلے اوپر اموات نے پورے گوٹھ داد پور کے سادہ لوح اور معصوم بایسوں کو ایک بے نام سی سراسیمگی میں مبتلا کر دیا تھا۔ دودا خان کو اگرچہ دنیا یا چاکا تھا مگر اس کے گھر والوں نے ابھی اسے اپنے سینوں میں دفن نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی موت کے کئی روز بعد تک افراد خانہ ایک کہرام کی زد میں تھے۔ دودا خان کی موت سے متعلق یہ خبر زبان زد عام ہو چکی تھی کہ اس کے کچھ جرائم پیشہ مسلح ساتھیوں نے دودا خان کو پولیس کی قید سے چھڑانے کی غرض سے تھانے کی عمارت پر حملہ کیا اور پھر دوران پولیس مقابلہ دودا خان پولیس کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ دودا خان چونکہ ایک مجرم کی حیثیت سے ہلاک ہوا تھا لہذا اس بات کے منفی اثرات اس کی بیوی خیراں اور بیٹے محرم علی پر بھی پڑے۔ جبکہ علی بخش نے یہ موقف اختیار کر رکھا تھا کہ اس کے باپ دودا خان کو پولیس نے پہلے سوڈھل کے قتل کے جھوٹے الزام میں گرفتار کیا اور پھر بعد میں ایک سازش کے تحت جھوٹا ”مقابلہ“ دکھا کر اسے قتل کر ڈالا۔ مگر امر واقعہ یہ تھا کہ دودا خان مکافات عمل کے تحت خود ہی اپنے کئے کی سزا بھگت کر رہی عدم ہوا تھا اور حالات و شواہد کو مد نگاہ رکھتے ہوئے گوٹھ کے عوام یہی قیاس آرائی کر رہے تھے کہ دودا خان نے واقعی سوڈھل کا قتل کیا یا کروایا تھا۔ جس کا اہم ”محرم“ سوڈھل کی بھتیجی اللہ رکھی تھی اور جس سے دودا خان شادی کا اس حد تک خواہشمند تھا کہ اس نے بعد میں اسے اپنی والدہ اور غیرت کا مسئلہ بنا ڈالا تھا۔ انہی ”چہ میگوئیوں“ کو ہوا دینے والے بھی بہت سے افراد تھے جن میں منشی میرل کے بھی آدمی شامل تھے۔ بہر طور اب بعض لوگوں کا خیال یہی تھا کہ دودا خان کی موت کے بعد اب یہ ”قضیہ“ نمٹ چکا تھا مگر ایسا تھا نہیں۔ دودا خان مرتے مرتے بھی اپنی غیرت اور ضد کو گویا ایک وصیت آمیز قسم کی صورت میں اپنے بڑے بیٹے علی بخش کے سینے میں منتقل کر گیا تھا اور یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا سوائے خود علی بخش کے۔ انہی سماجی منفی رویوں نے جہاں اس کی سوتیلی ماں خیراں اور اس کے بیٹے محرم علی کو پورے گوٹھ میں خفیف سا کر کے رکھ دیا تھا وہاں معصوم اللہ رکھی کو بھی لوگوں سے نظریں چرانے اور کتراتے پر مجبور کر ڈالا تھا۔ سوڈھل اور دودا خان کے بیچ وجہ فساد اس کو گردانا جا رہا تھا۔ خیراں اور محرم علی تو اب یہ گوٹھ چھوڑنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگے تھے اور دوسرے گوٹھ جہاں خیراں کا میکہ تھا ہجرت کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مزید برآں ان کی مبینہ سوچ کو ہمیز کرنے والے خیراں کے دونوں بھائی دوست محمد اور محمد علی سرفہرست تھے۔

”ادی خیراں، ہمارا خیال ہے کہ اب تم لوگوں کا اس گوٹھ میں رہنا مناسب نہیں۔“

نے محسوس کیا کہ جوابا اس کی ماں کی کوئی آواز نہیں ابھری تھی وہ غالباً خاموش تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ساون کو دوبارہ اپنے باپ کی آواز سنائی دی اس بار وہ قدرے غصیلے لہجے میں اس کی ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”تو بات نہیں کرتی تو میں آپے ہی بات کر لوں گا اس سے۔ میرے خیال میں وہ اندر ہی کوٹھڑی میں ہے۔“

ساون کا دماغ شل سا ہونے لگا۔

”ڑے چھوڑا..... باہر آ بات کرنی ہے تیرے ساتھ۔“ معا ساون کو پھر باپ کی تیز آواز سنائی دی اس نے باہر ہی بیٹھے بیٹھے اسے پکارا تھا۔ تب ساون کو اپنی ماں کی بھی آواز آئی۔ وہ اس کے باپ سے مخاطب تھی۔

”ذرا مٹھ کر۔ ساون کے پیو۔ آپڑاں پٹ ہے..... تو..... تو اسے۔“

”چنگا چنگا تو بند کر اپنی بکواس.....“ موگو نے اپنی بیوی کی بات کا نٹے ہوئے غصیلے لہجے میں اسے ٹوکا۔ ساون کے لیے اب اندر ٹھہرے رہنا محال ہونے لگا اور وہ باہر صحن میں آ گیا۔ جہاں ایک کھری چار پائی پر اس کا باپ موگو براجمان تھا۔ اس کی چار پائی کے قریب ساون کی ماں اور بہن ہدایتاں کچھ اس انداز میں مبتلائے اضطراب کھڑی تھیں جیسے ابھی دونوں باپ بیٹے کے بیچ کوئی جھگڑا ہونے والا ہو اور وہ دونوں درمیان میں کودنے کے لیے تیار ہوں۔

”ہاں بابا..... ساون..... کیا کہتا ہے پھر تو۔ تیرے چاچے پر مل کو کیا جواب دوں میں۔“ ساون کو دیکھتے ہی موگو نے پوچھا۔ انداز ایسا تھا جیسے ابھی ساون نے اس کی مرضی کے خلاف اپنے منہ سے کوئی لفظ نکالا تو وہ اس پر چڑھ دوڑے گا۔ ساون نے ایک نگاہ باپ کے چہرے پر ڈالی۔ پھر اسے جھکا کر اعتماد سے بولا۔ ”بابا..... میں اپنی مرضی کہہ چکا ہوں۔ میں اگر شادی کروں گا تو صرف اللہ رکھی.....“

”ہونہ..... اللہ رکھی..... اللہ رکھی..... کیا دیکھا ہے اس چھو کری میں۔“ موگو جیسے ادھار کھائے بیٹھا تھا وہ بیٹے کی بات کا ٹکڑا کر تضحیک آمیز لہجے میں بولا۔ ”تجھے پتہ ہے وہ چھو کری منحوس ہے۔ جس کے پیچھے دو قتل ہو گئے۔ گوٹھ کے سارے لوگ اسے کیا سمجھنے لگے ہیں جانتا ہے تو..... نہ جانے اور کتنوں کو اس نے اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔“

”بابا۔“ ساون اتنی زور سے چلایا کہ اس کا باپ ایک لمحے کو یک ٹک اسے تکتا رہ گیا۔ ساون کی تیز نگاہیں باپ کے دم بخود چہرے پر جم سی گئی تھیں۔ مگر پھر اگلے ہی لمحے جیسے ساون خفت محسوس کرنے لگا اور پھر جب اپنا پاؤں پختا ہوا باہر جانے کے لیے.....

تیز کر دی تھیں، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ وہ دو داخان سے ڈرتا تھا اور اب اس کے مرتے ہی اس نے اللہ رکھی کو حاصل کرنے کی کوشش تیز کر دی تھی بلکہ وہ تو دو داخان کے روبرو ہو کر اسے لگا کر کرتا تھا لیکن اللہ رکھی کے خیال سے وہ خاموش رہتا تھا۔ مگر اب ان سب باتوں کے باوجود ساون کو پھر بھی اللہ رکھی کا حصول اتنا سہل نظر نہیں آ رہا تھا جتنا کہ وہ سمجھ رہا تھا کیونکہ وہ اس معاملے میں اپنے باپ موگو کو قائل نہیں کر سکا تھا جو اس کا اور اس کی بہن ہدایتاں کا رشتہ اپنے بھائی پر مل کی خواہش کے مطابق اس کے دونوں بچوں سونڈھ اور گل سے کرنے پر بضد تھا۔ لہذا جب ساون نے اپنی ماں سے اللہ رکھی کے ہاں جانے پر دوبارہ اصرار کیا تو وہ بیچاری دل مسوس کر بولی۔

”پٹ ساون! تو اللہ رکھی کا خیال دل سے نکال کیوں نہیں دیتا۔“

ماں کی بات سن کر ساون پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا جانے کیوں ماں کا چہرہ دیکھ کر اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ یہ جانتی ہو کہ اس کے شوہر موگو کی ضد یا اٹل فیصلے کے سامنے اس کے بیٹے ساون کی مرضی کی کوئی حیثیت نہیں اور وہ یہ تلخ حقیقت ساون کو بھی گوش گزار کر دینا چاہتی تھی۔

”امڑ! یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔ کیا تو یہ چاہتی ہے کہ میں کبھی گھات کی طرح نظر نہ آؤں..... اور بھنبھور کے جیل بھٹ (ریت کے ٹیلے) میں کھو جاؤں۔“ ساون نے طس کر ماں سے کہا تو وہ بیچاری دہل سی گئی۔

اس وقت چمیلی دو پہر ڈھل رہی تھی اور ٹھنھرتی ہوئی شام اپنے رخ بستہ پر تولنے کو تھی۔ ”پٹ ساون! میں جانتی ہوں تیرا بیو نہیں مانے گا۔ وہ اپنی ہٹ کا پکا ہے۔“

”امڑ! پھر میں کیا کروں؟ تو پھر پیو کو بتا دے کہ میں اللہ رکھی کے سوا کسی سے شادی نہیں کروں گا۔“

اس اثناء میں موگو بھی تھکا ہارا گھر میں داخل ہوا۔ اس کے باہر صحن میں کھانسنے کی آواز ابھری تھی۔ ساون کی ماں فوراً کوٹھڑی سے نکل گئی ساون اندر ہی ٹھہرا رہا۔ وہ ابھی باپ کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے صحن میں سے باپ کی گونجی سی آواز سنائی دی وہ اس کی ماں سے مخاطب تھا۔ ”ڑی ساون کی ماں! کیا کہتا ہے پھر تیرا پٹ۔ میں نے اپنے پر مل کو آج جواب دینا ہے۔“ باپ کے گفتگو کرنے کی آواز ساون کو صاف سنائی دے رہی تھی جسے سن کر اس کے چہرے پر قدرے ناگواری کے تاثرات عود کر آئے تھے اور وہ غصے سے سوچنے لگا کہ آخر اس کا باپ اس پر کیوں اپنی مرضی مسلط کرنا چاہتا ہے۔ اس

باپ کی چار پائی کے قریب سے گزرنے لگا تو اسے اپنے باپ کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔  
وہ اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”گھر واپس لوٹنے سے پہلے تجھے ایک فیصلہ کرنا ہوگا اگر تجھے میری بات قبول نہیں تو  
تو بھی مجھے قبول نہیں۔“ باپ کی دھمکی نے ساون کو مزید خود سرکش بنا دیا۔ لہذا وہ بغیر  
رکے دانت پیتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ صحن میں غصے سے کانپتے ہوئے موگو کی چار پائی کے  
قریب سہی کھڑی ہاں بیٹیوں کے چہروں پر مردنی سی چھاتی چلی گئی۔

☆=====☆=====☆

بالآخر ڈرتے اور جھجکتے ہوئے چاچی عنایتاں مائی عجیباں کے ساتھ اپنی بیل گاڑی  
میں سوار ہو کر خیراں کے ہاں پہنچیں۔ اس وقت اتفاق سے وہ گھر پر تنہا موجود تھی۔ بعد  
تبادلہ رسمی کلمات کے چاچی عنایتاں تیس ہزار کی رقم کی پوٹلی دودا خان کی بیوہ خیراں کو  
لوٹاتے ہوئے بولی۔ ”میں اللہ رکھی کی چاچی ہوں دودا خان نے یہ رقم میرے مڑس سوڈھل  
کو اللہ رکھی کے سنگ کے واسطے اسے دی تھی۔ رب سائیں دونوں کو جنت نصیب کرے  
اب وہ دونوں نہیں رہے اس دنیا میں۔ مگر تیرے مڑس دودا خان کی رقم میرے پاس امانت  
کے طور پر تھی جو اب میں تمہیں لوٹا رہی ہوں۔ پورے تیس ہزار ہیں۔“

خیراں کے چہرے پر اس کی بات پر عجیب سے تاثرات ابھرے، پھر روپوں کی پوٹلی  
کی جانب دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک رنگ سا گزرا اور اگلے ہی لمحے خیراں نے  
بھیدوں بھری خاموشی کے ساتھ عنایتاں کے ہاتھ سے روپوں کی پوٹلی لے لی۔

”ادی ماں واری! گن لو تو چنگلی بات ہے۔“ عنایتاں رساں سے بولی تو جواباً خیراں  
بولی۔

”ادی! آج کے دور میں اس طرح کون روپے لوٹاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ  
پورے ہوں گے۔“

”بس ادی! تو نے یہ روپے لے کر میرے سر سے بار اتار دیا۔ اب چلتی ہوں۔“  
عنایتاں طمانیت بھرے لہجے میں بولی اور چار پائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اڑی ادی بیٹھو ذرا پانی ٹکرتو کھاؤ۔“ خیراں بولی۔ مگر چاچی عنایتاں نے معذرت  
کی اور مائی عجیباں کے ساتھ گھر سے باہر آ گئی۔ جدھر اس کی بیل گاڑی کھڑی تھی اس میں  
اللہ رکھی کے دونوں بیل ہیرا اور سانولا جتے ہوئے تھے۔ چاچی عنایتاں نے چابک کے طور  
پر باریک سی درخت کی شاخ تھام رکھی تھی۔ وہ خود ہی بیل گاڑی چلاتی ہوئی یہاں تک پہنچی

تھی۔

گزر رہا تھا وقت سہ پہر میں داخل ہو رہا تھا معاً سامنے گلی میں علی بخش نمودار ہوا۔ وہ  
ادھر ہی آرہا تھا۔ چاچی عنایتاں اور علی بخش دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ علی  
بخش قریب آیا۔ ایک اچنتی سی نگاہ بیل گاڑی پر بیٹھی دونوں عورتوں کی جانب ڈالی اور پھر  
اپنے گھر کا ٹاٹ اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ صحن میں کچھی چار پائی پر بیٹھی خیراں روپوں کی پوٹلی  
اپنی گود میں پھیلائے نوٹ گن رہی تھی۔ علی بخش کو دیکھتے ہی جلدی سے اس نے وہ پوٹلی  
لیٹ لی اور اپنی اجرک والی چادر کے اندر چھپالی۔ علی بخش کی تیز نظروں نے فوراً بھانپ لیا  
کہ اس کی سوتیلی ماں نے کچھ چھپانے کی کوشش کی ہے۔ تاہم وہ اس کی اس مشکوک حرکت  
کو خاطر میں لائے بغیر اپنے کمرے میں آ گیا۔ یہاں آ کر وہ اپنی چار پائی پر نیم دراز ہو کر  
سوچنے لگا کہ آخر وہ دروازے پر موجود دو بوڑھی عورتیں کون تھیں؟ علی بخش نے چونکہ اپنی  
ماں کے ہاتھ میں نوٹوں کی پوٹلی دیکھ لی تھی جو اس نے اپنی چادر کے اندر جلدی سے چھپالی  
تھی۔ لہذا اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ روپوں کی اس بھاری پوٹلی کا تعلق ان دونوں اجنبی  
بوڑھی عورتوں کے ساتھ تھا۔ حالات نے اسے بچپن سے ہی زود فہم بنایا ہوا تھا لہذا ایک  
خیال جھماکے سے اس کے دماغ میں ابھرا اور پھر وہ جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے سے باہر  
نکل آیا۔ اب صحن میں کچھی چار پائی پر اس کی ماں خیراں موجود نہ تھی۔ شاید وہ دوسرے  
کمرے میں جا چکی تھی۔ علی بخش فوراً گھر سے باہر نکلا اور بیل گاڑی کے پیہوں کے نشانات  
دیکھتا آگے بڑھنے لگا۔ ذرا ہی دور اسے وہ بیل گاڑی نظر آ گئی۔ بیل گاڑی درمیانی رفتار  
سے دوڑی چلی جا رہی تھی اور علی بخش بھی محتاط روی سے تعاقب میں تھا۔ ذرا دیر بعد جب  
بیل گاڑی ایک گھر کے دروازے پر کی تو علی بخش ٹھٹکا وہ سوڈھل کا گھر تھا۔ جس سے وہ  
اچھی طرح واقف تھا۔ اب اس کا خیال جو شک کا مرہون منت تھا یقین میں بدلنے لگا۔  
تاہم وہ خاموشی سے واپس اپنے گھر کی جانب ہولیا۔ وہ دوبارہ اپنے گھر میں داخل ہوا۔  
آج اسے اپنی ماں کی آنکھوں میں ایک چور سا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے صاف اس بات کا  
احساس ہو چلا تھا کہ اس کی ماں اس سے کچھ چھپا رہی ہے۔ علی بخش اپنے کمرے میں آ کر  
کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔

☆=====☆=====☆

صبح کا وقت تھا۔ آج اللہ رکھی کھیتوں میں نہیں گئی تھی اسی لئے گھر میں موجود تھی۔  
حسب معمولی چاچی عنایتاں صحن میں بیٹھی دھوپ کے قدرتی وٹامن ڈی سے اپنی جان

گوٹھ میں کروں یا گوٹھ سے باہر، تو کون ہوتا ہے ہم پر اپنی مرضی جمانے والا۔“ چاچی عنایتاں اس بار پوری طرح جوش میں آگئی تھی۔

اللہ رکھی ایک جانب پریشان سی کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اسے بھی علی بخش پر غصہ آ رہا تھا جو خواہ مخواہ اپنی ہٹ دھرمی دکھا رہا تھا۔ علی بخش کی آنکھوں میں چاچی عنایتاں کی تیز و تند گفتگو پر معاندانہ سی چمک لہرائی پھر اسی لہجے میں دوبارہ بولا۔ ”ماسی! تیری دھی اللہ رکھی میرے پودودا خان کی منگ تھی۔ کیونکہ تیرے مڑن سوڈھل نے اللہ رکھی کو میرے پیو کے نام کر دیا تھا۔“

”تو یہاں سے چلا جا چھو کر..... یہ مت سمجھنا کہ یہاں کوئی مرد نہیں اور ہم زنانیاں اکیلی ہیں، سمجھ گیا۔ آپڑیں وڈوں کو ادھر لا.....“ چاچی عنایتاں کا غصہ اب آسمان کو چھونے لگا تھا اور وہ بھری ہوئی نگاہوں سے علی بخش کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ اب چار پائی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ علی بخش نے زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا اور ایک بار پھر چاچی عنایتاں اور اللہ رکھی کو گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہوا پاؤں پٹخ کر وہاں سے چلا گیا اور قریب کھڑی اللہ رکھی نے علی بخش کے جاتے ہی اپنے منہ سے ”ہونہہ“ کیا اور آگے بڑھ کر دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔

☆=====☆=====☆

ان دنوں خیراں کی شادی شدہ بیٹی اور محرم علی کی بڑی بہن شمع اپنے میکے آئی ہوئی تھی۔ اس کی گود میں اس کا ننھا منا بیٹا بھی تھا اور اس کا ایک ماموں دوست محمد بھی آیا ہوا تھا۔ ان تینوں نے محرم علی کے رشتے کے سلسلے میں پرل کے ہاں جانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا، وہ سورٹھ کا رشتہ لینے جا رہے تھے۔ یہ پرل ساون کا چاچا تھا۔ جس کی جوان بیٹی سورٹھ سے محرم علی بیاہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ لوگ زور و شور کے ساتھ خوشی خوشی تیاریوں میں مشغول تھے۔ صحن میں کچھ پھول اور مٹھائیوں کی ٹوکریاں بھی بندھی پڑی تھیں جو ان لوگوں نے پرل کے ہاں لے جانی تھیں۔ اس وقت علی بخش بھی گھر میں موجود تھا اور انہیں دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔ اپنے باپ دودا خان کی موت کے بعد سے وہ اب خود کو اس گھر میں اس قدر تنہا محسوس کرنے لگا تھا کہ اسے بعض مرتبہ یہاں گھٹن سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ دودا خان اس گھر کا سربراہ تھا۔ اگرچہ اس کی زندگی میں بھی علی بخش اپنی سوتیلی ماں کی طرف سے بے اعتنائی کا شکار رہتا تھا مگر اب اس کی موت کے بعد سے تو جیسے اس گھر میں اس کی حیثیت عضو معطل کی سی ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ علی بخش کی جب اپنے سوتیلے بھائی محرم علی

استخواں کو مستفید کر رہی تھی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

”کون ہے؟“ اللہ رکھی اس وقت دروازے کے قریب ہی موجود تھی۔ جدھر وہ پیال کی ڈھیری اکٹھی کر رہی تھی۔ تب جواباً باہر سے کسی اجنبی کی آواز آئی۔

”میں علی بخش ہوں۔ دودا خان مرحوم کا وڈا پٹ۔“ یہ سن کر اللہ رکھی سامنے بیٹھی اپنی چاچی عنایتاں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ چاچی عنایتاں نے فوراً اللہ رکھی کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ متذنب کھڑی اللہ رکھی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے اسے ایک لمبا سا لڑکا کھڑا دکھائی دیا جو سپاٹ سی نظریں جمائے اللہ رکھی کی جانب گھور رہا تھا۔ یہ علی بخش تھا۔

”دھینے! اس کو اندر ہی بلا لے آپڑاں ہی بچہ ہے..... آ جا پٹ علی۔“ چاچی عنایتاں نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اللہ رکھی اور پھر علی بخش کو بیک وقت مخاطب کرتے ہوئے قدرے اپنائیت سے کہا تو علی بخش اللہ رکھی پر نظریں جمائے جمائے اندر آ گیا۔ اللہ رکھی کو اس کا یہ انداز ذرا نہیں بھایا تھا تاہم وہ ایک طرف ہو چکی تھی اسے علی بخش کے چہرے پر دودا خان کی شبیہ نظر آ رہی تھی جو اسے کافی ناگوار گزرتی تھی وہ اس کی اچانک آمد پر کچھ الجھن آمیز پریشانی میں بھی مبتلا ہونے لگی تھی۔

علی بخش نے عنایتاں کے قریب جا کر اسے سرسری انداز میں سلام کیا پھر پوچھا۔

”کیا تو نے میری سوتیلی ماں خیراں کو کوئی رقم دی ہے۔“ لہجہ حد درجہ اکھڑتا چاچی عنایتاں ایک ٹک اس کا چہرہ بے تکلف لگی۔ پھر چونکی اور اٹکتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”ہاں..... ہاں میں نے خیراں کو پورے تیس ہزار روپے لوٹا دیئے ہیں جو دودا خان نے اللہ رکھی کے سنگ کے لیے میرے مڑن سوڈھل کو دیئے تھے۔“

”ٹھیک ہے پھر تجھے اب اللہ رکھی کا سنگ..... میرا مطلب ہے اس کی شادی گوٹھ کے باہر کرنی ہوگی۔ میرا مطلب تو سمجھ رہی ہے نا کراڑی (بوڑھی)۔“ علی بخش نے قدرے بدتمیزی سے کہا تب چاچی عنایتاں کو بھی غصہ آ گیا۔ وہ بھی تیز لہجے میں اسے سرزنش کرتے ہوئے بولی۔

”تجھے شرم آنی چاہئے چھورا (لڑکے) میں تیری ماں جیسی ہوں۔“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے ماسی۔“ علی بخش نے جواب طلب لہجے میں کہا۔

اس کے لہجے میں درشتگی برقرار تھی۔

”تو سن لے پھر اللہ رکھی میری دھی ہے اور یہ میری مرضی ہے کہ میں اس کا بیاہ اس



سے گرم گرمی ہونے لگتی تھی تو سب مل کر اسے کھانے کو دوڑتے تھے اور ان میں سرفہرست محرم علی کے دونوں ماموں دوست محمد اور محمد علی ہوتے تھے۔ جو اپنے بہنوئی دودا خان کی موت کے بعد سے بہن کے گھر کچھ زیادہ ہی آنے لگے تھے۔

اس وقت یہ لوگ دوپہر کے کھانے وغیرہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ علی بخش اپنی کوٹھڑی میں چار پائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کا دماغ یہ سوچ سوچ کر شل ہو رہا تھا کہ وہ اپنی ماں خیراں سے پوچھے کہ اس نے اللہ رکھی کی چاچی عنایتاں سے پیسے واپس لے کر رکھ لئے اور اسے بتایا بھی نہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ بہر طور اور تو اسے کچھ نہ سوجھا۔ بس وہ اٹھا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

”ہونہہ..... جب دیکھو غصے میں بھرا رہتا ہے پتہ نہیں کس بات کی اسے گرمی چڑھی رہتی ہے۔“ علی بخش کے گھر سے نکلتے ہی اس کی سوتیلی ماں خیراں نے تضحیک آمیز لہجے میں منہ بسورتے ہوئے کہا تو پاس کھڑا اس کا چیتا بھائی دوست محمد بھی ”بہن“ کی چالپوسی کرتے ہوئے ہاں میں ہاں ملا کر بولا۔

”تو صبح کہتی ہے ادی خیراں! گرمی تو اب اسے ہمیں دیکھ کر چڑھے گی نا۔ آخر کو لاوارث جو ہوا۔“

شمع جو پاس ہی کھڑی برقعہ اوڑھ رہی تھی اسے اپنے ماموں کے یہ الفاظ قدرے برے لگے۔ علی بخش اس کا سوتیلا بھائی سہی مگر وہ اپنے سوتیلے بھائی علی بخش کی عزت کرتی تھی۔ وہ ماموں سے بولی۔ ”ماما سائیں! ایسا مت بول وہ بیچارہ غریب ہے۔ اکیلا ہے اگر ہم اس طرح اس کے بارے میں سوچیں گے تو وہ خود کو مزید تنہا سمجھنے لگے گا۔“

”اچھا..... چل زیادہ طرفداری نہ کر اس کی تیاری پکڑ اور اٹھا اپنے ننھے خوشی محمد کو۔“ اس کی ماں خیراں نے جزبہ ہو کر کہا اور پھر یہ تینوں گھر سے نکل گئے۔

پرل کا گھر اگرچہ خاصا کشادہ تھا لیکن گارے مٹی کی کچی دیواروں سے بنا ہوا تھا۔ کمرہ نما کوٹھڑیوں میں بھی گنجائش زیادہ تھی اور صحن بھی اس حد تک وسیع تھا کہ اس کے ایک جانب گائے بھینسوں کے لیے چارہ کترنے والی آہنی مشین نصب تھی جو ہاتھ کی مدد سے چلائی جاتی تھی اور دوسرے حصے میں پھوس اور سرکنڈوں سے بنے چھپر نما سائباں تلے ایک کھڑی کے قریب گائے بھینسیں جگالی کر رہی تھیں۔ چند ایک کمریوں کے علاوہ دیسی مرغیاں بھی کڑکڑاتی پھر رہی تھیں۔

پرل اور اس کے گھر والوں نے خیراں وغیرہ کا پرتپاک استقبال کیا۔ پرل اور اس

کا بیٹا گل محمد تو دوست محمد کے ہمراہ اوطاق نما ایک کمرے میں براجمان ہو گئے جبکہ دیگر گھر کی عورتیں اندر کوٹھڑی میں مصروف گفتگو ہو گئے۔

”سنگت سائیں! اور سب خیر ہے نا..... بال بچہ خوش ہے۔“ پرل نے روایت کے مطابق اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے دوست محمد سے کہا۔ وہ دبلا پتلا اور سانولی رنگت کا شخص ایک سیدھا سادہ ہاری نظر آ رہا تھا۔ عمر چالیس سے کچھ تجاوز ہی تھی۔ دوست محمد نے بھی جواباً ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”ہا سائیں..... مولا سائیں کا فضل ہے عزت کی مانی ٹکر کھا رہے ہیں۔“

وہ لوگ سب چار پائیوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ گل محمد اب تک چپ تھا اس کے بعد پھر پرل جب دوست محمد کے بہنوئی دودا خان کی موت سے متعلق رسماً اظہار افسوس اور اس کی شان میں قصیدے گوانے کے بعد چپ ہوا تو دوست محمد گلا صاف کر کے مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولا۔ ”سائیں پرل چاچا تم تو جانتے ہی ہو گے کہ اگر گھر کا کوئی فرد اچانک چلا جائے تو اس کی یاد عرصے تک درود یوار سے چمٹی رہتی ہے۔ ویسے تو کوئی دوسرا جانے والے کی جگہ نہیں لے سکتا مگر ایک تبدیلی کے تحت کسی کو اپنا لیا جائے تو وہ بھی گھر کے فرد ہی کی طرح خوشیاں بکھیرتا ہے۔“ دوست محمد چند ٹائپے رکا اور پھر بولنا شروع ہو گیا۔ ”میری بیوہ بہن خیراں کا ایک ہی پٹ ہے۔ محرم علی نام ہے اس کا، اچھا لڑکا ہے اپنا ہونٹ سنبھالتا ہے۔ اب گھر کی اداسی کو ختم کرنے کی خاطر ہم چاہتے ہیں کہ اس کا سہرا سجادیں۔ چاچا سائیں! تم میری بات سمجھ رہے ہونا۔“ دوست محمد نے اسے مخاطب کیا۔ مخاطب کرنے پر وہ چونک کر بولا۔ ”ہا..... ہاں میں سمجھ رہا ہوں۔“ اس کے تفسیمی لہجے نے دوست محمد کو مطمئن سا کر دیا۔

”میں لڑکے کا ماموں ہوں سگا۔ باپ تو اس کا رہا نہیں، پر اب یہ ذمہ داری آخر مجھے ہی نبھانی ہے۔“ دوست محمد اتنا کہہ کر خاموشی سے پرل کا چہرہ تنکے لگا جو کسی گہری سوچ میں غلط تھا وہ ان کے آنے کا مقصد تو کب کا جان چکا تھا کہ وہ اس کی جوان بیٹی سورٹھ کا رشتہ لینے آئے ہیں اور سردست اس کا انکار کرنے کا بھی ارادہ نہیں تھا مگر اس سلسلے میں وہ کچھ اور چاہتا تھا۔ اسے خاموش پاکر دوست محمد اپنے تئیں یہ سمجھا کہ پرل ”عوضانے“ کی مالیت جاننا چاہتا ہے بیٹی کا رشتہ دینے کے سلسلے میں..... لہذا وہ اس بار صراحتاً بولا۔ ”سائیں مان دارا..... آپ عوضانے کی گزرتی نہ کریں بس ”ہاں“ کر دیں۔“

”نہیں..... نہیں یہ بات نہیں ہے بابا۔“ پرل اس کا مطلب سمجھتے ہوئے قدرے

ہوئے لہجے میں کہا۔

”کیا؟“ ساون غیر یقینی سے انداز میں چونکا۔ ”علی بخش آیا تھا؟ دودا خان کا بیٹا!“  
 ”ہاں۔“ اللہ رکھی نے کہا اور پھر اسے بتانے لگی کہ وہ کس طرح اسے اور چاچی  
 عنایتاں کو سنگ کے سلسلے میں دھکا کر گیا ہے۔

”میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی اتنی جرأت ہوئی کیسے۔“ ساون اللہ رکھی  
 کی بات سن کر یکدم آپے سے باہر گیا۔  
 ”نہیں ساون! تجھے میری قسم ایسا مت کرنا۔ تجھے کچھ ہو گیا تو میرا کیا ہوگا؟“ اللہ  
 رکھی یکدم غمزدہ لہجے میں بولی۔

”نہیں اللہ رکھی مجھے کچھ نہیں ہوگا علی بخش کو سبق سکھانا پڑے گا۔“ ساون دانت پیس  
 کر بولا اور اللہ رکھی متوحش چہرے کے ساتھ اس کی جانب دیکھنے لگی۔

☆=====☆=====☆

علی بخش کے ہوٹل میں بیٹھنے کے اوقات کا وہی صبح کے ہی تھے مگر وہ شام میں بھی کبھی  
 کبھار چلا جایا کرتا تھا۔ ہوٹل کے دونوں وقتوں کی کمائی خیراں اپنے پاس رکھتی اور اس میں  
 سے بطور جیب خرچ اپنے بیٹے محرم علی اور علی بخش کو بھی دیا کرتی تھی۔ علی بخش بیچارے کو تو  
 حسب توقع برائے نام ہی جیب خرچ ملتا تھا، لیکن وہ کہتا کچھ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ  
 اس کے ”کنے“ کی کوئی ”شنوائی“ نہیں ہوگی۔ بھلا بھرے پُرے گھر میں ایک تنہا شخص کی  
 کس کو پروا ہو سکتی ہے۔ پھر دن بدن اس کی سوتیلی ماں اور بھائی محرم علی کی چہرہ دستیوں میں  
 بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا اب اس کے سوتیلے ماموں دوست محمد اور محمد علی بھی علی بخش کے  
 منہ کو آنے لگے تھے او اکثر بہن کے گھر پر ڈیرہ جمائے رہتے تھے۔ محرم علی اور اس کی ماں  
 خیراں ان کی شہ پر اکڑتے پھرتے تھے۔ علی بخش کے دل میں شدت سے باپ دودا خان  
 کے لیے پھر نفرت کا خوابیدہ آتش فشاں سلگنے لگا۔ وہ اپنے اکیلے پن اور دکھوں کا ذمہ دار  
 اپنے باپ کو ٹھہراتا۔ اس کی وجہ سے وہ آج ایک خاندان کا فرد ہوتے ہوئے بھی تنہا اور  
 بیگانہ تھا۔ اس کے باوجود اس کا باپ دودا خان مرتے ہوئے اس کی رگ حمیت بھڑکا گیا  
 تھا۔ علی بخش جیسے انسان غیر معمولی طور پر حساس ہونے کی وجہ سے انتقال وصیت کا پاس بھی  
 زیادہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے لیے اللہ رکھی کے سلسلے میں چپکا بیٹھ رہنا ناممکن اور  
 دشوار تھا۔ اس دن وہ یونیوں جب اپنے ہوٹل گیا تو وہاں حسب معمول محرم علی اپنے دونوں  
 ماموں کے ہمراہ بیٹھا ایک بھنا ہوا مرغ مسلم اڑا رہا تھا۔ علی بخش دل میں کڑھتا ہوا کاؤنٹر

خفیف ہو کر بولا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ میں اپنی بیٹی سورٹھ کے سنگ کے سلسلے میں روپیہ  
 نہیں بلکہ اپنے بیٹے گل محمد کے لئے سنگ لینا چاہتا ہوں اسی لیے میں اپنے بڑے بھائی موگو  
 سے بھی بات کر چکا ہوں لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ دوست محمد یوں جلدی سے بولا جیسے اسے کچھ امید سی ہو چکی ہو۔

”لیکن..... میرے بھائی موگو نے ابھی تک مجھے کوئی واضح جواب نہیں دیا ہے۔“

”بس تو پھر ٹھیک ہے اگر عوضہ کے طور پر سنگ ہی لینا چاہتے ہو تو پھر ہمیں منظور ہے  
 تمہاری یہ شرط۔“ دوست محمد جلدی سے اس کی بات سن کر بولا اور پریل ہو لے ہو لے پڑ  
 سوچ انداز میں اپنا سر اثبات میں ہلانے لگا۔

☆=====☆=====☆

اس شام ساون اپنے باپ موگو سے ناراض ہو کر پہلے کا دو کھڑانی کے چھپر ہوٹل  
 میں بیٹھا رہا پھر اس کے بعد وہاں سے نہر پر پہنچا جدھر حسب معمول اللہ رکھی پانی کا کلسالے  
 واپس لوٹ رہی تھی۔ ساون نے اسے دیکھتے ہی ساری صورت حال بتادی۔

”ساون! تو آپریس پیو سے نہ لڑا کر۔ وہ وڈا ہے تیرے سے۔“ باپ سے ناراضگی کا  
 سن کر وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی تو وہ حیرت ناک نظروں سے اللہ رکھی کی جانب تکتے  
 ہوئے بولا۔

”میں آپریس پیو سے اس لیے لڑتا ہوں کہ وہ اپنی ضد زبردستی میرے سر پہ تھوپ رہا  
 ہے۔ کیا میں اس سے یہ بھی نہیں کہوں کہ زندگی میں نے گزارنی ہے۔ اپنی گھر والی کے ساتھ۔“  
 ”تو ایسا کر چاچی امڑ کو بول کہ وہ تیرے پیو کو سمجھائے۔“ اللہ رکھی نے گویا اسے  
 مشورہ یا اس کا اشارہ ساون کی ماں کی طرف تھا۔

ساون نے ناگواری سے اپنے سر کو ہولے سے جھٹکا دیا اور تلخ لہجے میں بولا۔ ”یہ بھی  
 کر چکا ہوں۔ پر پیو نہیں مانتا اس کی بھی، اسے بیوی اور بیٹے سے زیادہ اپنے بھائی پریل  
 کے تعلقات عزیز ہیں۔“

اس کی بات سن کر اللہ رکھی کے شگفتہ سے چہرے پر فکر مندی کی لکیریں نمودار ہو  
 گئیں۔ پھر جیسے اچانک اسے کسی بات کا خیال آیا اور یکدم پریشان کن انداز میں چونکی اور  
 کچھ کہتے کہتے رک گئی، لیکن ساون نے اس کی پریشانی کو بھانپ لیا وہ بولا۔ ”کیا بات ہے  
 اللہ رکھی۔ تو کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔“

”ہاں..... وہ..... ساون، علی بخش آیا تھا۔ گھر ہمارے۔“ اللہ رکھی نے بالآخر اکتلتے

کے ایک جانب جا بیٹھا۔

”اڑے یا علی بخش..... آبا شامل ہو جاؤ بھی۔ ہم تیرے اپنے ہی ہیں آجا۔“ اس کے ایک سوتیلے ماموں نے قدرے خلوص کے ساتھ دعوت دی۔ اس کے دانت مرغ کی ٹانگ بھنجوڑنے میں مصروف تھے۔ علی بخش کو اس کے دوستانہ لہجے سے حیرت سی ہوئی۔ تاہم وہ چپ رہا تو اس کا دوسرا ماموں محمد علی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی جانب آیا اور بڑی ہمدردی سے اسے شانوں سے پکڑ کر زبردستی اپنے درمیان کھینچ لایا۔

”یار تو خود کو ہم سب سے کیوں الگ سمجھتا ہے۔ لے کھا موح کر۔“ دوست محمد نے ایک سالم ٹانگ اس کی جانب بڑھائی۔

علی بخش جیسے انسان کی نفسیات بہت معصوم ہوتی ہے۔ پیار اور انس کے دو بول انہیں متاثر کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ وہ ہنوز درطہ حیرت میں مبتلا تھا کہ آج اس کے سوتیلے ماموؤں کا رویہ کیوں اچانک بدل گیا تھا۔ جبکہ محرم علی چپ چاپ کھانے میں مشغول تھا۔

علی بخش خاموشی سے ایک بھئی ہوئی ٹانگ چبانے لگا۔ ”دیکھ علی بخش ہم تیرے بڑے ہیں اور تمہارا فائدہ بھی چاہیں گے۔“ بالآخر دوست محمد نے کہنا شروع کیا۔ ”اس گوٹھ میں رہنا اب تم لوگوں کے لیے مناسب نہیں۔ میں کہتا ہوں یہ ہوٹل اور گھر بار بیچ باج کر ہمارے گوٹھ مدد پورا آ جاؤ۔“

علی بخش نے فوراً بھنویں سیکی لیں اور اب وہ اپنے سوتیلے ماموں کی مکاری سمجھنے لگا تھا لہذا ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور ناگواری سے ایک جانب گھورنے لگا۔ ”آئندہ مجھ سے ایسی بات نہ کہنا میں اپنے باپ دادا کی نشانیاں نہیں چھوڑ سکتا۔“ علی بخش نے زہر خند لہجے میں کہا وہ جان گیا تھا کہ اس کے ماموں اس پر اس قدر التفات کیوں کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ علی بخش کی جوابی کارروائی نے ان کے چہروں سے ہمدردی اور ملنساری کا ملمع اتار دیا اور وہ دونوں ایک ساتھ غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ محرم علی بھی طیش کے مارے کھڑا ہو گیا اور اپنے دونوں ماموؤں کو مخاطب کرتے ہوئے علی بخش کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھ کر بولا۔

”ماما سائیں میں نے تیرے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ سیدھے منہ بات کرنے والا نہیں۔ بھلا یہ کون ہوتا ہے ہمارے معاملے میں دخل اندازی کرنے والا، ہماری مرضی ہم اس ہوٹل کو بیچیں یا نہیں۔“

محرم علی کی زہریلی گفتگو نے علی بخش کو بھی بھنا کر رکھ دیا اور وہ بھی جواباً محرم علی سے زہر خند لہجے میں بولا۔ ”میں تیرا بڑا بھائی ہوں اور میرا ہر چیز پر اتنا ہی حق ہے جتنا کہ ایک باپ کی اولاد کا ہوتا ہے۔ میری مرضی کے خلاف تم ہوٹل تو کیا اس کی ایک بیچ بھی نہیں بیچ سکتے..... سمجھے۔“

اس کی بات نے تو جیسے محرم علی کو غضب ناک بنا دیا اور آستینیں چڑھاتا ہوا علی کے خاصے قریب آ کر بولا۔ ”میں یہ سب بیچ کر رہوں گا تو کیا کر لے گا۔“

”میں راجواڑی فیصلہ کرواؤں گا پوری برادری بٹھاؤں گا کچہری کراؤں گا۔“ علی بخش بھی غیظ آلود لہجے میں بولا۔ تو پہلی بار محرم علی کے ماموں دوست محمد اور محمد علی کے چہروں پر الجھن سی تیر گئی۔ خود محرم علی بھی علی بخش کی بات پر متزدد نظر آنے لگا تھا، ان کی اس گرما گرمی کو دیکھ کر ہوٹل کے ملازمین اور دیگر لوگ بھی بغرض صلح صفائی ان کے قریب آ موجود ہوئے تھے مگر خیر رہی کہ بات با تھا پائی کے بغیر ہی موقوف ہو گئی اور وہ سب ایک دوسرے کی جانب گھورتے ہوئے اپنی اپنی جگہوں پر جا بیٹھے۔ علی بخش بھی نخوت کے ساتھ اپنی جگہ کرسی پر بیٹھ گیا مگر پھر اس نے وہاں سے جانے کا ارادہ کیا اور ابھی وہ اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ ساون پر پڑی وہ اس کی جانب تیز قدموں سے چلا آ رہا تھا۔ علی بخش نے اس کے کاندھے پر ٹکی کلباڑی دیکھ لی تھی۔ خود اس کے کاندھے پر بھی اس وقت کلباڑی موجود تھی۔ ساون کے پھرے ہوئے تیوروں کو بھانپتے ہوئے علی بخش بھی محتاط ہو کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ ”علی بخش!“ ساون اسے گھورتے ہوئے دھاڑ کر بولا۔ ”تو بھی وہی غلطی کر رہا ہے جو تیرے باپ دودا خان نے کی تھی۔“

”میرے باپ کا نام نہ لے ساون ورنہ۔“ علی بخش گرج کر ساون کو دھمکی دینے والے انداز میں بولا تو ساون کی آنکھوں میں شعلے رقصاں ہو گئے اور وہ زہر خند لہجے میں قدرے حقارت سے علی بخش کو گھورتے ہوئے بولا۔

”تو کیا سمجھتا ہے خود کو..... دو معصوم عورتوں کو دھمکانے کے بعد تو مجھے بھی دھمکا دے گا۔“ ساون کا اشارہ واضح طور پر اللہ رکھی اور اس کی چاچی عنایتاں کی طرف تھا علی بخش اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ دیگر لوگ وہاں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ محرم علی اور اس کے دونوں ماموں بھی بڑی دلچسپی سے علی بخش اور ساون کے درمیان ہونے والی اس ٹکراؤ کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے انداز و اطوار میں ذرا بھی علی بخش کے لیے حمایت کا شائبہ موجود نہ تھا بلکہ وہ

سب محو تماشائے تھے۔

”اللہ رکھی میرے بیوی کی غیرت ہے جس کا سنگ اس کا چاچا سوڈھل میرے پیو دودا خان کو دے چکا تھا۔“ علی بخش نے غصیلے لہجے میں ساون کو بتایا۔

”جھوٹ ہے یہ سب اور تو میری بات کان کھول کر سن لے علی بخش۔“ ساون زہر خند لہجے میں بولا۔ ”آئندہ اگر تو ہمارے بیچ آیا تو اچھا نہ ہوگا۔“

”تو کیا لگاڑے گا میرا؟“ علی بخش نے غصے سے کہا اور اپنے کاندھے پر نکی کلہاڑی اتار لی۔ دیکھا دیکھی ساون نے بھی اپنی کلہاڑی ہاتھوں میں لے لی اور ابھی وہ ایک دوسرے پر کلہاڑیوں کے وار کرنے کے لیے پرتول رہے تھے کہ ایک دم دیگر افراد بیچ میں آگئے۔ علی بخش اور ساون ایک دوسرے کو خونی نظروں سے دیکھتے ہوئے لوگوں کی گرفت سے نکلنے کے لیے بے چین ہونے لگے مگر لوگوں نے انہیں قابو کئے رکھا۔ دونوں کے منہ سے ایک دوسرے کے لئے مغلظات کا طوفان گرم تھا۔ ادھر دکھاوے کے طور پر محرم علی اور اس کے ماموں بھی علی بخش کو سنبھالے ہوئے تھے۔ بالآخر ساون کو سمجھا بچھا کر لوگوں نے وہاں سے بمشکل چلتا کر دیا۔ لوگ بھی اب واپس اپنی جگہوں پر چلے گئے تھے۔

علی بخش کا غصہ ابھی تک سرد نہیں ہوا تھا اس کی آنکھوں میں ہنوز ساون کے لیے معاندانہ چمک موجود تھی پھر یوں ہوا کہ وہ بھی ہوٹل سے چلا گیا۔

شام ڈھلی، رات ہوئی تو محرم علی اپنے دونوں چہیتے ماموؤں کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تینوں نے خیراں کے ساتھ کچھ چمیگوئیاں کیں اس کے بعد خیراں نے علی بخش کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ”تو اب کیا اپنی بیکار کی حرکتوں سے ہمیں پریشان کرے گا۔“ خیراں اس پر چڑھ دوڑی۔ اس کے تینوں ”سپوت“ بھی وہاں موجود تھے جو علی بخش کو گھور رہے تھے۔ علی بخش چہرے پر ناگواری لیے چپ کھڑا تھا۔

”پہلے میرے پٹ اور بھائیوں سے ٹوٹنے جھگڑا کیا اس کے بعد ہوٹل کے گاہکوں سے بھی ٹوٹنے اب لڑنا شروع کر دیا۔ پہلے کیا ہم تیرے باپ کی وجہ سے پورے گوٹھ میں کم بدنام ہوئے ہیں جواب تو بھی..... ہمیں پریشان کر رہا ہے۔“

علی بخش اپنی سوتیلی ماں کی بات سن کر رنگ رہ گیا اور شاکی نگاہوں سے محرم علی اور اس کے ماموؤں کی طرف دیکھنے لگا جنہوں نے جانتے بوجھتے ہوئے ماں کو غلط اطلاع دی تھی یا پھر ”مٹی بھگت“ کے تحت اسے آڑے ہاتھوں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسے اپنی ماں کی اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ وہ اس کے باپ دودا خان کے لیے اتنی غیریت اور

تفصیک آمیز الفاظ استعمال کر رہی تھی جیسے وہ اس کا شوہر نہیں دشمن رہ چکا ہو۔ علی بخش کو ماں کی اس بات پر دکھ تو بہت ہوا مگر جواب دینا بھی ضروری تھا۔ اگرچہ وہ دیکھ رہا تھا کہ ان سب کے تیر آج کچھ ٹھیک نہیں نظر آ رہے تھے۔

”میں نے محرم علی سے کوئی جھگڑا نہیں کیا تھا اور نہ ہی گاہکوں سے میں لڑا ہوں۔“

”ہاؤ..... ہاؤ..... تو تو بڑا شریف ہے بس میرا پٹ بد معاش ہے۔“ خیراں ہاتھ نچاتے ہوئے بولی اور پھر فیصلہ کن لہجے میں علی بخش سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”بس بہت ہو گیا ہم اس گوٹھ میں نہیں رہ سکتے یہ گھر اور ہوٹل ہم بیچ رہے ہیں، تو بھلے ادھر رہ کر جھگڑتا پھر لوگوں سے۔“ پھر وہ اپنے ایک چہیتے بھائی سے مخاطب ہوئی۔ ”دادا دوست محمد، کاغذ دکھاؤ علی بخش کو۔“

علی بخش سپاٹ نظروں سے اپنی ماں کو دیکھنے لگا اس اثناء میں دوست محمد نے علی بخش کی طرف کاغذوں کا مختصر سا پلندہ بڑھایا۔

”کیا ہے یہ؟“ علی بخش جھٹکے دار لہجے میں پلندے کی جانب گھورتے ہوئے بولا۔

”بابا یہ ملکیت کے کاغذ ہیں ہوٹل اور گھر دونوں ملا کر..... گرتی نہ کر اس میں تیرا ناں بھی شامل ہے۔“ دوست محمد قدرے مکاری اور نرم لہجے میں بولا۔

”کیا کروں میں اس کا؟“ علی بخش نے پھر اسی لہجے میں کہا البتہ اب اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو چکی تھیں۔

”اڑے بابا..... اس پر اپنا انگوٹھا لگا دے۔“ دوست محمد نے پلندے میں سے ایک

اور کاغذ جو ایک اسٹپ پیپر تھا علی بخش کو دکھاتے ہوئے کہا اور مکارانہ انداز میں اضافہ کیا۔

”یار علی بخش تو ہم سب سے الگ تھوڑا ہی ہے۔ اس میں تیرا بھی فائدہ ہے میں نے ہوٹل

اور مکان دونوں کا گاہک ڈھونڈ لیا ہے۔ وہ دونوں کے اچھے پیسے دے رہا ہے۔ ان پیسوں

سے تم سب ہمارے گوٹھ مدد پورا آ جاؤ۔ ایک بڑا گھر لے کر مل کر رہیں گے سب، ہوٹل

بھی کھول لیں گے وہاں۔ چل شاہاش میڈاپٹ اس پر آ پڑاں انگوٹھا لگا دے۔“

علی بخش یہ سن کر ایک دم سنائے میں آ گیا۔ اسے ایک ایسی گہری سازش کی بو

آنے لگی۔ ایسی سازش..... جو اسے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکالنے والی تھی۔ اس نے

باری باری اپنی سوتیلی ماں خیراں اس کے دونوں بھائیوں دوست محمد اور محرم علی کو اور اس کے

بعد محرم علی کو دیکھتے ہوئے دوست محمد سے اسٹپ پیپر جھپٹ کر اس کے پرزے پرزے کر

دیئے۔ یہ دیکھ کر دوست محمد سمیت وہ سب علی بخش کو اس طرح گھورنے لگے جیسے اس کے

ساتھ ان کی جانی دشمنی ہو۔

”کیسے..... ذلیل۔“ دوست محمد خونخوار نظروں سے علی بخش کو گھورتا گیا لیاں بکتا چڑھ دوڑا۔ جس کی تقلید اس کے بھائی محمد علی اور محرم علی نے بھی کی۔ انہیں علی بخش کی اس حرکت پر اتنا طیش آ گیا تھا کہ وہ پاگل کتوں کی طرح علی بخش کو جھنجھوڑنے کے لیے اس پر بیک وقت چڑھ دوڑے تھے۔

ان تین کے مقابلے میں علی بخش تنہا تھا..... لیکن حوصلہ اس کا تیرہ کے برابر تھا۔ علی بخش کو پچھاڑنے کے لیے سب سے پہلے دوست محمد نے اس پر حملہ کیا مگر علی بخش تب تک خود کو ذہنی اور جسمانی جنگ کے لیے آمادہ کر چکا تھا یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی اس نے دوست محمد کو جارحانہ عزائم لیے اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تو اس کی دہنی ٹانگ کی سیدھی اور چچی تلی ضرب نے دوست محمد کے پیٹ کی تواضع کر ڈالی۔ دوست محمد ”اوغ“ کی آواز کے ساتھ اپنا پیٹ پکڑتا رہ گیا۔ ادھر محمد علی اور محرم علی بھی علی بخش کے سر پر نہ صرف پہنچ چکے تھے بلکہ انہوں نے بیک وقت گھونسوں کی ضرب علی بخش کے جڑے اور گردن پر رسید کر دی۔ ان دہری ضربات نے علی بخش کا دماغ چند ثانیے کے لیے جھنجھن کر رکھ دیا اور اس کے حلق سے ایک تیز غراہٹ نکل گئی۔ اسے اپنے وجود میں چنگاریاں بھڑکتی محسوس ہوئیں جنہوں نے اس کے اندر برقی رو کا کام کیا اور ایک بار پھر اس کے دہانے سے نکلنے والی غضبناک ”آواز“ نے اس کی طاقت اور جوش کو سوا کر ڈالا اور یہی قوت اس نے اپنے ایک گھونے میں منتقل کرتے ہوئے محرم علی کی ٹھوڑی پر جڑ دیا اور جب تک اسی ہاتھ کی کہنی کے نشانے پر تیسرے حملہ آور محمد علی کا چہرہ بھی آچکا تھا۔ لہذا علی بخش کی کہنی اپنے ہدف تک پہنچنے کے لئے تیزی سے حرکت میں آئی اور محمد علی بھی اپنے مضروب بھانجے محرم علی کی طرح تکلیف دہ انداز میں کراہتا ہوا چند قدم پیچھے لڑکھڑاتا چلا گیا۔

خیراں ایک جانب حیران و پریشان کھڑی انہیں لڑتے ہوئے دیکھ رہی تھی..... اسی اثناء میں دوست محمد غضبناک بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا علی بخش کی طرف طوفانی رفتار سے بڑھا اور اپنے گیندے جیسے سر کی ٹکر علی بخش کے پیٹ میں ماری۔ نتیجتاً علی بخش خود کو سنبھالتا رہ گیا۔ دوست محمد نے محض اپنے سر کی ٹکر پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ علی بخش کو دھکیلتا ہوا چار پائی پر دے مارا..... علی بخش مار کھا گیا کیونکہ وہ کمر کے بل چار پائی کے ایک ابھرے ہوئے ”پائے“ پر آگرا تھا جس نے اس کی ریڑھ کی ہڈی کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور پہلی بار ایک کرب انگیز چیخ علی بخش کے حلق سے خارج ہوئی تھی اسے اپنی کمر کی ہڈی ترختی ہوئی محسوس ہوئی۔

اس نے انٹھنے کی ایک ناکام سعی کی..... مگر محمد علی اور محرم علی اس کے سر پر پہنچ چکے تھے..... وہ بیک وقت اس پر پل پڑے۔ علی بخش کو کمر والی چوٹ نے پہلے ہی نڈھال کر ڈالا تھا لیکن باوجود اس کے، اس نے اپنا کمر ورساد فاع کرتے ہوئے ان دونوں بدست گیندوں کو حملے سے روکنا چاہا مگر بے سود..... محمد علی نے ایک ٹھوکر اپنے پاؤں کی اس کے چہرے پر رسید کی اور ادھر محرم علی اور دوست محمد نے بھی مضروب علی بخش پر تازہ توڑ گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دی حتیٰ کہ علی بخش بے چارہ نڈھال ہو کر زمین پر ڈھے گیا۔

”اب بس کرو..... مار دو گے کیا اسے جان سے.....“ بالآخر ایک طرف کھڑی ”مومتاشا“ خیراں حق ناشی نبھاتے ہوئے اپنے دونوں بھائیوں اور بیٹے محرم علی سے بولی۔ یہی نہیں بلکہ وہ باقاعدہ انہیں جھنجھوڑنے بھی لگی تھی۔ تب کہیں جا کر ان تینوں نے بے سدھ پڑے علی بخش کے زخمی وجود کو چھوڑا۔ علی بخش کے ناک اور منہ سے خون کی لکیریں سی نمودار ہوئی تھیں۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

”اب کیا کریں اس کا.....“ خیراں ان تینوں کی طرف استغنامیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کرنا کیا ہے.....؟ اٹھا کر جنگل میں پھینک آتے ہیں اسے۔“ دوست محمد نے زمین پر بے ہوش پڑے علی بخش کے مضروب وجود کی طرف دیکھتے ہوئے زہر خند لہجے میں کہا۔

”میں کہتا ہوں اس راستے کے پتھر کو اپنی راہ سے ہٹانے کا ہمارے پاس یہ ایک سنہری موقع ہے کہ اس کا گلا دبا کے اسے مہر شاہ کے قبرستان میں گاڑ دیا جائے۔“ محمد علی نے اپنی بے رحمانہ رائے سے نوازا۔

”بے وقوفوں والی باتیں مت کرو۔“ خیراں اپنے بھائیوں کو جھڑکتے ہوئے بولی۔ ”میں کہتی ہوں اسے ہوش میں لاؤ..... ورنہ ہم سب ہی کسی مصیبت میں نہ پڑ جائیں۔“ اس کے مرتعش لہجے میں تشویش کا عنصر نمایاں تھا۔

”نہیں امڑ.....! ماموں درست کہتے ہیں..... اس کا قصہ پاک ہی کر دینا چاہئے..... نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔“ خیراں کے بیٹے محرم علی نے بھی اپنی رائے دینا ضروری سمجھی۔ اس وقت ان سب کے چہرے خونی اور انتہا درجے کے سفاک ہو رہے تھے۔ بے رحم رات کا سناٹا چہار سو طاری تھا۔ شکستہ مگر کشادہ کچے صحن میں سرد ہوا سکنے کے انداز میں ٹھہر رہی تھی۔

خیراں نے اپنے بیٹے کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”لیکن یہ وہ بانس ہے جو اگر نہ رہا تو ہماری بانسری ضرور بجا دے گا۔۔۔۔۔ میں کہتی ہوں اسے فوراً ہوش میں لاؤ اور اپنے منہ بند رکھو۔“ اس کی بات پر وہ تینوں رضا مند نظر آنے لگے۔ باہر دبیز کمرے میں لپٹی ہوئی رات انتہائی سرد تھی۔

☆=====☆=====☆

”دیکھ ساون اگر تو نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں کچھ کھا کر اپنی جان دے دوں گی۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔“ سورٹھ رندھے ہوئے مگر قدرے جارحانہ انداز میں کہتے کہتے رک گئی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں بول اور۔۔۔۔۔ اور کیا کر لے گی تو میرا۔۔۔۔۔ ہیں۔۔۔۔۔“ ساون نے قدرے تلخ لہجے میں اس کا ادھورا جملہ پورا کرنے کے لئے اکسایا۔ اس پر سورٹھ خود کو قدرے سنبھالتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولی۔

”اور۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ کہ ساون۔۔۔۔۔ میں تجھے بھی بدنام کر کے مروں گی۔۔۔۔۔ تیرا نام لے کر مروں گی۔“ اتنا کہہ کر وہ دیوار گیر کھڑکی نما دروازے سے گزر کر دوسری طرف اپنے گھر میں چلی گئی اور ساون اپنی جگہ دم بخود کھڑا رہ گیا۔ سورٹھ کی اس جذباتی دھمکی نے ساون کو ہک بک کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ عصر کا وقت تھا اور گوٹھ کی اکلوتی مسجد سے مؤذن کے اذان دینے کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ جس کے نتیجے میں گوٹھ کی واحد آٹے کی چکی کی مخصوص ”پک۔۔۔۔۔ پک۔۔۔۔۔ پک۔۔۔۔۔“ بھی بند ہو چکی تھی۔

ساون گھر میں آج اتفاق سے تنہا تھا۔ وہ جب بھی اکیلا ہوتا۔۔۔۔۔ تو جانے کس طرح دشمن جاں اور قتالہ جہاں سورٹھ کو خبر ہو جایا کرتی تھی اور پھر وہ ”چھم۔۔۔۔۔“ سے ایک شعلہ خوابیدہ کی طرح نازل ہو کر ساون کے گلے کا ہار بن جاتی۔ فتنہ گر سورٹھ کے فوری اور ”بروقت“ نازل ہونے کی ایک بڑی اور اہم وجہ۔۔۔۔۔ وہ دیوار گیر آدم گزار کھڑکی تھی جو دونوں گھروں کے مینوں کے قریبی روابط کے لیے بنائی گئی تھی چونکہ دونوں گھروں میں قریبی رشتے داری تھی۔ اسی لئے اس اندرونی دیوار میں نصب شدہ کھڑکی دونوں خاندانوں کے لیے باہمی قربت کا ایک ”فوری“ وسیلہ تھی۔ چنانچہ یہ بات بعد از قیاس نہ تھی کہ سورٹھ کو مذکورہ کھڑکی سے ”میدان“ صاف ہونے کا علم نہ ہو سکے۔ کیونکہ مذکورہ کھڑکی جسے مقامی زبان میں ”کھاڑ“ کہا جاتا ہے۔ سورٹھ۔۔۔۔۔ کے لیے ہر سے اپنے محبوب ساون کے دیدار خفتہ کا ایک سہل ذریعہ تھی۔ جس سے لگی وہ منتظر محبوب رہتی تھی۔ لہذا

اس بار بھی ایسا ہی ہوا جیسے ہی اس نے دیکھا کہ ساون آج اپنے گھر میں تنہا ہے۔۔۔۔۔ تو وہ فی الفور کھڑکی پار کر کے اس کے گلے کا ہار بن گئی۔۔۔۔۔ بہر طور۔۔۔۔۔ سورٹھ کی واپسی اک طوفان بلائیز کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔ ساون بھی جھنجھلاتا اور سورٹھ کی دھمکی آمیز گفتگو پر دل ہی دل میں کڑھتا ہوا اندر کوٹھری میں آ گیا اور چار پائی پر گر سا گیا۔

آج سورٹھ نے اپنی دھمکی آمیز گفتگو سے خاصا اثر ولیدہ کر کے رکھ دیا تھا۔۔۔۔۔ جانے کیوں ساون کو اب اپنی پچازاد سورٹھ سے انجانا سا خدشہ محسوس ہونے لگا تھا۔ ایک ایسا خدشہ۔۔۔۔۔ جو اچانک ہی شعلہ ناگہانی کی طرح بھڑک کر ہر شے کو بھسم کر دیتا ہو۔

پھر اس سے اگلے دن صبح کو ساون کی طبیعت اور متغیر ہو گئی جب اس نے دیکھا کہ صبح دم ہی اس کا چاچا پرل اور چاچی آن دھمکے۔ اس وقت سب گھر میں موجود تھے۔ ساون کے باپ موگو نے اپنے بھائی کا پڑ پٹاک استقبال کیا لیکن ساون نے اپنی تیز نظروں سے چاچا اور چاچی کے چہروں کو دیکھ کر محسوس کیا کہ وہ خاصے سرد اور بے مہر ہو رہے تھے۔ ایک اجنبیت سی جیسے کھنڈی ہوئی تھی ان کے چہرے پر۔ ساون کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی تھی کہ وہ کسی ”مقصد“ کے تحت آج صبح صبح ہی آن دھمکے تھے۔ ساون کو اب یہ سوچ کر بڑی کوفت سی ہونے لگی اور اس خدشے کا احساس بھی بڑھ گیا کہ آج اس کا ضدی باپ موگو پھر اسے آڑے ہاتھوں لے گا۔۔۔۔۔ اور بالآخر دونوں باپ بیٹوں کے درمیان ہونے والی تکرار نہ صرف فیصلہ کن ثابت ہوگی بلکہ آخری بھی۔۔۔۔۔ اور پھر یہی ہوا۔ ساون تو چاچا اور چاچی کو دیکھتے ہی نکل گیا تھا لیکن بہر طور موجودہ حالات سے مفر اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ گھر سے نکل تو گیا تھا لیکن دوپہر کو پھر اسے لوٹنا پڑا تو کیا دیکھتا ہے اس کا باپ موگو صحن میں بچھی کھری چار پائی پر یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے اس کا ہی منتظر ہو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ساون کو دیکھتے ہی چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہاں حیران پریشان سی دونوں ماں بیٹیاں بھی موجود تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آج دونوں باپ بیٹوں میں کوئی معرکہ ہونے والا ہو۔

”ساون۔۔۔۔۔!“ موگو نے قدرے بلند آواز میں ساون کو پکارا۔ اس کا چہرہ بالکل سہٹ تھا اور انداز تنخاطب بھی ایسا ہی تھا جیسے وہ ابھی ساون کو لٹھ مار دے گا۔

”جی۔۔۔۔۔ بابا۔۔۔۔۔“ ساون نے باپ کی طرف الجھی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اسی اثناء میں اس کی ماں درمیان میں اپنے شوہر سے بولی۔ ”میڈے لعل کو مانی ٹکڑو کھا لینے دے۔۔۔۔۔ پھر بات کر لینا۔۔۔۔۔“

”امڑ..... بابا کو بات کرنے دے پہلے، مانی (روٹی) کی خیر ہے.....“ ساون نے ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور باپ سے بولا۔ ”ہاں بابا..... میں سن رہا ہوں کرو بات.....“

”بات وہی پرانی ہے جسے میں بار بار دہرانا نہیں چاہتا۔ میڈا بھرا آخری وری یہاں آیا تھا جواب لینے..... اس لئے اب تو بھی مجھے آخری فیصلہ سنا دے تاکہ میں پھر تیرے لئے کوئی فیصلہ کر سکوں۔“ موگو، بیٹے کے چہرے پر بغیر پلکیں جھپکائے گھورتے ہوئے بولا۔ وہ خود کو عقل کل سمجھتا تھا اس لئے بیٹے پر اپنی مرضی مسلط کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی یہ روش اس کے بیٹے کو سرکشی میں مبتلا کر سکتی تھی اور حقیقت بھی یہی تھی کہ ساون اپنی ہٹ کا پکا تھا اور پہلے ہی سے ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے کا تہیہ کر چکا تھا..... مگر ایک حکمت عملی کے تحت وہ سردست باپ کو واضح جواب نہیں دینا چاہتا تھا لہذا باپ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”بابا..... ٹھیک ہے..... مجھے کچھ سوچنے کا موقع دے۔“

اس کی بات پر موگو چند ثانیے سپاٹ نظروں کے ساتھ ساون کے چہرے کی جانب دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے..... میں تجھے کل تک مہلت دیتا ہوں سوچنے کی..... لیکن یاد رکھنا کہ یہ آخر مہلت ہوگی۔“ اتنا کہہ کر وہ باہر چلا گیا اور بے چاری ساون کی ماں اور اس کی بہن ہدایتاں کی جان میں جان آئی۔

ماں نے ساون کو کھانا لاکر دیا جسے ساون نے چارونا چار زہر مار کیا..... اور اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں آکر چار پانی پر لیٹ گیا۔ اس کا چہرہ کسی گہری سوچ کا غماز نظر آنے لگا تھا۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ وہ باپ کی بات پر غور کر رہا تھا بلکہ وہ کچھ اور ہی سوچنے میں محو تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے گھر کو خیر باد کہہ کر اللہ رکھی کے ساتھ ساری زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ وہ کب کا یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ اللہ رکھی سے ہی شادی کرے گا..... لہذا اس نے اب آئندہ کا لائحہ عمل یہی ترتیب دیا تھا کہ اللہ رکھی سے فوری شادی کر کے پہلے اپنے قدموں پر کھڑا ہوگا اور پھر اس کا باپ موگو ایک دن خود گزرتے سے کے ساتھ اسے معاف کر دے گا اور پھر وہ اللہ رکھی کے ساتھ ہی اپنے گھر دوبارہ واپس آجائے گا..... لیکن آگے

تقدیر کو کیا منظور تھا یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ پھر اچانک ساون چار پانی سے اٹھا۔ کمرہ نما کوٹھڑی کے کچے فرش پر اکڑوں بیٹھا اور چار پانی کے نیچے سے ایک زنگ آلود ٹریک گھسیٹ کر اسے کھولا۔ اندر تلے اوپر رکتے

کپڑوں کے نیچے سے ایک پوٹلی برآمد کی۔ ان میں چالیس ہزار کی وہ رقم بندھی ہوئی تھی جو چاچی عنایتاں نے اسے لوٹا دی تھی۔ ساون نے وہ پوٹلی اپنی بڑے گھیر والی شلوار کے نیچے میں اڑس لی پھر چند اور ضرورت کی اشیاء سنبھالیں اور بہانے سے گھر سے نکل گیا۔

اسے اپنے وجود کے اندر ایک کپکپاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک عجیب سے احساس تلے اس کا دل گھبرا بھی رہا تھا تو کبھی انجانی سی مسرت بھی محسوس کر رہا تھا۔ بہر طور چند ثانیے بعد اس کا چہرہ عزم صمیم کا عکاس نظر آنے لگا۔ اس کا رخ اللہ رکھی کے گھر کی جانب تھا۔

اس وقت سرمنی شام شب ظلمت میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اللہ رکھی کے گھر کی جانب تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ وہ اللہ رکھی کو کس طرح اپنے فیصلے سے آگاہ کرے؟ کیونکہ چاچی عنایتاں کو بھی اعتماد میں لینا ضروری تھا تاہم اسے اللہ رکھی پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ اس کا ہر صورت ساتھ دے گی۔ انہی سوچوں کے گرداب میں ڈوب اور ابھر کر وہ بالآخر اللہ رکھی کے گھر پہنچ گیا۔

دروازے پر دستک دیتے ہوئے ساون نے یونہی دائیں بائیں تاریکی میں دیکھا۔ گلی میں اس وقت سناٹا تھا..... جاڑوں کی راتیں ویسے بھی جلد اتر آتی ہیں اور گہری بھی بہت ہوتی ہیں۔ ساون نے فقط اجرک اپنے جسم کے گرد لپٹ رکھی تھی۔ دستک کے جواب میں دروازہ اللہ رکھی نے ہی کھولا تھا..... لیکن ساون مدھم سی روشنی میں اللہ رکھی کا چہرہ دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ اللہ رکھی کا چہرہ پریشان کن اور آنکھیں نمناک ہو رہی تھیں۔ وہ یوں اچانک غیر متوقع طور پر ساون کو اپنے دروازے پر دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ مگر پھر اس کے پریشانچہرے پر ایک طمانیت سی دوڑ گئی اور وہ بولی۔ ”ساون! اچھا ہوا تو آ گیا.....!“

”خیریت تو ہے..... اللہ رکھی..... کیا ہوا؟“ ساون نے چونک کر کہا اور پھر اس کے سستے ہوئے چہرے کی طرف بغور دیکھتا ہوا اندر چلا آیا۔ صحن میں سحرا انگیز ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی اتری ہوئی تھی۔

”ساون.....! چاچی کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔“ اللہ رکھی نے مضطربانہ انداز میں اسے اپنی پریشانی بتائی۔ اب وہ دونوں ساتھ ہی چلتے ہوئے اندر کوٹھڑی میں داخل ہو گئے۔ جہاں ایک چار پانی پر موٹی سی رلی اوڑھے چاچی عنایتاں لیٹی ہوئی کراہ رہی تھی۔ کوٹھڑی میں پھیلی ہوئی بلب کی کمزور سی روشنی میں اس بے چاری کے چہرے کے تاثرات کسی موذی عارضے کی غمازی کر رہے تھے۔

”کسی حکیم کو دکھایا ہے چاچی کو.....“ ساون نے مارے درد کے کراہتی ہوئی چاچی

عنایتاں کی طرف دیکھتے ہوئے اللہ رکھی سے پوچھا۔

’ہاں..... دکھایا تھا مگر کوئی افاقہ نہیں ہو..... اور اب تو طبیعت پہلے سے بھی زیادہ بگڑتی جا رہی ہے۔‘ اللہ رکھی نے اپنی بات جاری رکھی اور مزید بولی۔ ’اب تو سب نے جواب دے دیا ہے..... حتیٰ کہ حکیم بڈھل اور ڈاکٹر شاہ سائیں نے بھی جواب دیتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ چاچی کو شہر کے وڈے ہسپتال میں لے جاؤ۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔‘ یہ بتاتے ہوئے اللہ رکھی کی جھیل ایسی آنکھوں میں مزید آنسوؤں کی نمی تیر گئی۔

ساون نے اسے تسلی دی۔ ’اللہ رکھی..... تو فکر نہ کر میں ہوں ناں..... اللہ سے دعا کر، وہ اچھا کرے گا۔‘ پھر ساون نے آگے بڑھ کر چاچی عنایتاں کی پیشانی پر اپنا الٹا ہاتھ رکھا تو وہ تپ رہی تھی۔ اس نے بغور چاچی کا چہرہ دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر بھی گہری فکر نمایاں ہو گئی تھی۔ چاچی بدستور نڈھال سی آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھی۔

’اللہ رکھی! چاچی کو تو بہت تیز تاپ (بخار) ہو رہا ہے۔‘ ساون نے پُر تشویش لہجے میں کہا۔

اللہ رکھی اب پریشان کن نظروں سے ساون کا چہرہ ٹکنے لگی۔ ساون سوچ میں محو تھا پھر اللہ رکھی کو مخاطب کر کے بولا۔ ’اللہ رکھی! میرا خیال ہے چاچی کو اسی وقت شہر لے جانا پڑے گا۔‘

’لہل..... لیکن.....‘ وہ بے چاری کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

’اللہ رکھی! حوصلہ رکھ..... لاڑکانہ ہمارے گوٹھ سے اتنا زیادہ دور نہیں..... میرا خیال ہے اگر تم ہمت سے کام لو تو ہم چاچی کو باسانی ہیل گاڑی میں ڈال کر شہر لے جا سکتے ہیں۔‘

اللہ رکھی بے چاری کیا جواب دیتی اس کے تو آنسو تک حلق میں گھٹ کر رہ گئے تھے اور بات بھی نہیں کی جا رہی تھی بس خاموش نگاہوں سے وہ اپنے محبوب کو تنکے جا رہی تھی۔ ساون کو اس کی غمناک آنکھوں میں بے بسی اور بے چارگی کی جھلک صاف دکھائی دے گئی۔ ساون کو اس پر یک گونہ ترس سا آنے لگا۔ وہ اس کے قریب آیا اور اس کی گھنیری پلکوں کے سائے تلے جھیل ایسی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے محبت پاش لہجے میں بولا۔ ’اللہ رکھی میرے ہوتے ہوئے تو کوئی دکھ نہیں دیکھے گی۔ تجھ پر ایک ذرا بھی آنچ نہیں آنے دوں گا میں..... بس تو رب سائیں سے دعا کروہ ہماری مشکلیں آسان کرے۔‘ ساون کے

نے اللہ رکھی کو بے اختیار سا کر دیا۔

’اللہ رکھی.....! تم جلدی سے عام ضرورت کا تھوڑا سا مان سمیٹ لے..... میں جب تک ہیل گاڑی تیار کرتا ہوں۔‘

’لیکن ساون! اتنی رات کو ایسی سردی میں.....‘ اللہ رکھی نے اکتے ہوئے کہا۔

’اللہ رکھی.....! خوشی اور غمی کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ اسی طرح انسان کو ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا چاہئے۔ یہ ایک بیماری کا معاملہ ہے..... جو کسی وقت بھی جان کے لیے خطرہ بن سکتی ہے..... اللہ رکھی.....! درحقیقت میں چاہتا تو یہی تھا کہ تجھے اپنے ساتھ شہر نہ لے کر جاؤں..... لیکن تجھے تنہا میں یہاں چھوڑ کر بھی نہیں سکتا اور نہ میرے گھر کے حالات ایسے ہیں کہ تجھے کچھ دنوں کے لیے وہیں چھوڑ کر چاچی کو شہر لے جاتا..... مگر مجبوری ہے کہ تجھے بھی اپنے ساتھ.....‘

’نہیں ساون! مجبوری کیسی..... میرا تو اب جینا مرنا تیرے واسطے ہے، میں تجھ سے جدا ہونے کے ایک بل بھی نہیں رہ سکتی۔‘ اللہ رکھی ساون کی بات پر تڑپ کر بولی۔

ساون نے دانستہ اللہ رکھی کو اصل بات سے بے خبر رہنے دیا کہ اس کی خاطر وہ اپنا گھریا چھوڑ آیا ہے۔ تاہم اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مناسب وقت پر وہ اللہ رکھی کو آگاہ کر دے گا..... ابھی مسئلہ چاچی کو جلد از جلد شہر پہنچانے کا تھا۔ پھر وہ دونوں جلدی جلدی تیار یوں میں مصروف ہو گئے..... باہر ٹھٹھرتی ہوئی رات دے پاؤں سرک رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ علی بخش کی آنکھ کھلی۔ ہوش آتے ہی اس کے محسوسات جاگے تو اسے اپنے پورے وجود میں ٹیسیں سی اٹھتی محسوس ہوئیں۔ ایک ہلکی سی کراہ اس کے حلق سے خارج ہوئی تو اس نے دیکھا کہ اس کی سوتیلی ماں خیراں اس کے قریب چار پائی پر بیٹھی زخموں کو سہلا رہی تھی۔ علی بخش نے ناگوار اور نفرت انگیز نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور دوسری طرف کروٹ لینے کی کوشش میں اسے پھر اپنے مضروب وجود سے درد کی لہریں سی اٹھتی محسوس ہونے لگیں۔

’نامیڈا لعل.....! ایسے ہی پڑا رہ..... میں تیرے کو نکور کر رہی ہوں۔ مرہم بھی لگا دی ہے میں نے.....‘ خیراں نے جلدی سے اسے مخاطب کر کے کہا۔ اس کے لہجے میں ندامت آمیز ارتعاش تھا۔

علی بخش کا دل ایک بار پھر نفرت سے بھر گیا۔ اس نے سپاٹ سے لہجے میں جواباً



آنے لگا۔

”امڑ! (ماں) میں کس سے شکایت کروں..... تو بھی چلی گئی۔ بابا..... بھی نہ رہا..... میں کسے بتاؤں کہ مجھ پر میری سوتیلی ماں، اس کی بھائی اور بیٹا کتنا ظلم ڈھارہے ہیں۔“ رات کے مہیب سنائے میں علی بخش اپنی ماں حضوراں بی بی سے شکوہ کناں تھا۔ جو جانے کتنے عرصے سے ابدی نیند سو رہی تھی۔ ”امڑ.....! آج مجھے سب نے بہت پیٹا ہے۔ امڑ..... تو بتا مجھے، میں کس کی گود میں اپنا سر رکھ کر روؤں۔“ علی بخش پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کا سینہ دکھ سے بھر گیا تھا اور پھر وہ وہیں ٹھہرتی ہوئی سردرات میں اپنی ماں کی قبر کے ساتھ لیٹ گیا۔

☆=====☆=====☆

خیراں سے کہا۔ ”تو چلی جا..... میں چاک (ٹھیک) ہوں..... جا..... یہاں سے.....“ اس نے جیسے نفرت انگیز لہجے میں اسے دھتکار تے ہوئے گھورا تو خیراں کی زماہٹ بخارات بن کر دھواں ہو گئی اور وہ منہ بسورتی کمرے سے نکل گئی۔

اب علی بخش اپنے کمرے میں تنہا رہ گیا تھا۔ وہ چند ٹائیپے یونی پڑا..... اپنے اوپر بیٹے بے رحمانہ پیش آمدہ واقعات کو ترتیب وار سوچنے لگا کہ کس طرح اس کے ساتھ اس کے سوتیلے ماموؤں اور بھائی نے انتہائی بے حسی اور بے رحمی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے مارا پیٹا تھا۔ اس تلخ واقعے کے بعد سے وہ خود کو اس گھر میں غیر محفوظ سمجھنے لگا تھا۔ اس پر ایک بار پھر ”خطرناک“ قسم کی دیوانگی آمیز قنوطیت طاری ہونے لگی..... اور کمرے کی درود یوار اسے کانٹے کو دوڑتی محسوس ہو رہی تھی اور سینے میں دم گھٹنا محسوس ہو رہا تھا۔ ٹھنڈ کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس گھر کے سارے مکینوں کو جلا کر بھسم کر دے۔ جب اس کی اعصاب زدگی حواسوں کو معطل کرنے لگی تو وہ ایک دم گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ حیرت ناک بات تھی کہ اسے اس بار کسی قسم کی ٹیس محسوس نہیں ہوئی تھی۔ شاید اس کا زخم دروں زیادہ ہرا تھا جو بیرونی زخموں کو خاطر میں نہیں لایا تھا۔ پھر وہ چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا ایک لمحے کو اس کے قدم ڈمگائے..... ذہن میں تاریک سے جھماکے ہونے لگے مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے وجود کی کپکپاہٹ پر قابو پایا۔ اجرک اٹھا کر اوڑھی اور کمرے سے باہر کچے ٹھٹھرتے صحن میں آ گیا۔ پھر وہاں سے بے آہستگی بیرونی دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

باہر گلی میں دبیز کھراچھایا ہوا تھا۔ آسمان پر ٹٹماتے ستاروں اور شروع کی تاریخوں کے چاند کی مدھم اور سحر انگیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے کھرا مزید دودھیا سا نظر آرہا تھا۔ علی بخش مشینی انداز میں چلتا ہوا گلی سے نکل کر میڑھے میڑھے شکستہ سے راستے پر ہو لیا۔ وہ آہستہ روی مگر بغیر کے انجانی منزل کی جانب بڑھا چلا جا رہا تھا۔ چہا سو گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ملگجی سی دھندلی تاریکی اطراف میں پراسراریت سی طاری کئے ہوئے تھی۔ آوارہ جانور تک کو نے کھدروں میں دیکے ہوئے تھے۔ علی بخش بے خوف چلتا ہوا بالآخر گوٹھ کے ایک پرانے اور واحد قبرستان میہر شاہ جا پہنچا۔ پورے ماحول پر سکستہ سا طاری تھا۔ علی بخش کے چہرے کی متماہٹ گہری ہوئی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ناچختہ قبر کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اس کی مغنوم سی نگاہیں سامنے قبر پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک ایک آنکھوں میں آنسو جھلانا شروع ہو گئے..... اور چہرہ کسی اندرونی شکست و ریخت کے باعث مرتعش سا نظر

نے پہلے ہی بندوبست کے طور پر اکودھاڑیل کو اشارہ اور بالخصوص اپنے بڑے بیٹے علی بخش کے لیے کہا تھا کہ وہ ہر مشکل وقت اور معاملے میں اس کی مدد کرے..... اکودھاڑیل آج تک اپنے دوست دودا خان سے کیا ہوا وعدہ نبھاتا چلا آیا تھا..... اور اب بھی محض علی بخش سے ملنے اور اس کی خیر خیریت پوچھنے اکثر آ جایا کرتا تھا۔ اس کا خیال آتے ہی علی بخش فوراً ہوٹل جا پہنچا۔ محرم علی اچانک اسے دیکھ کر ٹھنک سا گیا..... لیکن اس نے اس کے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ تاہم اسے اس بات پر حیرت ضرور ہوئی تھی کہ علی بخش اس وقت جبکہ ہوٹل کے بند ہونے کا وقت ہو چکا تھا کیوں چلا آیا۔ اس کی آمد اسے ایک شک آمیز اچھنبے میں مبتلا کر رہی تھی..... لہذا اس نے اپنے ایک ”گماشتے“ خیرد کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ آج کی رات علی بخش کی خفیہ نگرانی کرے اور اگلے دن اسے بتائے کہ اتنی رات گئے علی بخش ہوٹل میں کیا کرتا رہا تھا۔

بہر طور محرم علی اپنے وقت پر ”دخل“ سے اٹھ کر گھر چلا گیا۔ دیگر ملازم بھی جانے لگے۔ بس چند ایک وہی ملازم رہ گئے تھے جنہوں نے ہفتے وار نشے وغیرہ کا بندوبست کرنا تھا..... جہاں نامی گرامی چوراچکے اور بدنام زمانہ ڈاکو کو آ کر محفل رنگ و بو جماتے اور اسی دوران جوا بھی چلتا تھا۔

محرم علی کا متعین کردہ گماشتہ ”خیرد“ بڑی توجہ کے ساتھ علی بخش کی حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ”وزن پاڑیں“ کی محفل اندر ہوٹل کی عقبی کشادہ مگر کچی کوٹھڑی میں شروع ہو چکی تھی جبکہ علی بخش ”دخل“ سے اٹھ کر چائے اور کھانا بنانے والے چبوترے کے قریب بیچ پر بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ اسے بے چینی سے اکودھاڑیل کا انتظار تھا۔ ہوٹل کی اس سرگرمی کا ”منتظم اعلیٰ“ بہ الفاظ دیگر روح رواں ایک فٹشی تھا جس کا نام خیر بخش تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا سیاہ روٹھن تھا عمر چالیس سے متجاوز تھی۔ اس کی جواچانک نگاہ علی بخش پر پڑی تو وہ اس کی جانب بڑھا اور مؤدبانہ مگر قدرے معنی خیز انداز میں بولا۔ ”چھوٹے سائیں..... جی گھبرا رہا ہے تو اندر کوٹھڑی میں آ جاؤ..... ذرا دل بہل جائے گا۔“

علی بخش کو ان چیزوں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی لہذا اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے اسے چلے جانے کو کہا اور فٹشی خیر بخش مولیوں کے سے انداز میں منہ ہلاتا ہوا چلا گیا۔ علی بخش کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس پر ایک ناقابل بیان کوفت اور کبھی بیزاری کی طاری ہونے لگتی تھی۔ رات اپنے انجام کی طرف محسوس تھی..... معاً علی بخش کی سماعتوں سے گھوڑوں کی مخصوص ناپوں کی آواز نگرانی۔ آواز عقبی سمت سے ابھری تھی۔ علی بخش جان گیا تھا

صبح دم جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے سخت بخار چڑھا ہوا تھا اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اس حالت میں گرتا پڑتا اپنے گھر آ گیا۔ خیراں اس کی بنیت کڈائی دیکھ کر ذرا پریشان سی ہو گئی۔ پھر جانے اس کے دل میں کس طرح رحم آ گیا اور وہ اس کے لیے گرم گرم دودھ لے آئی۔ علی بخش نے دودھ پیا اور موٹی سی رلی اوڑھ کر سو رہا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو خاصا بہتر پایا۔ اسے اپنا آپ اب ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا۔ دماغ ذرا سوچنے کے قابل ہوا اس نے از سر نو اپنے حالات کا جائزہ لیا۔ اس کے دونوں ماموں دوست محمد اور محمد علی جاچکے تھے محرم علی بھی گھر میں موجود نہ تھا۔ علی بخش کو اس تلخ حقیقت کا بخوبی ادراک ہو چکا تھا کہ اگر اس نے جلد اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا کوئی سدباب نہ کیا تو کسی بھی وقت اسے اس کے حق سے محروم کر دیا جائے گا کیونکہ اب وہ یہ بات واضح طور پر محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کی سوتیلی ماں کی چیرہ دستیوں کھل کر سامنے آ چکی تھیں..... اور وہ اپنے مفاد کی خاطر ہر قسم کے اوتھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر وہ کب تک اکیلا ان بے حس لوگوں کے درمیان پستار ہے گا۔ اسے اکیلا جان کر ان کی چیرہ دستیوں دن بہ دن بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ نوبت یہاں تک آچکی تھی کہ وہ سب اسے جانیدا تک سے محروم کرنے کے لیے اس کی جان کے دشمن ہو چلے تھے۔ یہی سوچتے سوچتے شام اور پھر رات آ گئی تو معاً اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی سرعت کے ساتھ کوندا۔ اسے یہ خیال سر پر آتی اس رات کو دیکھ کر آیا تھا۔ ہاں..... اس رات یعنی جمعرات کی رات..... بدنام دھاڑیل اکو صرف اس سے ملنے کے لیے آیا کرتا تھا..... اور شاید دودا خان نے اپنے تجربے کی نگاہ سے ان رویوں کو پہلے ہی سے بھانپ لیا تھا جو اس کی موت کے بعد اس کے بڑے بیٹے علی بخش کے ساتھ روار کھے جانے تھے..... اسے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ جب تک وہ خود زندہ ہے علی بخش کے ساتھ کوئی ایسی نا انصافی نہیں ہوگی مگر اس کی آنکھ بند ہوتے ہی ”سوتیلے“ رشتے ہی ناگ بن کر علی بخش کو ڈس سکتے تھے..... لہذا اس کے لیے دودا خان

بتانے لگا۔ وہ اس بات سے یکسر بے خبر تھا کہ محرم علی کا ایک گماشتہ ان کی ٹوہ میں ہے۔

☆=====☆=====☆

”خیر و.....! علی بخش جس شخص کے ساتھ باتیں کر رہا تھا، وہ کون تھا؟“

محرم علی نے اپنے گماشتہ خیر و سے اگلے دن اس کی کارگزاری کے بارے میں استفسار کرتے ہوئے پوچھا۔ خیر و ایک اٹھارہ انیس سالہ پیش گار چھوڑا ہوا تھا۔ ”نہیں سائیں! میں اسے پہچان تو نہیں سکا ویسے اس آدمی کا حلیہ مجھے کسی بدنام دھاڑیل (ڈاکو) ہی کا لگ رہا تھا۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ دودا سائیں کی ہفتہ وار وزن پاڑیں کی محفل میں دھاڑیل بھی آتے تھے۔ ہو سکتا ہے اس نے کسی دھاڑیل سے واسطے داری (راہ و رسم) بڑھالی ہو۔“ خیر و نے گویا اپنا خیال ظاہر کیا اور محرم علی اس کی بات سے زیادہ اس کی قیاس آرائی پر ٹھنک گیا۔ خیر و کی بات اس کے دل کو لگی تھی۔ محرم علی کو ایک واضح نوعیت کے خدشے اور ”فکھرے“ نے گھیر لیا تھا۔ اب..... اسے اس بات کا ادراک ہو چلا تھا کہ ہو سکتا ہے علی بخش اپنا بدلہ لینے کے لیے کسی دھاڑیل سے راہ و رسم بڑھانا چاہ رہا ہو چونکہ وہ ان کے مقابلے میں اکیلا تھا اس لیے وہ اب ان لوگوں سے نمٹنے کے لیے جرائم پیشہ افراد کے ساتھ ملنے کی کوششیں کر رہا تھا..... اور یہ بات محرم علی کے لیے ہی نہیں بلکہ اس کی ماں خیراں اور ماموں دوست محمد اور محمد علی کے لیے بھی باعث تشویش تھی۔ محرم علی نے لمحے بھر کی خاموشی کے بعد پھر اپنے گماشتہ خیر و سے پوچھا۔ ”خیر و.....! تو نے ان کی باتیں سنی تھیں۔ کیا باتیں کر رہے تھے آپس میں وہ دونوں.....“

”سائیں..... وہ دونوں چوکیدار والے چھپرے تلے بیٹھے تھے..... وہاں سے ان کی باتیں سننا بہت مشکل ہو رہا تھا..... لیکن پھر بھی میں نے یہ سنا تھا کہ.....“ خیر و تھوک نلگنے کے لیے ذرار کا تو محرم نے جلدی سے کہا۔

”ہاں..... ہاں بول..... کیا سنا تھا تو نے؟“

خیر و بتانے لگا۔ ”علی بخش کچھ ایسی باتیں کر رہا تھا جیسے اس کے ساتھ کوئی نا انصافی یا زیادتی ہو رہی ہو اور اس شخص یعنی دھاڑیل سے وہ مدد بھی مانگ رہا تھا۔“

محرم علی کو اب اپنے خدشے کی حقیقت کا انداز ہونے لگا تھا..... جتنا ہم وہ چند ثانیے خاموشی کے بعد بولا۔ ”خیر و! اب میری بات غور سے سن.....“

”جی سائیں! حاضر.....“ خیر و مستعدی سے بولا۔

”دیکھ خیر و.....! اب تو علی بخش کی مسلسل نگرانی کرنا اور ساتھ ہی اس دھاڑیل نما

کہ گھوڑوں کی معیت میں آنے والا کون ہو سکتا تھا۔ وہ بیچ سے اٹھا۔ اجرک سنبھالی اور ہوٹل کے چھپرے احاطے سے نکل کر پچھواڑے آگیا۔ دھندلی اور غبار آلود سرد ٹھنھرتی فضا میں اسے سامنے چند اونچے اونچے قد و قامت کے اکیلے گھوڑے دکھائی دے گئے۔ ان کی تعداد پانچ تھی۔ پانچوں سوار گھوڑے سے اتر آئے تھے اور وہ اب وہ ایک کچی گارے مٹی سے بنی ہوٹل کی عقبی کوٹھڑی کے پچھواڑے بنے ایک پٹ کے دروازے والی بند چوکھٹ کے قریب کھڑے تھے۔ چاند کی دھندلی اور مدھم روشنی میں ان کے ہیولے بڑے پراسرار نظر آ رہے تھے۔ وہ سب سیاہ لباس میں ملفوف تھے اور چہروں پہ ان کے اجرکوں کے ڈھانٹے بندھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس سیون ایم ایم کی رائفلوں کے علاوہ کلاشنکوفیں بھی تھیں۔

انہوں نے شاید علی بخش کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ لیا تھا کیونکہ وہ اپنی جگہ جم سے گئے تھے۔ پھر معاً ان پانچوں میں سے ایک جو نسبتاً طویل القامت تھا اپنے دونوں بازو پھیلاتا ہوا علی بخش کی جانب آیا اور ایک بھر پور معافہ کرنے کے بعد بولا۔ ”آ..... جوان..... کیسا ہے تو..... لگتا ہے تو کچھ پریشان ہے۔“ یہ اکو دھاڑیل تھا جس کی تیز نگاہیں علی بخش کو اپنے وجود میں سرایت کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔

جواباً علی بخش نے کہا۔ ”ہاں چا چا.....! ایسی ہی بات ہے، کہیں بیٹھ کر بتاؤں لگا۔“

”ہا..... بابا..... ٹھیک ہے۔“ اکو دھاڑیل کھلے دل کے ساتھ بولا پھر عقب میں اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کھر کھراتی آواز میں بولا۔ ”اڑے شمن..... بابا تم لوگ اندر جا کر موج میلا کرو..... میں ذرا اس جوان کے ساتھ کچھ راز کر لوں۔“ پھر وہ علی بخش کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”ہاں جوان کہاں بیٹھیں بابا.....“

”آؤ چا چا سائیں!“ علی بخش نے کہا۔ پھر وہ دونوں ہوٹل کی عقبی کچی دیوار سے لگے ایک چھپرے تلے مٹی کے چبوترے پر بیٹھ گئے۔ یہاں ایلے اور کٹڑی کے ٹوٹوں کا لاؤ روشن تھا۔ درحقیقت یہ جگہ شبینہ ڈیوٹی انجام دینے والے چوکیدار کے استعمال میں تھی۔

”ہاں بابا..... اب بول کیا پریشانی ہے تجھے.....“ اکو دھاڑیل نے اپنی عقابی نگاہوں سے گرد و پیش کے تاریکی اور غبار آلود سنارے کا جائزہ لیتے ہوئے علی بخش کو مخاطب کر کے کہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کسی بات کی جلدی ہو۔

”چا چا.....! میری سوتیلی ماں اور اس کے بھائی وغیرہ میری جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔“ علی بخش نے بتایا اور اکو دھاڑیل چونکتی ہوئی نگاہوں سے اس کی جانب خاموشی سے تنکے لگا جیسے وہ اس اجمال کی تفصیل جاننے کے لیے بے چین ہو۔ پھر علی بخش اسے تفصیلاً

ہوٹل میں ہر جمعرات کی رات کیا ہوتا ہے؟ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وڈے بھرا کی بات درست ہے، ہمیں پولیس کو بروقت مطلع کر کے دونوں کو اندر کروادینا چاہئے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری.....“ محمد علی نے اپنے بھانجے محرم علی کی بات سے اختلاف اور بھانجی دوست محمد کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

اس دوران خیراں بالکل خاموش بیٹھی اپنے دونوں بھائیوں اور بیٹی کی گفتگو سن رہی تھی۔ کمرے میں ایک لمحے کو پھر سکوت سا چھا گیا۔ انگیٹھی میں سلگتے ہوئے شعلوں کی حدت سے ان سب کے چہرے تپے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

”ادی خیراں! تو بھی کچھ بتا..... آخر کیا کیا جائے۔“ انجام کار دوست محمد نے اپنی بہن خیراں کو مخاطب کرتے ہوئے رائے لی تو وہ ہر خیال لہجے میں بولی۔

”ادا..... خیال تو میرا بھی یہی ہے کہ جس وقت علی بخش اور اس کا دوست دھاڑیل..... ایک ساتھ موجود ہوں تو پولیس کو خبر کر دینی چاہئے اور رہی بات ہوٹل کی بدنامی کی تو وہ تو ہم ویسے ہی فروخت کر رہے ہیں..... پھر بھلا ہوٹل کی بدنامی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟“ خیراں نے آخری بات اپنے بیٹے محرم علی کی جانب دیکھتے ہوئے کہی تھی کیونکہ یہ اعتراض اس نے ہی کیا تھا..... لہذا وہ پُر زور لہجے میں بولا۔

”بات پھرو ہیں یہ آئی امز گودی! ہوٹل کی بدنامی کے بعد بھلا کون اسے خریدے گا۔“

”میرا خیال ہے پھر بھی یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے، خریدنے والے بہت ہیں۔“

محمد علی نے کہا اور وہ سب بالآخر اس کی بات پر متفق نظر آنے لگے۔

☆=====☆=====☆

سرد اور خن بستہ رات میں نیل گاڑی کا شہر تک کا سفر اگرچہ بیزار کن اور انتہائی تھکا دینے والا تھا مگر..... شاید ساون کے لیے یہ سفر ایک خوشگوار تبدیلی کا باعث تھا کیونکہ یہ سفر اس کی محبوبہ دلنواز اللہ رکھی کی سنگت میں جو تھا..... لیکن ساون محسوس کر رہا تھا کہ اللہ رکھی کافی پریشان اور مضطرب سی نظر آ رہی تھی۔ ساون خاموشی کے ساتھ کو چپانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ چاچی عنایتاں کو پیال کے اوپر گودڑ وغیرہ ڈال کر اوپر دو تین موٹی موٹی ریلوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا..... اللہ رکھی بھی نیل گاڑی کی ایک جانب اور ساون کی پشت کے ذرا قریب رلی اوڑھے سکڑی سمٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ ساون نیل گاڑی چلاتے ہوئے حتی الامکان کوشش کر رہا تھا کہ دوران سفر اللہ رکھی کا دل بہلتا رہے یہی وجہ تھی کہ وہ گاہے بہ گاہے شاہ لطیف ”کی سر کوھیاری..... بھی گنگنا تا جاتا..... لیکن اللہ رکھی کا اضطراب کسی طور

شخص کا بھی پتہ چلانا کہ وہ کون ہے؟ کہاں رہتا ہے اور اس کا نام کیا ہے۔ بس جہاں تک ہو سکے اس شخص کے بارے میں پوری معلومات حاصل کر کے مجھے بتانا..... کیونکہ اب ان دونوں کے درمیان اور بھی ملاقاتیں ہوں گی، سمجھ گیا۔“

”ہا..... سائیں.....! آپ فکر ہی نہ کرو۔ بڑا سچل کام کروں گا۔“ خیر و مخصوص لب و لہجے میں بولا پھر محرم نے مسکراتے ہوئے اسے اپنی جیب سے اجرت خاص کے طور پر چند بڑے نوٹے نکال کر تھما دیئے تو خیر و کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

☆=====☆=====☆

باہر ٹھہرتی ہوئی رات میں غضب کا جاڑا اتر ا ہوا تھا۔ چہار سو گہرا سکوت طاری تھا۔ علی بخش اپنے کوٹھڑی نما کمرے میں بے خبر سو رہا تھا۔ البتہ ایک دوسرے کمرے میں موجود وہ چاروں متفکر سے آنے سائے کی چار پائیوں پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ یہ خیراں اور اس کے دونوں بھائی دوست محمد اور محمد علی کے علاوہ بیٹا محرم علی تھے۔ ان کے بیچ کچے فرش پر کونکوں کی انگیٹھی روشن تھی جس میں دھکتے ہوئے شعلوں نے کمرے کی محدود فضا کو قدرے گرم کر دیا تھا۔

”ادی خیراں! پٹ محرم علی کا خیال بالکل درست ہے۔“ معاً دوست محمد کی سرگوشی ابھری۔ اس نے اپنے بھانجے محرم علی کی کسی بات کی تائید میں یہ کہا تھا لہذا وہ مرید بونا۔ ”یہ کمینہ علی بخش.....! ہمارے خلاف اندر ہی اندر کوئی محاذ بن رہا ہے..... اور یہ بات بھی بالکل درست ہے کہ علی بخش کسی بدنام دھاڑیل کی اس سلسلے میں مدد حاصل کرنا چاہ رہا ہے۔ کیونکہ اتنا تو مجھے بھی پتہ ہے کہ اداد دودا خان کے ہوٹل میں ہفتہ وار جو وزن پاڑیں (نشہ، جوا) وغیرہ کی محفل جمتی ہے وہاں نامی گرامی دھاڑیل مختلف بھیں میں آتے ہیں..... ضرور علی بخش نے وہیں کسی دھاڑیل سے گٹھ جوڑ کر لی ہوگی۔“ دوست محمد نے اپنی گفتگو ختم کی تو محمد علی بولا۔

”اب آگے کا سوچو..... اس کا کیا کیا جائے۔ اس طرح تو یہ ہم سب کے لئے بڑا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے؟“

”میں تو کہتا ہوں کہ اچانک پولیس کا چھاپہ لگوا کر ان دونوں کو ہی پکڑوا دیتے ہیں۔“ دوست محمد نے اپنی رائے دی لیکن محرم علی اس سے اختلاف کرتے ہوئے بولا۔

”نہیں ماما سائیں..... اس طرح تو خود ہمارے ہوٹل ہی کی بدنامی ہے۔“

”خیر اب ایسی بات بھی نہیں ہے..... جاننے والے سب جانتے ہیں کہ ہمارے

بھی کم نہیں ہو پارہا تھا۔ رات کے سناٹے میں بیل گاڑی کے ناہموار چوٹی پہیوں کی چوں..... چک..... چک..... چوں..... چک..... چک کی مخصوص آواز انتہائی عجیب اور قدرے ناگوار لگ رہی تھی۔

بیل گاڑی اب کپاراستہ چھوڑ کر سیدھی شہر جانے والی پکی سڑک پر آگئی تھی۔ پختہ سڑک کے شروع ہوتے ہی ساون نے بیل گاڑی کی رفتار ذرا تیز کر دی تھی۔ آسمان میں کہیں کہیں ٹمٹماتے تاروں کی مدھم مدھم روشنی میں سامنے سڑک کھیتوں کھلیانوں کے درمیان سے بل کھاتی ہوئی دور تاریکی میں گم ہو رہی تھی۔ سڑک دور تک ویران تھی۔ ساون کی چونکہ اللہ رکھی کی جانب پشت تھی اسی لئے وہ اس کی سرنگیں آنکھوں میں آنسوؤں کی جھللاہٹ دیکھنے سے قاصر تھا۔ درحقیقت اللہ رکھی کو آج سے کافی عرصہ قبل کا وہ دردناک منظر یاد آ رہا تھا جب اسی طرح وہ اپنے پیار بوڑھے باپ مٹھل کو بہ غرض علاج ایسی ہی ٹھہرتی تاریک رات میں شہر لے جا رہی تھی اور اس وقت اس کا چاچا سوڈھل اس کے ہمراہ تھا..... مگر بد قسمتی سے اس کا باپ راستے ہی میں دم توڑ گیا تھا۔ اگرچہ وہ اس تلخ اور سفاک حقیقت سے بے خبر تھی کہ اس کا بیمار بوڑھا باپ بیماری سے نہیں مرا بلکہ..... اس کے لالچی اور سفاک چاچانے ہلاک کر ڈالا تھا اور بعد میں وہ خود بھی عبرتناک موت سے ہمکنار ہو کر جہنم واصل ہو چکا تھا۔

”اللہ رکھی کیا سوچ رہی ہے تو..... چاچی تو ٹھیک ہے ناں.....“ دفعۃً ساون نے پیچھے سڑی سٹی بیٹھی اللہ رکھی سے پوچھا تو وہ چونکہ کرخیاالات سے باہر نکلے۔ پھر دھیرے سے قریب لیٹی چاچی عنایتاں کے بیمار وجود پر سے رلی اٹھا کر اس کی پیشانی پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے جواباً مغموم سے لہجے میں بولی۔

”ساون! چاچی کو ابھی تک بخار چڑھا ہوا ہے۔“ اس کی مرتعش آواز سے ساون نے اس کے گہرے غم کا اندازہ لگایا لہذا وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

”اللہ رکھی.....! رب سائیں سے دعا کر..... وہ ٹھیک کرے گا..... پریشان نہ ہو۔ ہم صبح تڑکے شہر پہنچ کر ہی دم لیں گے۔ تیرے دونوں بیل ہیرا اور سانولا بہت ٹکڑے ہیں، یہ تھکنے والے نہیں۔“ اللہ رکھی کو ساون کی گفتگو نے کافی تسلی دی تو اسے ذرا حوصلہ ہوا۔ پھر اللہ رکھی نے ساتھ لائی ہوئی دوا کی ایک شیشی کا ڈھکنا کھولا اور اس کے ڈھکن میں دوا الٹ کر عنایتاں چاچی کے چہرے سے رلی تھوڑا ہٹائی پھر وہ دوا اس کے ادھ کھلے ہونٹوں کے بیچ انڈیل دی۔ بیل گاڑی کے پچکولوں کی وجہ سے دوا ذرا چھلکی مگر اس نے جیسے تیسے کوشش

کر کے ایک اور دوا سے بھرا ڈھکن چاچی کے منہ میں انڈیل دیا۔ یہ دوا حکیم بڈھل نے دی تھی۔ جو محض عارضی افات کے سوا اور کوئی خاص فائدہ نہیں دیتی تھی..... مگر اللہ رکھی کو اس وقت یہی دوا غنیمت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں بیمار چاچی عنایتاں کی صحت یابی کے لیے اور جلد از جلد شہر کے ہسپتال پہنچنے کی دعائیں مانگے جا رہی تھی۔ ساون شاید اس طویل خاموشی کا مطلب جانتے ہوئے اب خاموشی سے بیل ہانکنے میں مجھوتا۔

☆=====☆=====☆

اگلے دن پورے گوٹھ داد پور میں ساون سے متعلق یہ افواہیں گردش کرنے لگی تھیں کہ ساون نہایت ہی چالاکی سے اللہ رکھی کو شہر بھگا کر لے گیا ہے اور اس فرار میں چاچی عنایتاں بھی ملوث ہے۔

ان افواہوں کو تقویت پہنچانے والے نشی میرل کے آدمی سرفہرست تھے۔ یوں تو درون خانہ گوٹھ کے لوگوں کو اس حقیقت کا علم تھا کہ ساون اور اللہ رکھی کے درمیان کسی قسم کا تعلق ہے..... لیکن اب ان افواہوں نے ایسے لوگوں کے منہ بھی وا کر دیئے تھے..... یہ بھی ایک امر واقعی ہے کہ جو واقعہ جس قدر اچانک رونما ہوتا ہے وہ اسی قدر زیادہ افواہوں کی زد میں آکر مشہور بھی ہوتا چلا جاتا ہے..... ہر چند کہ کچھ مثبت انداز فکر رکھنے والے افراد نے یہ قیاس بھی لگایا تھا کہ چونکہ چاچی عنایتاں کافی عرصے سے بیمار تھی..... اور گوٹھ میں اس کا مرض بھی لا علاج ہو چکا تھا لہذا ہو سکتا ہے کہ اس کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہو اور ساون ازراہ ہمدردی اسے شہر لے گیا ہو..... لیکن بات پھر گھوم پھر کر وہیں آتی تھی کہ..... آخر یہ کار خیر ساون ہی نے کیوں انجام دیا جبکہ دونوں کے گھر شمالاً جنوباً واقع تھے..... مزید یہ کہ اتنی رات گئے آخر ان کا اتصال کیوں کر ممکن ہوا تھا۔

☆=====☆=====☆

”اڑے میرل تیری ہندیا تو پھر الٹ گئی..... وہ چھوکر اتواں حور پری کو ہی لے اڑا..... اب کیا ہو گا؟“ وڈیرے لکھ میر خان نے قریب کھڑے نشی میرل کو مخاطب کر کے کہا..... تو وہ کھسیانی سی ہنسی کے بولا۔

”برابر سائیں وڈا..... کچھ کرنا پڑے گا۔ یہ چھوکر اسواں کچھ زیادہ ہی چالاک ثابت ہو رہا ہے..... وڈے خان جیسے شخص کو اس نے جتنی کا ناچ نچا رکھا تھا.....“

”میرل..... اڑے میں نے تجھے اس چھوکرے کی تعریفیں کرنے کے لیے نہیں بلایا ہے..... سمجھا..... مجھے کھڑ تیل چاہئے، نتیجتاً..... کام..... سمجھ.....“ وڈیرا خمناک نظروں سے

باثر اور منشی میرل جیسے سودمند شخص کا آشیر واد حاصل کرنے کے لیے ان کے ہر حکم کے آگے سر تسلیم خم کئے رہتا تھا..... اور اکثر اپنی طلاق یافتہ بہن فضاں کو بھی بوقت ضرورت حویلی میں خدمت چاکری کے لیے بھیجتا رہتا تھا لہذا میرل نے اللہ رکھی کو سہل طریقے سے وڈیرے کی حویلی کی ”باندی“ بنانے کے لیے خانو دھچر کو آگے کیا تھا..... مگر عین وقت پر سوڈھل کی موت نے منشی میرل کا سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا تھا۔

بہر طور میرل..... خانو کے گھر پہنچا تو اس وقت شام کافی اتر آئی تھی۔ حسب توقع خانو دھچر کے کچے مکان کی دیواروں پر اگلے چھپے ہوئے تھے..... اس نے اپنی ناک سیکیڑی پھر شکستہ سی چوکت پر جھولتے ٹاٹ کے پردے کو پرے کرتے ہوئے اس نے زور سے دستک دی..... تھوڑی دیر بعد اندر سے کسی نے پوچھے بغیر دھڑ سے دروازہ کھول دیا۔ یہ خانو دھچر کی بہن فضاں تھی..... منشی میرل کو دیکھتے ہی اس کے سانولے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ چل گئی اور پھر وہ جیسے بچتے ہوئے بولی۔

”آؤ منشی صاحب.....! تساں نے ہمارے گریب خانے کی رونقاں ہی بڑھا دی..... آؤ سائیں..... آ جاؤ اندر.....“ وہ چپکتے ہوئے ایک طرف ہٹ گئی..... منشی میرل نے اندر قدم رکھا، کچے اور ناہموار صحن کے ایک جانب چھپر تلے ایک انگیٹھی سلگ رہی تھی۔ فضاں نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک خستہ ساسر کندوں کا بنا مونڈھا..... سلگتی انگیٹھی کے قریب سرکا دیا اور میرل سے مخاطب ہوئی..... ”آؤ..... سائیں..... ادھر بیٹھو..... آگ کے پاس..... آج تو دو پہر ہی سے سردی زوروں پر ہے.....“

فضاں کا خیال تھا کہ حسب عادت منشی میرل اسے ہی آگ کی مثال ٹھہراتے ہوئے جلت بازی سے کام لے گا..... لیکن اسے اس وقت مایوسی ہوئی جب میرل کا چہرہ بالکل ساٹ رہا اور وہ خاموشی سے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر گہری تفکیر گھنڈی ہوئی تھی جسے دیکھ کر فضاں کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

”خانو دھچر.....! کہاں ہے!“ دفعۃً میرل نے پوچھا۔

”ابھی آتا ہوگا..... وہ چاولوں کا آٹا پانے گیا ہے عبدالغفور کی چکی پے.....“ لمحہ نبر تو فحش کے بعد وہ بغور میرل کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے متحیر ہوئی..... ”سائیں خیر تو ہے نا..... آج تمہارے چہرے پر بڑی گرتی (پریشانی) نظر آرہی ہے.....“

”نہیں اس کی لوز نہیں..... بس میں آگ تاپ رہا ہوں اور خانو دھچر کا انتظار کروں.....“

منشی میرل کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”دیکھ منشی! میرا کام بہت جلد ہونا چاہئے.....؟ اگر تو نے دس دنوں کے اندر اندر اللہ رکھی کو میری حویلی کی باندی نہ بنایا..... تو..... آگے تو خود جانتا ہے چنگی طرح.....“ اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

منشی میرل کی حالت دیدنی تھی۔ اسے وڈیرے نے جو کام سپرد کیا تھا اس کے لیے تو پورا مہینہ بھی کم تھا..... پہلے وہ جس کام کو سہل سمجھ رہا تھا اب وہی اسے کاردار نظر آرہا تھا..... کیونکہ جب تک ساون اور اللہ رکھی گوٹھ میں موجود تھے تو اسے امید تھی کہ وہ ان دونوں کو انجام کار بہلا پھسلا کر حویلی کا غلام بنالے گا..... یہ اور اسی لئے اس نے ساون کو بھاری قرض دے کر گویا ایک طرح اس کے گلے میں غلامی کی زنجیر ڈالنا چاہی تھی..... لیکن اب ساون اور اللہ رکھی کے اچانک غائب ہو جانے سے یہ معاملہ کھٹائی میں پڑتا نظر آرہا تھا..... تاہم وڈیرے کو تسلی دینے کی غرض سے بولا۔

”سائیں بھوتار! پچاس ہزار کی رقم میں ساون کے تو فرشتوں سے بھی وصول کر کے رہوں گا..... نہیں تو میں اس کے پورے کنبے کو بیگار پر زمینوں پر گھسیٹ لوں گا..... آپ بے فکر رہو..... میں نے کچے کاغذ پر اس کا انگوٹھا لگوا لیا ہے.....“

وڈیرے نے منشی میرل کو خشناک نظروں سے گھورا اور نخوت آمیز لہجے میں بولا..... ”ارے میرل..... میں نے کہا نا بابا..... مجھے دس دنوں کے اندر اندر اللہ رکھی چاہئے اور بس.....! یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا جانے کے لیے..... اب منشی اوطاق میں اکیلا رہ گیا..... اس کے اندر شدید قسم کی پکڑ دھکڑ جاری تھی..... اس نے اپنے کان میں انکی ہوئی پنسل نکال کر ایک جانب پھینکی اور ہاتھ میں پکڑے رجسٹر کو قریب ہی مونڈھے پر اچھالا..... پھر وہ اوطاق سے باہر نکل آیا..... وہ اب تیز تیز قدموں سے خانو دھچر کے گھر کی طرف جارہا تھا..... دل ہی دل میں وہ اس وقت کو کوٹنے لگا..... جب اس نے اللہ رکھی کے حسن و جمال سے وڈیرے لکھ میر خان کو آگاہ کرتے ہوئے اسے اس حد تک مجنوں بنا دیا تھا کہ اب وہ میرل کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ بالآخر میرل نے اب یہ طے کیا کہ منشی گیری کرتے ہوئے وہ یہ مسئلہ حل نہیں کر سکتا اس کے لیے اب اسے بد معاش بننا پڑے گا اور اس سلسلے میں اسے خانو دھچر سے زیادہ کوئی اور سودمند شخص نظر نہیں آیا تھا..... وہ جانتا تھا کہ خانو دھچر ایسا شخص تھا جو ہر دم ان کے پاؤں چاٹنے کے لیے تیار رہتا تھا..... یہی نہیں بلکہ اپنے ”سائیں وڈوں“ کی خوشنودی اور سرخروئی حاصل کرنے کے لیے انتہا درجے کی بے غیرتی اور کمینے پن کی مثال بننے سے بھی نہیں چوکتا تھا..... یہی وجہ تھی کہ خانو دھچر وڈیرے لکھ میر خان جیسے

گا۔“ میرل نے کہا..... اس کے سپاٹ لہجے سے ژولیدگی مترشح تھی۔ فضیلاں گوگو کے عالم میں کھڑی رہ گئی۔

☆=====☆=====☆

علی بخش کو دھاڑیل سے ملنے کے بعد خاصا مطمئن ہو گیا تھا..... اس کے چہرے پر اب الجھن یا پریشانی کی بجائے بے خوفی اور دلیری نے لے لی تھی..... جس کا نفسیاتی اثر اس کی سوتیلی ماں، خیراں، دونوں ماموؤں دوست محمد اور محمد علی علاوہ ازیں اس کے بھائی محرم علی پر یوں پڑا کہ انہوں نے فوری چپ سادھ لی تھی..... یعنی وہ اس پر اب کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے تھے..... علی بخش کو ان کے گوگو چہروں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ اب ایک بے نام سے خوف میں مبتلا ہوں..... تاہم علی بخش کا جب بھی ان سے سامنا ہوتا تھا انہیں ایسی زخمی نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا جیسے اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کا ایک ایک حساب لینے کے لئے بے چین ہو۔ بہر طور علی بخش اپنے اوقات کار کے مطابق صبح ہوٹل سنبالتا اور دوپہر کے بعد گھر رہتا۔ ایک دن وہ اپنا ”وقت“ پورا کر کے گھر آیا تو خیراں نے اس سے پوچھا..... ”محرم علی آج صبح بھی تیرے ساتھ تھا ہوٹل میں.....؟“

”نہیں.....“ علی بخش نے سرد لہجے میں مختصر جواب دیا.....  
”تو پھر کہاں ہے وہ..... آج صبح ہی سے گھر بھی نہیں آیا.....“ اس کی ماں خیراں کے لہجے میں تفکر تھا۔

”مجھے کیا معلوم.....؟“ علی بخش کے اندر دھکن پکڑ شروع ہو گئی تھی..... وہ اب اپنے کمرے میں آکر چار پانی پر لیٹ گیا..... دوپہر کا کھانا وہ ہوٹل ہی سے کھا کر آتا تھا..... ادھر خیراں اپنے بیٹے محرم علی کے لیے پریشان ہوئی جا رہی تھی اور ساتھ ہی علی بخش کی بے اعتنائی پر وہ اندر ہی اندر کھل بھی رہی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ علی بخش اس کے بیٹے کو ڈھونڈنے جائے..... وہ اسے بول بھی نہیں سکتی تھی..... کیونکہ وہ جانتی تھی کہ انہوں نے علی بخش کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا ہوا تھا۔ مگر اس وقت اسے مزید پریشانی نے آگھیرا جب شام میں..... ہوٹل سے ایک ملازم محرم علی کو بلانے کے لیے آیا تو خیراں اپنا سینہ پیٹ کر علی بخش کے آگے بین کرنے لگی..... ”جا..... پٹ..... میڈلے لعل کو ڈھونڈ جا کر..... پتہ نہیں کہاں ہے وہ.....“

علی بخش نے ایک نظر خیراں کو دیکھا..... پھر خاموشی سے باہر نکل گیا..... مگر باہر آتے ہی وہ محرم علی کو ڈھونڈنے کی بجائے ہوٹل آ گیا..... وہ جان گیا تھا کہ کو دھاڑیل نے اپنا

جو ہر دکھایا ہے..... وہ اب خوش تھا اپنی سوتیلی ماں خیراں کو پریشان دیکھ کر..... رات گئے وہ گھر آیا تو..... اسے اس وقت مزید طمانیت حاصل ہوئی جب خیراں کو اس نے انتہائی بے چارگی اور بے بسی کے عالم میں اپنے سامنے گڑ گڑاتے ہوئے پایا..... وہ اسے دیکھتے ہی بولی..... ”پٹ علی بخش..... کیا ہوا..... میڈلے لعل نہیں آیا..... تجھے نہیں ملا وہ..... کہاں ہے میڈلے محرم علی..... علی بخش تجھے رب سائیں کا واسطہ..... اپڑیں مرشد کا واسطہ..... جامیرے لعل کو ڈھونڈ کر لادے.....“

علی بخش نے ایک نفرت انگیز نگاہ سے خیراں کو گھورا..... جیسے دل میں اس سے کہہ رہا ہو کہ..... اس وقت تیری متا کہاں جا سوتی تھی جب تُو نے اپنے دونوں بھائیوں اور بیٹے سے مجھے پٹوایا تھا..... میں بھی آخر کسی کا بیٹا تھا؟ مگر وہ چپ رہا..... ”اچھا تُو نہیں جانتا تو میں خود جانی ہوں اپنے لعل کو ڈھونڈنے.....“ خیراں اسے بدستور خاموش دیکھ کر بولی..... اور سر پہ چادر اوڑھ کر ابھی باہر ہی نکلنا چاہتی تھی کہ علی بخش نے اس کا راستہ روک لیا۔

”اس وقت رات ہو رہی ہے، تو کہاں جائے گی..... ذرا ماٹھ (صبر) کر..... ہو سکتا ہے وہ یار دوستوں کے ساتھ شہر نکل گیا ہو.....“ علی بخش نے اسے بالآخر تسلی دینے کی کوشش کی مگر اسے اپنے لہجے کا کھوکھلا پن محسوس ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خیراں کو بھی تسلی نہیں ہوئی۔ لہذا قدرے تیز لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

”علی بخش..... تُو میرے آگے سے ہٹ جا..... میرا محرم جب تک گھر نہیں آئے گا میں چین سے نہیں بیٹھ سکتی.....“ مگر علی بخش اپنی جگہ سے ہلاکت نہیں..... اس بار خیراں نے پہلے سے بھی تیز اور قدرے غصیلے لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا..... ”علی بخش! میں کہتی ہوں ہٹ جا..... میرے راستے سے..... مت بھول کہ میں تیری ماں بھی ہوں۔“

”میں صرف یہ جانتا ہوں کہ تُو میرے پیو (باپ) کی زال ہے اور اس کی زوجہ (عزت) بھی..... اتنی رات کو میں تجھے نہیں نکلنے دوں گا.....“ علی بخش نے بلند آواز اور سپاٹ لہجے میں ماں کی جانب تکتے ہوئے کہا..... اس کے لہجے کی قطعیت نے خیراں کا سارا جوش بخارات بنا کر ہوا میں تحلیل کر دیا مگر چپ وہ پھر بھی نہ رہ سکی، تنک کر بولی۔

”میں تیرے پیو (باپ) کی اگر زوجہ (عزت) ہوں تو تیری ماں بھی ہوں..... اور محرم علی بھی تیرا بھائی لگتا ہے..... مگر تُو اسے ڈھونڈنے کی بجائے آرام سے گھر چلا آیا ہے ہونہہ۔“ اس کا رویہ حسب فطرت تصحیک آمیز ہو گیا.....

علی بخش کو اس کی بات پر غصہ تو بہت آیا اور جی میں بھی اس کے آئی کہ اس سے کہے

”بابا! ادا ساون کو ماپھ کر دے..... پتہ نہیں کہاں ہوگا..... آج تیسرا دن ہے اس کو کچھ کرو بابا.....“ یہ کہہ کر وہ سسکیاں بے کر رونے لگی۔ موگو کا دل بھی بیٹی کو روتے دیکھ کر پیچنے لگا۔ مگر اس نے اپنی رقت غم ان پر ظاہر نہیں ہونے دی..... اس کے چہرے پر تفکیر آمیز لکیریں سی نمودار ہونے لگی تھیں۔ آخر کو وہ ساون کا باپ تھا..... بے شک اپنے بیٹے سے ناراض تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ اپنے جوان کڑیل بیٹے کی گمشدگی پر چپکا بیٹھا رہے..... مگر جب اس کی نافرمانی یاد آنے لگتی تو اس کا دل پتھر ہونے لگتا کیونکہ اس کے چھوٹے بھائی پریل نے بھی اس سے تعلقات مکمل طور پر منقطع کر ڈالے تھے..... اس کے کانوں میں بھی اڑتی اڑتی یہ بھنک پڑ چکی تھی کہ ساون کسی اللہ رکھی نامی لڑکی سے شادی کا خواہاں ہے اور گوٹھ سے ان دونوں کا بیک وقت گم ہونا بھی اس سلسلے کی ایک کڑی تھی..... اس کے ناراض بھائی پریل نے دونوں گھروں کو ملانے والی کھڑکی بھی توڑ کر اس میں کچھ اینٹیں چنوا کر بند کر دی تھی۔

ان سب باتوں کے باوصف اب موگو..... یہ سوچ رہا تھا کہ بھائی تو ناراض ہوا سو ہوا..... پر اپنے بیٹے ساون کو بھی ناراض کر کے اسے کھونا دانشمندی نہ تھی..... پھر اس ضمن میں جب اس کی بیوی اور بیٹی ہدایتاں کے روتے ہلکتے چہروں کی طرف دیکھتا تو وہ ذرا اور خفیف سا ہونے لگتا تھا..... بالآخر اس نے ہامی بھری اور فوری شہر لاڑکانہ جانے کا قصد کیا..... ساون کی ماں اور بہن کے غمناک چہرے یک دم کھل اٹھے تھے۔

☆=====☆

لاڑکانہ کے اس سرکاری ہسپتال میں بھانت بھانت کے مریضوں کا رش تھا۔ ہسپتال کے وسیع احاطے میں جا بجا مریضوں کے ہمراہ آئے لوگوں نے رلیاں، میلی گودڑیاں بچھا کر عارضی قیام کیا ہوا تھا..... یہ وہ افراد تھے جو لاڑکانہ کے اریب قریب کے گاؤں گوٹھوں سے آئے تھے اور ان کے مریض مختلف بیماریوں کے وارڈز میں داخل تھے۔ ایسے میں ہسپتال کے احاطے کی بوسیدہ سی دیوار کے کونے میں رلی اور گودڑی بچھائے ساون اور اللہ رکھی بھی متفکر بیٹھے تھے۔ وہ صبح دم ہی اپنے گوٹھ جا گیر داد پور سے یہاں پہنچے تھے اور یہاں پہنچتے ہی جاں گسل اور تکلیف وہ مراحل سے گزرنے کے بعد چاچی عنایتاں کو آرتھوپڈک (ہڈی) وارڈ میں داخل کرایا تھا۔ آرتھوپڈک سرجن ڈاکٹر نے چاچی عنایتاں کو کچھ دن داخل رہنے کی تاکید کی تھی۔ مذکورہ سرجن ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق چاچی عنایتاں کو آرتھرائس ہو گیا

کہ..... تو نے مجھے بیٹا سمجھا ہی کب ہے..... اور نہ ہی محرم نے اسے اپنا بھائی..... اس کا وجود ایک بار پھر تلخ ہوتا چلا گیا..... تاہم وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ماں جو بے شک سوتیلی اور بری سہیلی لیکن بہر حال اس کی ماں تھی..... اس کا یوں رات میں اکیلے ٹھکانی طور مناسب نہ تھا..... لہذا وہ محض اسے دکھاوے کی غرض سے باہر چلا گیا..... مگر حقیقت یہی تھی کہ وہ پھر سیدھا اپنے ہوٹل چلا آیا۔ مگر جاتے جاتے اس نے کسی ”اندیشے“ کے تحت دروازے کو باہر سے کنڈالگا دیا تھا تا کہ اس کی ماں خیراں مغلوب الحواس ہو کر باہر نہ نکل جائے۔ اس کے دل میں یہی کھد بد ہو رہی تھی کہ ہونہ ہو یہ ”کام“ کو دکھا ڈیل کا ہی ہو سکتا ہے..... جس کا مقصد یہی تھا کہ علی بخش کو اس کے گھر میں تنہا اور کمزور نہ سمجھا جائے۔ اس لئے ہو سکتا ہے وہ ذرا پریشان کرنا چاہ رہا ہو..... بہر طور جو کچھ بھی تھا علی بخش اس سے خوش تھا..... علی بخش کو اس قدر مجروح کیا گیا تھا کہ آج وہ اپنے اوپر زیادتی کرنے والوں کو پریشان اور ڈولیدہ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا..... پھر وہ ہوٹل میں بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہرا تھا اور گھر واپس آ گیا دروازے پر ویسے ہی کنڈا چڑھا ہوا تھا جیسا وہ لگا گیا تھا..... گھر کے اندر قدم رکھتے ہی اسے اپنی سوتیلی ماں کے رونے سسنے کی آواز سنائی دی تھی جبکہ اس کے چہرے پر تلخ سی مسکراہٹ عود کر آئی۔

☆=====☆

ادھر ساون کی اچانک گمشدگی پر اس کے گھر والے بھی پریشان تھے..... اڑتی اڑتی یہ افواہ ان کے کانوں سے بھی ٹکرائی تھی کہ ساون اللہ رکھی کو لے کر بھاگ گیا تھا۔ ساون کی ماں کا تو رو رو کر برا حال ہو رہا تھا اور کم و بیش یہی حال اس کی جوان بہن ہدایتاں کا بھی تھا..... جبکہ اس کے باپ موگو باری پر جنون سوار تھا۔

”ساون کے پیو (ابا) تیکوں رب سوہڑیں دا واسطہ میڈے لعل کو ڈھونڈ لا.....“

ساون کی ماں موگو سے التجائیہ آمیز لہجے میں بولی۔

موگو نے گھور کر اپنی بیوی کو دیکھا اور درشت لہجے میں بولا..... ”ماٹھ (چپ) کر کے بیٹھ..... جو دوبارہ اس بد ذات کا نام لیا تو..... ایسے نافرمان بیٹے کو میں ڈھونڈنے نکلوں..... ہونہ.....“ مگر موگو کے درشت لہجے میں دور کہیں دکھ کی بھی آمیزش تھی..... ایک جانب ساون کی بہن ہدایتاں بھی اپنے سر پہ دھری اجرک کے کونے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ بھائی ساون کی اچانک گمشدگی نے اسے غم سے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا..... وہ باپ سے التجا کرتے ہوئے بولی۔



”اللہ رکھی! میں دوایاں لے کر آتا ہوں.....“ اس نے اللہ رکھی سے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اللہ رکھی نے اسے روکا اور ایک چھوٹی سی میلی پولی کو کھولنے لگی..... ساون جان گیا وہ کیا کرنا چاہ رہی تھی لہذا اسے منع کرتے ہوئے بولا۔ ”رہنے دے اللہ رکھی.....! میں پیسے میرے پاس.....“ یہ کہہ کر وہ رکنا نہیں، اللہ رکھی اسے دیکھتی رہ گئی۔

میڈیکل اسٹورز زیادہ دور نہیں تھا..... ساون ہسپتال کے احاطے کے گیٹ سے باہر آ گیا تھا۔ اس کے پاس خاصی رقم موجود تھی..... وہ اب تک اس میں سے ہی خرچ کرتا چلا آ رہا تھا۔ اللہ رکھی کو ہنوز اس نے یہ نہیں پتہ چلنے دیا تھا کہ یہ رقم وہی ہے جو اس نے وڈیرے لکھ میرخان سے اس کے رشتے کے بدلے لی تھی۔ اللہ رکھی کو اگرچہ یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ ساون سارا خرچہ اٹھا رہا تھا لیکن..... وہ جب اس ضمن میں ساون سے بات کرنے کی کوشش کرتی تو ساون اس کو مصنوعی انداز میں جھڑک کر خاموش کر دیا کرتا تھا..... بہر طور ادھر اللہ رکھی رلی پر بیٹھی ساون کی منتظر تھی..... فضا قدرے صاف تھی..... چمکیلی دھوپ کی تمازت بھلی محسوس ہو رہی تھی..... ہسپتال کی عمارت کے اندر نی گوشے میں رفتہ رفتہ مریضوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور ساتھ ہی مختلف آوازوں کے علاوہ بچوں کے رونے چلانے کی بھی آوازیں آرہی تھیں۔ اللہ رکھی نے جہاں ڈیرا بچھا رکھا تھا وہ احاطے کے بیرونی گیٹ سے اندر داخل ہونے والے لوگوں کو تنکے جا رہی تھی۔ جن میں مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے سب تھے اسے شاید ساون کا انتظار..... پھر اچانک ایک شخص کو دیکھ کر وہ بری طرح ہنسی بلکہ اسے دیکھتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ وہ خانودہ چھر تھا۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ خانودہ چھر نے بھی اللہ رکھی کو دیکھ لیا تھا۔ صرف ایک لمحے کے لیے دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ پھر خانودہ چھر نے جیسے اللہ رکھی کو دیکھا اُن دیکھا کرتے ہوئے ایک دم قدم بڑھائے تھے اور اللہ رکھی نے جیسے سکھ کا سانس لیا۔ وہ یہی سمجھی تھی کہ خانودہ چھر نے اسے پہچانا نہیں تھا..... ورنہ خاصی ذہنی پریشانی اٹھانی پڑتی۔ مگر معصوم اور سادہ لوح اللہ رکھی کی یہ خوش فہمی تھی جبکہ خانودہ چھر نہ صرف اسے بلکہ باہر گیٹ سے نکلتے ساون کو بھی دیکھ چکا تھا تاہم وہ کسی مقصد کے تحت اللہ رکھی کو یہ تاثر دے کر محتاط نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ اسے دیکھ چکا ہے۔ درحقیقت وہ منشی میزل کی ہدایت کے مطابق..... ساون اور اللہ رکھی کو تلاش کرنے کی غرض سے صبح دم ہی گٹھ سے نکلتے والی پہلی مسافر بس میں سوار ہو کر شہر آدھرا تھا..... وہ ایک چالاک اور زیرک شخص تھا۔ لاڑکانہ پہنچتے ہی ادھر ادھر خوار ہوتے رہنے کے بجائے سیدھا ادھر ہی چلا آیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ چاچی عنایتاں بیمار تھی اور وہ اس جگہ

تھا اور علاج میں دیر کرنے کی وجہ سے وہ نہ صرف ایک مستقل قسم کے عذاب ناک درد نما بخار میں مبتلا ہو چکی تھی بلکہ اس بیماری نے اب اس کے دل پر بھی حملہ کر ڈالا تھا یہی وجہ تھی کہ چاچی عنایتاں کو روزانہ دل کے وارڈ میں بھی لے جایا جاتا تھا جہاں دل کے ڈاکٹر سے ہدایت لینے کے علاوہ دیگر متعلقہ روٹین ٹیسٹ بھی ہوتے تھے..... علاوہ ازیں باہر کی ادویات انہیں خود اپنے پیسوں سے ہی لینی پڑتی تھیں..... کیونکہ سرکاری ہسپتال میں برائے نام ہی ادویات مریضوں کو میسر ہوتی تھیں۔

اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے اور حسب معمول یہ لوگ مختلف وارڈز کی راہداریوں میں رات بھر قیام کرنے کے بعد اب ہسپتال کے نچلے عملے نے انہیں باہر احاطے میں بسیرا کرنے کا حکم صادر کر دیا تھا..... کیونکہ اس وقت وارڈز میں متعلقہ شعبہ کے سرجن اور ڈاکٹر پروفیسر وغیرہ راؤنڈ لگاتے تھے۔

ساون اور اللہ رکھی دونوں باہر دھوپ میں رلی پر پاؤں پھیلائے بیٹھے تھے۔ ”ساون! ہمیں کتنے دن اور یہاں رہنا پڑے گا؟“ میرا تو بڑا دل گھبرا رہا ہے یہاں.....“ دفعۃً اللہ رکھی نے لرزیدہ لہجے میں ساون کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ساون نے بڑے رसान کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور تشفی آمیز لہجے میں بولا..... ”اللہ رکھی! حوصلہ پکڑ..... میں ہوں نا تیرے ساتھ، جتنے دن رہنا پڑے..... رہیں گے یہاں..... بس دعا کر اللہ سائیں سے کہ وہ ہماری چاچی کو جلد اچھا کر دے.....“ ساون نے اتنا کہا اور پھر جانے کہاں کھوسا گیا..... اللہ رکھی چپ ہو گئی تھی پھر لمحہ بھر توقف کے بعد وہ پھر بولا..... ”اللہ رکھی! تو یہاں بیٹھ..... چاچی کی دوائیں ختم ہونے کو ہیں..... میں.....“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ..... معاً..... وارڈ کی عمارت سے ایک باوردی وارڈ بوائے باہر احاطے میں نکل کر آیا اور با آواز بلند چلایا۔

”ہڈی وارڈ کے بیڈ نمبر بارہ کی مریضہ کے ساتھ کون ہے۔“ بیڈ نمبر بارہ اور ہڈی وارڈ کا سن کر ساون چونکا، کیونکہ بارہ نمبر کا بیڈ چاچی عنایتاں کا تھا..... وہ جلدی سے اٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔

”یہ لو بابا.....! یہ دوایاں لے آؤ.....“ وارڈ بوائے نے ایک کاغذ ساون کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور مشینی انداز میں واپسی کے لیے گھوم گیا۔ ساون واپس اللہ رکھی کے پاس آیا..... پرچہ اس کے ہاتھ میں تھا۔

کے علاوہ بھلا اور کہاں ہو سکتے تھے۔

لہذا اب وہ اپنے پاؤں اسی دن گوٹھ داد پور لوٹ گیا اور ذرا دیر بعد وہ نشی میرل کے سامنے اوطاق میں بیٹھا اپنی مکار پردازی کی تفصیل بتا رہا تھا۔

”نشی سائیں! اب جو کچھ کرنا ہے ذرا تکتا (جلدی) کر لو۔۔۔۔۔ ورنہ وہاں سے بھی وہ چیز یاڑی تو اس کا ہاتھ آنا مشکل ہو جائے گا۔۔۔۔۔ وہ چھو کر اسون اسے کسی بھی قیمت میں واپس گوٹھ لوٹنے نہیں دے گا۔۔۔۔۔“ خانو دھچر ساری تفصیل بنانے کے بعد پُر زور لہجے میں سامنے مونڈھے پر بیٹھے نشی میرل سے بولا تو نشی میرل دھیرے دھیرے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ پھر بولا۔

”خانو! بابا۔۔۔۔۔ تو ابھی اپنے گھر جا۔۔۔۔۔ میں سائیں بھوتار سے بات کرتا ہوں۔۔۔۔۔ پر صبح تڑکے ادھر ہی آ جانا، ہو سکتا ہے تمہیں پھر شہر جانا پڑے اور اس بار۔۔۔۔۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔۔۔۔۔“ نشی نے کہا اور خانو دھچر مودبانہ انداز میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ”حاضر سائیں۔۔۔۔۔“ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔ اور ادھر نشی میرل نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا، وہ خانو دھچر کے جاتے ہی اوطاق سے نکل آیا۔۔۔۔۔ اس کا رخ وڈیرے کی حویلی کی جانب تھا۔۔۔۔۔ اسے معلوم تھا کہ وڈیرا اس وقت حویلی میں اپنے کمرہ خاص میں موجود ہوگا۔

☆=====☆=====☆

”سائیں بھوتار۔۔۔۔۔! ان دونوں چھو کری اور چھو کرے کا پتہ چل گیا ہے۔۔۔۔۔“ نشی میرل وڈیرے کو اپنی کارگزاری بتاتے ہوئے قدرے پھول کر بولا۔۔۔۔۔ تو وڈیرے لکھ میر خان نے ایک ہی جھڑک میں اس کی ساری ہوا نکالتے ہوئے کہا۔

”اڑے بابا! تو میں کیا کروں پھر۔۔۔۔۔؟ پتہ معلوم ہو گیا ہے تو وار کرنا بابا۔۔۔۔۔ دونوں کو پکڑ لے پھر۔۔۔۔۔ مجھے اللہ رکھی چاہئے بس۔۔۔۔۔“ نشی میرل اپنی جگہ دبک سا گیا۔ پھر فوراً بولا۔

”سائیں دڈا۔۔۔۔۔ برابر۔۔۔۔۔ وہ بات یہ ہے کہ ساون اور اللہ رکھی نے چاچی عنایتاں کو شہر کے بڑے سرکاری ہسپتال میں داخل کرایا ہوا ہے۔۔۔۔۔ اب مجھے خانو دھچر اور چند آدمیوں کے ساتھ شہر جانا ہوگا۔ ظاہر ہے پھر وہاں کچھ روز رکنا بھی پڑے گا۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔“ نشی میرل دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو رہا اور الوؤں جیسے دیدوں سے وڈیرے کی جانب نیکنے لگا۔۔۔۔۔ وڈیرا اس کی بات کا مقصد سمجھتے ہوئے بولا۔

”چنگا بابا چنگا۔۔۔۔۔ شہر میں بنگلہ ہے نا آپڑاں۔۔۔۔۔ بھٹائی ولا۔۔۔۔۔ ادھر تم لوگ رہ لینا۔۔۔۔۔ وہاں چھوٹی جیب بھی ہے۔۔۔۔۔ باقی ادھر سے تم کو ملکھا آپڑیں لینڈ روور میں لے جائے گا۔۔۔۔۔ بس اب جاؤ۔۔۔۔۔“

”وڈی مہربانی سائیں بھوتار۔۔۔۔۔ ہمارا کام آسان ہو گیا۔۔۔۔۔“ نشی میرل یکدم جیسے خوش ہو گیا پھر مزید بولا۔۔۔۔۔ ”بس سائیں اب تھوڑے دنوں کی بات اور ہے۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“

”اچھا بالابالا۔۔۔۔۔ ہالا۔۔۔۔۔ اب جامیرے شغل پاڑیں کا وقت ہو رہا ہے۔۔۔۔۔“ وڈیرے نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا۔۔۔۔۔ اور نشی ہاتھ جوڑتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆=====☆=====☆

”بھٹائی ولا۔۔۔۔۔“ لاڑکانہ کے قدرے متمول علاقے میں واقع ایک قدیم طرز تعمیر کا خوبصورت بنگلہ تھا۔ یہاں زیادہ تر ایم این اے اور ایم پی اے ٹائپ کے سیاستدان فروکش تھے۔۔۔۔۔ بالخصوص ایکشن کے دنوں میں یہاں بڑی گہما گہمی دیکھنے میں آتی تھی۔ اس کے بعد عام دنوں میں یہ بنگلہ ویران پڑے رہتے تھے۔ مکمل طور پر یہاں نوکروں، چاکروں، باورچیوں اور چوکیداروں کا تسلط رہتا تھا۔ وڈیرا لکھ میر خان بھی بلدیاتی ایکشن کے سلسلے میں یہاں ہفتوں قیام کرتا تھا مگر اب یہ خالی تھا۔ نشی میرل اور خانو دھچر لگ بھگ چھ سات دوسرے گماشتوں سمیت یہاں پہنچ چکے تھے۔

☆=====☆=====☆

پھر ایک عجیب واقعہ ظہور پذیر ہوا۔۔۔۔۔ یعنی پورے چھتیس گھنٹے پُر اسرار طور پر گم شدہ رہنے والا محرم علی۔۔۔۔۔ ایک دن خود ہی گھر آ گیا۔۔۔۔۔ اس کی اچانک صحیح سلامت واپسی پر گھر کے سب افراد پہلے تو متحیر ہوئے پھر خوشی سے نہال ہو گئے۔ البتہ علی بخش۔۔۔۔۔ محرم علی کو صحیح سالم لوٹنے دیکھ کر ذرا الجھ گیا تھا۔

شام کا وقت تھا۔۔۔۔۔ خیراں اپنے گھر میں بیٹھی رو رہی تھی اور اس کے دونوں بھائی دوست محمد اور محمد علی اس کے پاس بیٹھے اپنی بہن کو تسلی دے رہے تھے کہ اچانک محرم علی گھر میں داخل ہوا اور پھر وہ سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔۔۔۔۔ محرم علی کا چہرہ کسی انجانے خوف کے زیر اثر اتر ا ہوا تھا۔ وہ اندر سے بہت خوف زدہ تھا اور اس پر ایک سکتے کی کیفیت طاری تھی۔ اس وقت تو اس نے کسی سے بات نہیں کی اور نہ ہی کسی کے سوالوں کا جواب دیا۔ بلکہ اپنے کمرے میں سیدھا جا کر چار پائی پر لیٹ گیا۔ اس کی ماں خیراں اور دونوں ماموں ایک

کر محرم علی چپ ہو گیا۔

خیراں..... بیٹے کی بات پر دہل سی گئی..... جبکہ دوست محمد اور محمد علی کے چہرے بھانجے کی بات پر غصے سے سرخ ہو گئے..... ”ہوں..... تو اب یہ ذلیل ہمیں دھاڑیلوں سے خوف زدہ کرنا چاہتا ہے.....“ دوست محمد دانت پیس کر غراہٹ آمیز انداز میں بڑبڑایا..... اس کا اشارہ علی بخش ہی کی طرف تھا۔

”میرا خیال ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ علی بخش اور اس کے دھاڑیل ساتھیوں کو مزہ چکھادینا چاہئے.....“ محمد علی نے بھی کسی غیر مرمی نقطے پر اپنی غصہ ورنگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

”نا ادا سائیں! یہ کیا کہہ رہے ہو تو تم لوگ.....“ خیراں خوف زدہ لہجے میں اپنے دونوں بھائیوں سے بولی..... ”ان مردور دھاڑیلوں سے بھلا ہم کہاں لڑ سکتے ہیں..... میں کہتی ہوں کہ اب اس موئے علی بخش سے بھی دور رہا جائے..... اور اسے مزید چھیڑنے کی کوشش نہ کی جائے.....“

”یہ تو کیسی باتیں کر رہی ہے ادی.....!“ دوست محمد اپنی بہن خیراں کی بات پر تعجب سے بولا..... ”اس طرح اگر ہم ڈر گئے تو پھر ہم سب کا ہی اللہ حافظ ہے..... پٹ محرم کو اغوا کر کے وہ ہم پر یہی تو رعب جمانا چاہتے ہیں کہ ہم اس کے چیمپے علی بخش سے دور رہیں..... تاکہ وہ ہمارے اس خوف کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دن تمہیں اور پٹ محرم علی کو نکال باہر کریں..... ہوں..... ایسی کی تیزی ان دھاڑیلوں کی..... میں نمٹ لوں گا ان سے.....“ دوست محمد غصے سے پھر گیا تھا۔

”ادی خیراں! بھادوست صحیح کہتا ہے۔ اگر ہم یوں ڈر گئے تو علی بخش ہم پر چڑھ دوڑے گا اسے سبق سکھانا لازمی ہے.....“ محمد علی نے کہا تو محرم علی کو بھی جوش آ گیا..... لہذا بولا۔

”میں تو پہلے ہی تم سب سے کہتا تھا کہ یہ علی بخش ہمارے لئے ایک زخمی سانپ کی مثال بن چکا ہے..... یہ ہم لوگوں کے خلاف پہلے ہی محاذ بنانے میں مصروف تھا.....“ وہ چند ثانیے کے لیے تھما..... پھر پُر زور لہجے میں دوبارہ بولا..... ”تم لوگ بھول گئے میری وہ بات جب میں نے تم لوگوں سے کہا تھا کہ اس علی بخش کی اپنے ہوٹل میں ہی خفیہ طور پر کسی دھاڑیل سے واسطے داری قائم ہو چکی ہے اور اس کے ذریعے اس نے ہم پر اپنا رعب قائم کرنے کی خاطر مجھے اغوا..... اور پھر آزاد کروایا.....“ محرم علی نے اپنی بات ختم کی تو اس کا

دوسرے کا الجھن آمیز حیرت سے منہ تکتے لگے..... علی بخش اس وقت ہوٹل گیا ہوا تھا۔ اندر کمرے میں محرم علی سویا نہیں لیٹا ہوا تھا..... یہی وجہ تھی کہ جب گھٹنے بھر بعد اس کی ماں خیراں گرم گرم دودھ سے بھرا ہوا گلاس لے کر آئی تو فوراً اٹھ کھڑا ہوا..... ماں اس کے قریب ہی چار پائی پر بیٹھ گئی..... اور محبت اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات چہرے پر لیے اسے دودھ پیتا خاموشی سے تکتے لگی۔ محرم علی نے خاموشی کے ساتھ دودھ کا گلاس ختم کیا تو اسی وقت اس کے دونوں ماموں دوست محمد اور محمد علی کمرے میں داخل ہوئے۔

”پٹ..... تیرے ساتھ کیا ہوا ہے..... کچھ تو بول..... بتا ہمیں..... تو کہاں چلا گیا تھا..... یوں بغیر بتائے.....“ اندر داخل ہوتے ہی محرم علی کے بڑے ماموں دوست محمد نے قدرے تفکیر آمیز لہجے میں محرم علی سے استفسار کیا۔

ماموں کی بات پر محرم علی کے چہرے پر ایسا ارتعاش سا ابھرا جیسے وہ خود بھی سب کچھ بتانے کے لیے پُر جوش ہو۔

”مجھے..... دھاڑیل (ڈاکو) اٹھا کر لے گئے تھے.....“ بالآخر اس نے گم صم اور کھوئے کھوئے لہجے میں بتانا شروع کیا تو اس کی ماں خیراں نے ”ہائے گھوڑا.....“ کہتے ہوئے اپنا سینہ پیٹ ڈالا اور اس کے دونوں ماموں دوست محمد اور محمد علی بھی بری طرح چونک پڑے اور حیرت اور تشویش ناک نگاہوں سے محرم علی کی طرف دیکھتے ہوئے استغناء مہیہ لہجے میں بولے۔

”یہ تو کیا کہہ رہا ہے پٹ محرم.....! وہ دھاڑیل کون تھے جو تجھے اٹھا لے گئے تھے.....“

”وہ علی بخش کے ساتھی تھے ماموں.....!“ محرم نے بتایا۔

”کیا واقعی؟“ دوست محمد اور محمد علی کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

”ہاں..... ماموں..... وہ دھاڑیل مجھے اغوا کرنے کے بعد..... میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے ٹھکانے پر لے گئے تھے اور وہاں انہوں نے نے کھلم کھلا اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے ساتھ ہی دھمکی بھی دی کہ..... انہوں نے مجھے علی بخش کی وجہ سے اغوا کیا ہے جو ان کے سردار کا چیمپا ہے..... لہذا علی بخش پر آئندہ جانیدا یا کسی اور معاملے میں دباؤ نہ ڈالیں اور نہ ہی اسے ”اکیلا“ یا کمزور جان کر اس کے ساتھ کسی قسم کا جھگڑایا مار کٹائی کریں..... ورنہ اس کے نتائج برے بھی نکل سکتے ہیں..... پھر ان لوگوں نے مجھے ایک دن اپنے ہاں قید میں رکھ کر اگلے دن آنکھوں پر پٹی باندھ کر چھوڑ دیا.....“ اتنا کہہ

☆=====☆=====☆

علی بخش کو ہوٹل میں کسی نے یہ اطلاع کر دی تھی کہ اس کا چھوٹا بھائی محرم علی گھر آ گیا ہے۔ علی بخش کو اس خبر پر پہلے تو یقین نہیں آیا۔ مگر رات گئے جب وہ گھر لوٹا تو اپنی سوتیلی ماں خیراں اور اس کے دونوں بھائیوں کے طمانیت بھرے چہروں کو دیکھ کر خود علی بخش کا چہرہ اتر گیا تھا۔ وہ اوپری دل کے ساتھ محرم علی سے ملا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ سب عجیب نگاہوں سے اسے تک رہے تھے اور کچھ کھنچے کھنچے سے بھی نظر آرہے تھے۔ اس نے محرم علی اور اس کے دونوں ماموؤں کی آنکھوں میں اپنے لئے معاندانہ چمک بھی محسوس کی تھی۔ تاہم وہ کھری چار پائی پر لیٹ گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ اس کے وجود میں شدید قسم کی کشمکش جاری تھی۔ اگرچہ علی بخش نے محرم علی سے رسماً اس کی گمشدگی کے بارے میں پوچھا۔ لیکن اسے یہی بتایا گیا تھا کہ محرم اچانک کسی ضروری کام سے شہر چلا گیا تھا۔ علی بخش یہی سوچنے میں محو تھا کہ بات وہ نہیں جو محرم علی بتا رہا تھا بلکہ بات کچھ اور ہی تھی۔ جو اس سے دانستہ طور پر اخفا رکھی جا رہی تھی۔ بہر طور۔۔۔ علی بخش کو کھد بد لگ چکی تھی کہ جلد سے جلد اپنے ساتھی کو دھاڑیل سے ملے اور اس ضمن میں اس سے کچھ ”استفسار“ کرے کہ آخر یہ سب کیا تھا؟ کیا۔۔۔ محرم علی کی اچانک اور پراسرار گمشدگی میں اس کا ہاتھ تھا؟ اب علی بخش کو اس رات کا انتظار تھا جب کو دھاڑیل نے اس کے ہوٹل کی ہفتہ وار یعنی جمعرات کی رات کو منعقد ہونے والی خصوصی محفل میں شرکت کرنی تھی۔ مگر علی بخش اس حقیقت سے یکسر غافل تھا کہ کو دھاڑیل کے خلاف اندر ہی اندر کیا کھجوری پکائی جا رہی تھی۔ ایک جال تھا جو نہایت خفیہ طور پر ان دونوں کے گرد بنا جا رہا تھا۔ اور کو دھاڑیل اور علی بخش۔۔۔ اور دونوں اس سے لاعلم تھے۔

☆=====☆=====☆

ساون جب دوا لے کر اللہ رکھی کے پاس لوٹا تو اسے خاصا بدحواس پایا۔ ساون نے اس وقت تو کچھ نہ پوچھا البتہ جب وہ مذکورہ وارڈ میں چاچی عنایتاں کو دوا دے کر اللہ رکھی کے پاس آیا تو اس نے بہ غور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا: ”اللہ رکھی! خیر تو ہے۔ تو کچھ پریشان نظر آ رہی ہے۔“

”ساون۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ میں نے ابھی خانو دھچر کو یہاں دیکھا تھا۔“ اللہ رکھی نے قدرے متوحش لہجے میں اسے بتایا۔

”خانو دھچر۔۔۔!“ ساون اس کی بات پر استغنامیہ لہجے میں بڑبڑایا۔ تب

سانس جوش و غصے کے مارے پھول سا گیا تھا۔

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔۔۔“ دوست محمد اپنے بھانجے کی بات سن کر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”پولیس کا چھاپہ کسی دن لگوا کر علی بخش کو اس کے دھاڑیل ساتھی سمیت گرفتار کروا دو۔۔۔“ میں نے پہلے بھی یہی تجویز دی تھی مگر۔۔۔“

”ٹھیک ہے ماموں۔۔۔ تم درست کہہ رہے ہو۔۔۔ اس بار میں موقع کی تاک میں رہوں گا۔۔۔ جیسے ہی ہوٹل میں ان دونوں کی ملاقات متوقع ہوئی۔۔۔ ہم پولیس کو اطلاع کر دیں گے۔“ محرم علی اپنے ماموں کی بات کی تائید کرتے ہوئے بولا تو اس کی ماں خیراں۔۔۔ جو کافی دیر سے خاموش تھی بولی۔

”اس طرح تو اس کے ساتھ تم لوگ بھی اندر ہو جاؤ گے۔۔۔ آخر ہوٹل کے تم بھی بالک ہو۔۔۔“

”ایسا نہیں ہوگا ادی!“ دوست محمد فوراً اپنی بہن کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”تھانے کا انچارج انسپکٹر ارشد ایک راشی پولیس افسر ہے۔۔۔ میں اس کی مٹھی گرم کر کے سب سمجھا بجھا دوں گا اور پہلے ہی سے اسے قائل کر لوں گا کہ علی بخش کی کسی بدنام دھاڑیل کے خطرناک گروہ سے واسطے داری ہے۔۔۔ اور اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔۔۔“ اپنی بات ختم کر کے وہ پھر محرم علی سے مخاطب ہوا۔ ”پٹ محرم! تو نے ایک دن بتایا تھا کہ تمہارے ہوٹل میں ایک دن رات گئے وزن پاڑیں (جو، شراب) کی محفل جمتی ہے اور اسی رات کو کچھ نامی گرامی دھاڑیل بھی آتے ہیں۔۔۔ موج میلہ کرنے۔۔۔ میرا خیال یہ ہے علی بخش بھی اسی دن ہی اپنے کسی دھاڑیل ساتھ سے خفیہ طور پر ملتا ہوگا۔۔۔ اور یہی موقع بہتر ہے گا پولیس کے چھاپے کے لئے۔۔۔“

اس کی بات سن کر محرم علی اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں ماما سائیں! وہ جمعرات کی رات ہے۔۔۔ میں تاک میں رہوں گا۔۔۔ کیونکہ اس دن علی بخش بھی رات گئے ہوٹل میں موجود رہتا ہے۔۔۔ ویسے میں نے اس کی نگرانی کے لیے اپنا ایک قابل اعتماد گرگ خیرو۔۔۔ رکھا ہوا ہے۔۔۔ جو مجھے علی بخش سے متعلق ایک ایک خبر لا کر دیتا ہے۔“

”شباباش۔۔۔ میڈا پٹ!۔۔۔ بس تھوڑا سا سمجھداری اور بہادری سے کام لینا ہو گا۔۔۔ تم دیکھنا پھر یہ موزی خود ہی ہمارے راستے سے ہٹ جائے گا۔۔۔“ دوست محمد محرم علی کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے تہنیتی لہجے میں بولا۔ پھر وہ سب لوگ آئندہ کی منصوبہ بندی کے بارے میں غور کرنے لگے۔

اللہ رکھی نے ساون کو خانودھچر کے متعلق تفصیلاً بتا دیا کہ وہ کون تھا..... پھر ساون کو بھی کچھ کچھ یاد آنے لگا..... اور اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا..... تاہم وہ اللہ رکھی کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”اللہ رکھی! تو گڑبگڑ نہ کر..... وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا..... بس حوصلہ رکھ..... یہ خانودھچر جیسے زر خرید کتے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے.....“ لمحہ بھر توقف کے بعد اس نے کسی خیال کے تحت دوبارہ پوچھا۔ ”کیا اس نے تجھے دیکھا تھا..... میرا مطلب ہے..... تجھے پہچانا تھا وہ.....؟“

چند ثانیے اللہ رکھی کے چہرے پر تذبذب کے آثار ابھرے پھر غیر یقینی سے لہجے میں بولی..... ”پتہ نہیں..... ویسے اس نے میری جانب ایک لمحے کو دیکھا تو تھا مگر پھر کہیں آگے بڑھ گیا..... یا شاید مجھے پہچانا نہیں تھا پھر.....“

”ہاں..... شاید یہی بات ہو..... ورنہ تیرے پاس ضرور آتا.....“ ساون نے کہا..... ویسے یہ بات ساون نے اللہ رکھی کا محض دل رکھنے کے لئے کہی تھی..... ورنہ اسے شبہ تھا کہ خانودھچر نے اللہ رکھی کو اچھی طرح سے پہچان لیا ہوگا..... اور کوئی بعید نہیں کہ وہ اسے یہاں تلاش کرنے آیا ہو..... جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا..... ہسپتال کے احاطے میں مریضوں کا رش ٹوٹتا جا رہا تھا..... پھر ٹھیک دو بجے احاطے میں فروکش لوگوں کو اپنے اپنے مریضوں کے پاس جانے کی اجازت دی گئی..... ساون اور اللہ رکھی بھی جلدی جلدی اپنا ساز و سامان سمیٹ کر مطلوبہ وارڈ میں بیڈ نمبر بارہ کے قریب آگئے جہاں چاچی عنایتاں صاحبہ فراموش تھی..... اس کی طبیعت میں بہتری کی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی..... دن بہ دن وہ کمزور ہوتی جا رہی تھی..... ساون اور اللہ رکھی متفکر اور غم زدہ سے اس کو دم دلا سہ دے رہے تھے..... وارڈ میں ایک ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی..... چہار سو ایک بو جھل سی بیمار فضاء طاری تھی..... پھر تک چڑھی نرسوں کے زور زور سے بولنے کی ناگوار سی آوازیں بھی گونج رہی تھیں..... بہر طور شام تک وہ وہیں بیٹھے چاچی عنایتاں کا دل بہلاتے رہے۔ اس کے بعد رات ہوتے ہی انہوں نے کوریڈور میں رات گزارنے کے لئے رلی اور دیگر مختصر سامان بچھا لیا..... اللہ رکھی اندر وارڈ میں ہی چاچی عنایتاں کے قریب ہی لمبی سی آہنی بیچ پر رلی اور رضائی سنبھال کر بیٹھ گئی تھی وہ وہیں سویا کرتی تھی..... رات کا کھانا چاچی عنایتاں کو ہسپتال کی طرف سے ملتا تھا..... جبکہ ساون اپنے اور اللہ رکھی کے لیے قریبی ہوٹل سے لے آتا تھا۔

اگلے دن صبح پھر وہی بیزار کن انداز میں سورج طلوع ہوا اور لگے بندھے معمول کے

مطابق ساون اور اللہ رکھی اپنا اپنا بوریا بستر سمیٹ کر باہر احاطے میں دھوپ میں آکر فروکش ہو گئے۔

ایسی دوران ساون کو پھر چاچی عنایتاں کے لیے ایک انجکشن خریدنے باہر جانا پڑا اور اللہ رکھی وہیں بیٹھ کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی..... بالآخر کافی دیر تک جب ساون نہیں لوٹا تو اللہ رکھی کا دل تنہا بیٹھے بیٹھے گھبرانے لگا..... وہ پریشان سی ہو گئی..... پہلے پہل تو اس نے اپنے دل کو یہی تسلی دے کر بہلانا چاہا کہ ہو سکتا ہے..... ساون کو مطلوبہ انجکشن نہ ملا ہو اور وہ اسے ڈھونڈنے اور آگے نکل گیا ہو..... بہر طور وہ بے چاری ہر اس کی تصویر انتظار بنی بیٹھی رہی..... معاً اس کی نظر ہسپتال کے گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہوئے ایک مجہول سے شخص پر پڑی اس نے گول گول عدسوں والی عینک چڑھائی ہوئی تھی اور اس کے ہمراہ دو تین اور بھی افراد تھے..... ان میں ایک کالے بھنگ شخص کو دیکھ کر اللہ رکھی کے چہرے پر خوف سمٹ آیا وہ خانودھچر تھا..... اور اس کے ہمراہ وہ مجہول سا شخص منشی میرل تھا وہ اس کی طرف چلے آ رہے تھے۔ اللہ رکھی ان کو بڑے جارحانہ طور پر اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر خوف زدہ سی ہو گئی۔

☆=====☆=====☆

ٹھٹھرتی ہوئی رات دے پاؤں سرک رہی تھی..... دودا خان کے ہوٹل میں حسب روایت ہفتہ وار جو اور شراب کی محفل جمی ہوئی تھی یہ جمعرات کی رات تھی جس کا علی بخش کو خاص انتظار رہتا تھا کیونکہ اسی رات وہ بدنام ڈاکو اکوڈھاڑیل سے خفیہ ملاقات کرتا تھا..... لہذا وہ آج گھر جانے کی بجائے ادھر ہی رہ گیا تھا..... ادھر محرم علی بھی تاک میں تھا..... اس نے فوراً اپنی خفیہ کارروائی شروع کر دی جس میں اس کے دونوں ماموں دوست محمد اور محمد علی بھی پیش پیش تھے۔

سردرات کچھ اور اپنے انجام کی طرف بڑھی..... ایسے میں ایک تنگ سی کچی کوٹھڑی میں علی بخش اور اکوڈھاڑیل بیٹھے باتوں میں مشغول تھے..... اور ساتھ والی کوٹھڑی جو نسبتاً کافی کشادہ تھی..... وہاں بے ہنگم تہقہوں کی آوازیں گونج رہی تھی..... اکوڈھاڑیل دھیمے لہجے میں علی بخش کو اس واقعے کی تفصیل بتا رہا تھا کہ اس کے سوتیلے بھائی محرم علی کو سبق سکھانے کے لئے..... اس نے اسے اغوا کرنے کے بعد دھمکاتے ہوئے چھوڑ دیا تھا کہ وہ آئندہ اپنے بڑے بھائی علی بخش پر جائیداد وغیرہ کے سلسلے میں کسی قسم کا دباؤ ڈالے اور نہ ہی کوئی جھگڑا افساد کرے۔

علی بخش خوش تھا..... وہ ساری بات سننے کے بعد ممنون لہجے میں اکودھاڑیل سے بولا..... ”چاچا سائیں تیری بڑی مہربانی تو نے مجھے اکیلے کا ساتھ دیا..... ورنہ.....“

مگر اسی لمحے اکودھاڑیل نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور نرم لہجے میں بولا.....

”اس میں مہربانی کی کوئی بات نہیں..... میں نے آپڑیں یا ردو دے خان کا وعدہ نبھایا ہے جو میرا فرض ہے.....“

پھر اس سے پہلے علی بخش مزید کچھ کہتا..... باہر ایک دم بھگدڑ مچ گئی اور ٹھیک اسی وقت کوٹھڑی کا دروازہ ”دھڑ“ سے ٹوٹ کر گرا اور پولیس کے چند مسلح اہلکار اندر گھس آئے۔

اکودھاڑیل اور سادون کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا..... پولیس نے ان پر اپنی رائفلیں تان لیں۔

پولیس کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر اکودھاڑیل اور علی بخش ایک ٹائیپ کے لیے اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئے تھے۔ چونکنے کی کیفیت ان کے چہروں پر چسپائی ہو کر رہ گئی تھی۔

”خبردار.....! جو تم دونوں میں سے کسی نے حرکت کی تو.....“ ان مسلح سپاہیوں میں سے ایک مضبوط تن و توش کے مالک نے گرج دار آواز میں اپنا سروں ریوالتور ان پر تانتے ہوئے کہا۔

علی بخش اس پولیس والے کو پہچان چکا تھا یہ متعلقہ تھانے کا انچارج انسپٹر ارشد لاشاری تھا۔ علی بخش کی آنکھوں میں اب خوف جھلکنے لگا تھا۔ جبکہ اکودھاڑیل کے چہرے پر غصہ اور جوش سا اُٹھ آیا تھا..... ایک ایسا طیش آمیز جوش جس میں چیخ تھا وہ خونخوار نگاہوں سے انسپٹر ارشد لاشاری کو گھور رہا تھا..... مگر انسپٹر ارشد لاشاری کے چہرے پر کسی دباؤ میں آنے والے رد عمل کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ اس کی عقابی نگاہوں میں ایسی چمک لہریں مار رہی تھی جیسے اس نے بڑے عرصے بعد اپنے کسی دیرینہ غنیم کو چھاپ لیا ہو..... وہ دوبارہ کامیابی سے بھرپور لہجے میں اکودھاڑیل کو مخاطب کر کے بولا۔

”اکودھاڑیل، تیری تو ہمیں عرصے سے تلاش تھی..... اور سچ پوچھو تو میں اس علاقے میں آیا ہی تجھے گرفتار کرنے کے لیے تھا..... بڑی بھاری رقم لگی ہے تیرے سر کی.....“

تب اکودھاڑیل بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حقارت سے بولا۔ ”پتہ نہیں کتنے تیرے جیسے کالی وردیوں والے میرے سر کی رقم لینے کی آس میں دفن ہو گئے..... کیا تو بھی.....“

”بکواس بند کر اپنی.....“ انسپٹر ارشد اس کی بات کاٹ کر غصے سے دھاڑا..... ”بڑا گھمنڈ ہے تجھے خود پر..... کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا کیونکہ تیری گرفتاری مردہ بھی قابل قبول ہوگی سرکار کو.....“ انسپٹر کے معنی خیز لہجے نے اکودھاڑیل کو جیسے بھڑکا کر رکھ دیا۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا مگر اسی وقت انسپٹر ارشد کے ساتھ رائفلیں تانے والی پولیس اہلکاروں نے برقی برعت کے ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے اپنی رائفلوں کی نالیں اکودھاڑیل کی کشادہ پیشانی پر نکا دیں..... تب فوراً اکودھاڑیل اور علی بخش کو تھکڑیاں پہنا دی گئیں..... کوٹھڑی کی کچی دیوار سے ٹکی ہوئی اکودھاڑیل کی سیون ایم ایم بھی پولیس نے قبضے میں لے لی تھی۔

☆=====☆=====☆

منشی میرل اور خانو دچھرو وغیرہ کو اپنی جانب چوکنے انداز میں بڑھتا دیکھ کر اللہ رکھی ایک دم اپنی جگہ سے خوف زدہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”سائیں منشی! یہی ہے وہ چھو کر جیسے سادون گوٹھ سے بھاگ کر لایا ہے.....“ قریب پہنچتے ہی خانو دچھرو اللہ رکھی کو گھورتے ہوئے منشی میرل سے مخاطب ہوا تھا۔

”اڑے ٹوچپ کر میں خود بات کرتا ہوں.....“ منشی میرل نے خانو کی بات پر اسے مکاری سے ڈپٹ کر کہا..... پھر اللہ رکھی کے سر پر ہاتھ دھر دھرے ہوئے حلیم طبعی سے بولا.....

”دھی.....! میں تمہاری مجبوری سمجھتا ہوں..... ٹوڈرنہ..... میں تیرے گوٹھ کے سائیں ڈیرے لکھ میر کا آدمی ہوں..... تیری چاچی کی طبیعت ہن کیسی ہے.....؟“ منشی میرل کے مشفقانہ لہجے نے خوف زدہ اللہ رکھی کو جیسے ایک دم ہلکا پھکا کر دیا..... اور وہ ایک نظر تلخ خانو دچھرو پر ڈالتے ہوئے منشی میرل سے بڑے رساں کے ساتھ بولی۔

”چاچا..... تیری مہربانی..... تو نے ہمیں غلط نہیں سمجھا..... وہ بہت سخت بیمار تھی..... اسے یہاں لانا پڑا تھا..... فوراً..... ویسے علاج چل رہا ہے اس کا.....“

”چنگا چنگا..... میڈی دھی..... یہ بتا..... سادون بھی تیرے ساتھ ہے؟“ منشی نے عیاری سے پوچھا..... اس کے دو میٹھے بولوں نے معصوم اور سادہ لوح اللہ رکھی کو بلاتامل تعاون پر مجبور کر ڈالا تھا۔ تاہم وہ سادون کے نام پر پہلے ذرا جھجکی پھر اپنی نگاہیں جھکا کر دھڑکے سے بولی۔

”ہاں..... وہ بھی آیا ہے..... لیکن.....“ اس کی آواز حلق میں انک کر رہ گئی۔

منشی فوراً اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا..... ”ہاں..... ہاں بول..... کوئی تکلیف

گماشتوں کو مخاطب کر کے بولا۔

اور ابھی وہ واپس جانے کے لئے مڑا ہی تھا کہ اللہ رکھی نے اسے روکا۔ ”ٹھہر جا چاچا..... میں چلتی ہوں تیرے نالی..... پر ساون.....“

”اڑے بابا..... تو اس کی گڑتی نہ کر..... میں نے کہا نا میرے آدمی یہاں موجود رہیں گے اور جیسے ہی ساون یہاں آیا..... وہ اسے لے کر وہاں پہنچ جائیں گے۔“

”چاچا.....! کیا یہ اچھا نہ ہوتا کہ ہم ادھر پہلے ساون کا انتظار کر لیتے۔“ اللہ رکھی نے آخر میں کچھ سوچتے ہوئے کہا تو میرل بولا۔

”پتہ نہیں اب وہ کتنی دیر بعد آئے..... ہم نے واپس گوٹھ بھی جانا ہے..... تجھے وڈیرے سائیں کے شہر والے گھر چھوڑ کر ہم فوراً لوٹ جائیں گے گوٹھ اور وڈے سائیں کو اطلاع دیں گے تاکہ اس کی تسلی ہو جائے..... یہاں گھر میں وڈے سائیں کے بال بچے بھی آئے ہوئے ہیں.....“

”اچھا پھر ٹھیک ہے..... میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ.....“ سادہ لوح اللہ رکھی نے بالآخر ہار مانتے ہوئے معصومیت سے کہا..... اور منشی سمیت خانو دچھر کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک عود کر آئی تھی۔

☆=====☆=====☆

منشی میرل وغیرہ کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوتے وقت اللہ رکھی کا دل یکبارگی کسی انجانے خدشے سے دھڑکا تھا۔ اس نے ہسپتال کے گیٹ سے باہر نکلتے اور جیپ میں سوار ہونے سے پہلے ادھر ادھر متلاشی نگاہوں کے ساتھ دیکھا کہ شاید ساون کہیں نظر آجائے مگر اس کی یہ آخری امید بھری خواہش پوری نہیں ہوئی اور جب وہ جیپ کی بچھلی نشست پر بیٹھ گئی..... تو اپنے بے چین دل کو یہ سوچ کر تسلی دینے کی سعی کرنے لگی کہ منشی نے اپنے جن دو آدمیوں کو وہاں چھوڑا تھا..... وہ ضرور ساون کو بھی اپنے ساتھ لے آئیں گے..... اللہ رکھی جاتے وقت چاچی عنایتاں کو بھی ایک نظر دیکھ لینا چاہتی تھی مگر اس وقت چونکہ متعلقہ وارڈ میں بڑے ڈاکٹروں کے راولنڈ کا وقت تھا اس لئے اندر جانے کی ممانعت تھی۔

اللہ رکھی جیپ کی آرام دہ اور نرم سیٹ پر بیٹھ کر عجیب سا گداز محسوس کر رہی تھی..... وہ بے چاری تو بیل گاڑی کے سخت پھٹے پر بیٹھا کرتی تھی..... نرم سیٹ کیا، وہ بے چاری مونڈر کار میں ہی پہلی بار بیٹھی تھی۔ بہر طور..... انجانے اندیشوں اور طفل تسلیوں کے درمیان جیپ ایک نسبتاً متمول علاقے میں داخل ہو گئی۔ جہاں خوبصورت بنگلوں کی کافی تعداد

پریشانی تو نہیں ہوئی تھی۔“

”نہیں..... نہیں چاچا..... ایسی کوئی بات نہیں..... وہ ساون بہت اچھا ہے.....“

چاچی کی دوائیاں لینے گیا ہوا ہے..... پر..... ابھی تک آیا نہیں.....“ اللہ رکھی کے لہجے میں نظر سامٹ آیا۔

”اچھا ٹھیک ہے کوئی بات نہیں..... تو ایسا کر ہمارے نال چل..... سائیں وڈے..... نے ہمیں سختی سے ہدایات دی ہیں کہ تم لوگوں کو شہر دھکے کھانے کی بجائے اچھی جگہ رہائش کے لیے دی جائے..... وڈیرا سائیں بڑا اچھا آدمی ہے..... میڈی دھی.....“

منشی میرل اللہ رکھی کے سر پر دوبارہ ہاتھ دھرتے ہوئے اور اس کے چہرے پر تردد کے آثار دیکھ کر پھر گویا ہوا..... ”وڈیرا سائیں اپنے ”رہاکوں“ (مزارعوں) کا بڑا خیال رکھتا ہے..... بلکہ وہ تو غصے بھی ہو رہا تھا کہ تم دونوں کو کم از کم مجھے بتانا چاہئے تھا..... اچھا چھوڑ ان باتوں کو چل تو ہمارے نال..... یہ بھی کوئی جگہ ہے رہنے کی.....“ پھر وہ اپنے دیگر ساتھیوں کو مخاطب کر کے بولا..... ”اوئے چلو بابا..... یہ سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھو.....“

”ٹھنڈ..... ٹھہرو چاچا..... ساون کو تو آ لینے دو.....“ اللہ رکھی پریشان ہوتے ہوئے بولی..... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ اللہ رکھی کی بات پر پہلی بار منشی میرل کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی..... اس کے انداز سے اب غلٹ بھی عیاں ہونے لگی تھی..... جیسے اللہ رکھی کو ساون کے آنے سے پہلے ہی یہاں سے لے جانا چاہتا ہو۔

”دیکھ میڈی دھی ضد نہ کر..... یہ اچھی بات نہیں ہے..... ٹوبے فکر رہ..... ہمارے آدمی یہاں موجود رہیں گے..... اور ساون آئے گا تو اسے بھی وہیں لے آئیں گے..... بلکہ تمہاری چاچی کو بھی کسی اچھے سے پرائیویٹ اسپتال میں داخل کروادیں گے..... سائیں وڈے نے یہی ہمیں کہہ کر بھیجا تھا..... ورنہ وہ ناراض ہو جائے گا۔“

اللہ رکھی اب شدید قسم کے تذبذب میں مبتلا ہو گئی تھی..... وہ ”ہاں“ اور ”ناں“ کے درمیان انک گئی تھی..... اور باری باری سب کے چہرے تک رہی تھی..... اسے متذبذب دیکھ کر چالاک منشی نے ایک اور پیٹیرا بدلا، پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے دھی..... تیری مرضی پھر..... ہم تو تیرے گوٹھ کے ہی لوگ ہیں..... سو ڈھل تو میرا اچھا یا رہ چکا ہے..... اور رب سائیں اسے جنت دے..... ہم پھر وڈے سائیں کو بتادیں گے کہ تو نے ہم پر بھروسہ نہ کیا..... کیونکہ وڈا سائیں..... اپنے گوٹھ کی تمام عورتوں کی عزت کو اپنی ج سمجھتا ہے..... وہ ناراض ہو جائے گا..... چلو بھی چلتے ہیں واپس..... گوٹھ.....“ آخر میں وہ چالاک سے اپنے

”کیا سوچ رہی ہے دھی اللہ رکھی.....؟“ منشی میرل بغور اپنی گول گول عدسوں والی عینک سے اللہ رکھی کو گم سم بیٹھے دیکھ کر گھورتے ہوئے بولا۔

اللہ رکھی ایک دم چونکی تھی۔ ”کک..... کچھ نہیں سچ..... چاچا..... بس وہ ساون.....“ وہ کہتے کہتے رک گئی مگر کایاں منشی اس کی بات سمجھتے ہوئے ازراہ شفٹی بولا۔

”اس کی تو ٹوٹتی (فکر) نہ کر..... میں نے آدمی تو چھوڑے ہوئے ہیں نا..... تیرے سامان سمیت..... وہ ساون کو بھی ادھر ہی لے آئیں گے..... تو آرام سے پیچھے ہو کر بیٹھ جا شباش.....“ میرل نے اسے مربیانہ انداز میں پچکارا۔

ایک ادھیڑ عمر اور تیز رنگت ملازمہ اندر داخل ہوئی..... اس نے اپنے ہاتھوں میں بڑی سی رکابی تھام رکھی تھی جو اس نے صونے کے درمیان دھری شیشے کی ٹاپ والی میز کے اوپر رکھ دی..... اس میں چائے وغیرہ اور دیگر لوازمات کے مختصر سے برتن سجے ہوئے تھے۔ کسی عورت کو وہاں موجود پا کر اللہ رکھی کو عجیب سی طمانیت محسوس ہوئی..... وہ ملازمہ عجیب نظروں سے ایک ٹائیپے اللہ رکھی کو دیکھ کر اپنا سپاٹ چہرہ لئے وہاں سے چلی گئی..... جانے کیوں اللہ رکھی کو اس کی آنکھوں میں عجیب سا پیغام محسوس ہوا تھا..... منشی میرل ادھر غور سے اللہ رکھی کی ذہنی اتھل پھٹل کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس کا دھیان بنانے کی غرض سے بولا۔

”دھیئے.....! یہ کمینی ملازمہ کام چور ہے بڑی..... میں ہی تجھے چائے بنا دیتا ہوں.....“ وہ آگے بڑھا اور دوبارہ بولا..... ”تجھے یہاں ہر طرح کا آرام ملے گا..... ڈرنے یا خوف کھانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں.....“ وہ چائے کپ میں انڈیلے ہوئے اور ساتھ ہی اللہ رکھی کے متوحش سے چہرے پر اپنی نظریں گاڑے بولتا رہا..... ”تو ادھر آرام سے رہ تجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی.....“

چائے وغیرہ پینے کے بعد منشی اٹھ کر چلا گیا اور اب اللہ رکھی تنہا کمرے میں اندیشوں و سوچوں کے بیچ گھری رہ گئی..... کافی دیر تک سکڑے سٹے بیٹھے رہنے کے بعد جب اس کی بے چینی سوا ہونے لگی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھی..... اسی اثناء میں وہی ادھیڑ عمر ملازمہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ غالباً وہ چائے کے برتن سمیٹنے آئی تھی..... اس نے ایک نظر پریشان سی کھڑی اللہ رکھی پر ڈالی اور پھر خاموشی کے ساتھ چائے کے برتن سمیٹنے لگی۔

”منشی چاچا..... کہاں ہیں.....؟“ اللہ رکھی نے بالآخر پوچھا، اس کے لہجے میں واضح طور پر ژولیدگی کا ارتعاش موجود تھا۔

ملازمہ نے ایک سپاٹ سی نگاہ اس پر ڈالی۔ پھر کے بغیر مختصراً بولی..... ”ابھی

تھی..... لیکن بنگلے قطار در قطار نہیں بنے ہوئے تھے..... سادہ لوح اور معصوم سی اللہ رکھی جیپ کی شیشے والی بند کھڑکی سے پھٹی پھٹی آنکھوں میں حیرت و استعجاب لئے ان بنگلوں کو دیکھتے جا رہی تھی۔ اتنا تو اسے معلوم تھا کہ گوٹھ کے بڑے بڑے زمینداروں اور وڈیروں کے شہر میں بھی بڑے عالی شان گھر ہوتے ہیں مگر آج وہ خود اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی..... بنگلے دور و یہ بھی نہیں..... سامنے کی طرف اندرونی ذیلی سڑک تھی اور اس کے بعد چنیل میدان دور تک چلا گیا تھا جہاں جا بجا جھاڑیاں اور خودرو پودے اگ آئے تھے..... یہ علاقہ لاڑکانہ شہر کے قدرے مضافات میں تھا۔ منشی خود جیپ چلا رہا تھا اور خانو اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا..... باقی دو افراد جیپ کی پچھلی طرف اللہ رکھی کے سامنے والی سیٹ پر براجمان تھے..... جیپ میں خانو دھچکر کی موجودگی اللہ رکھی کو انتہائی ناگوار محسوس ہو رہی تھی تاہم وہ یہی سمجھتے ہوئے سب برداشت کر رہی تھی کہ اس منحوس خانو کا ساتھ عارضی ہے بعد میں یہ دفع ہو جائے گا۔

معا جیپ ایک جھٹکے سے رکی..... وہ سب باہر آ گئے..... اللہ رکھی بھی جھپکتی ہوئی اتر آئی..... اب وہ سب ایک قدرے پرانی وضع قطع کے بنگلے کے سامنے کھڑے تھے..... اللہ رکھی کے دل کو ایک بار جانے کیوں دھڑکا سا لگا..... بنگلے پر عجیب ویرانی سی چھائی ہوئی تھی..... پھر وہ سب اندر ایک بڑے سے کمرے میں آ گئے..... اللہ رکھی کو کہیں کہیں گرد کی تہیں بھی دکھائی دیں..... یہ نشست گاہ قدیم و جدید ساز و سامان سے آراستہ تھی۔

”چاچا..... وڈے سائیں کے بال بچے نظر نہیں آرہے.....؟“ اللہ رکھی نے دبے دبے خوف سے پوچھا تو منشی بولا۔

”ہاں ہاں ابھی آ جاتے ہیں سب تم بیٹھو تو سہی..... بیٹھو دھی۔“

اللہ رکھی ڈری سہی فرش پر بچھے دبیز قالین پر بیٹھنے لگی تو منشی بڑے تپاک سے بولا۔

”اڑی نہیں دھی! اوپر بیٹھ صوفے پر تیری جگہ ہے..... یہاں تو نیچے بیٹھنے تو نہیں آئی.....“

ایکا کی منشی میرل کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا..... پھر منشی نے خانو سمیت دوسرے لوگوں کو وہاں سے چلے جانے کا خفیف سا اشارہ کیا..... ادھر اللہ رکھی..... بھی جب تک جھپکتے ہوئے ایک صوفے کے قدرے کنارے جیسے ”کک“ سی گئی..... ہزاروں بھیدوں بھرے خدشات زہریلے ناگوں کی طرح اسے اب کچھ زیادہ ہی ڈسنے لگے تھے..... ڈری سہی سماعتوں میں جیسے کوئی چکر چلا کر اسے کہہ رہا تھا..... ”بھاگ جاؤ..... اللہ رکھی بھاگ جاؤ.....“ پھر وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ اسے یہاں ساون کی مرضی کے بغیر نہیں آنا چاہئے تھا۔



آ جانتے ہیں..... تم بیٹھو آرام سے.....“ اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔

اللہ رکھی ایک بار پھر ہر اس میں کھڑی رہ گئی۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور منشی میرل اندر داخل ہوا..... اللہ رکھی اسے دیکھتے ہوئے ہر اس میں لہجے میں بولی..... ”منشی چاچا..... ساون نہیں آیا ابھی تک؟“

منشی لمحہ بھر چپ رہا..... اسی اثناء میں منشی کے عقب میں دروازے پر خانو دھچر نمودار ہوا..... اس کی آنکھوں میں شکرے جیسی چمک رقصاں تھی۔ اللہ رکھی کا اس بار دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا..... منشی کو جواباً خاموش پا کر وہ دوبارہ بولی..... ”چاچا..... مجھے ہسپتال واپس پہنچا دے..... وہاں ساون آ گیا ہوگا.....“ یہ کہتے ہوئے وہ ذرا آگے بڑھی تو منشی جیسے انکشاف کرنے والے انداز میں بولا۔

”اللہ رکھی! تو واقعی سیدھی سادی اور معصوم ہے۔“

اس کی بات پر اللہ رکھی بری طرح چونک کر اسے تنکے لگی..... کائیاں منشی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا..... ”تجھے شاید پتہ نہیں..... مگر یہ سچ ہے کہ ساون تجھے چھوڑ کر بھاگ گیا ہے کہیں.....“

منشی میرل کے اس انکشاف پر اللہ رکھی تڑپ اٹھی..... ”نہیں..... نہیں چاچا..... میرا ساون ایسا نہیں ہے..... تم جھوٹ بولتے ہو.....“

اس کے پر زور لہجے نے منشی کو غصہ چڑھا دیا مگر وہ بہ مشکل ضبط سے کام لیتے ہوئے دھیسے لہجے میں بولا..... ”دھیئے! میں سچ کہہ رہا ہوں..... ہمارے آدمی وہاں اسی کے انتظار میں موجود تھے..... اور ساون تھوڑی دیر بعد وہاں آ بھی گیا تھا..... لیکن جب اسے ہمارے بارے میں پتہ چلا تو وہاں سے فوراً بھاگ اٹھا.....“

اللہ رکھی کو منشی کی بات پر رتی بھر بھی یقین نہ آیا..... وہ اس کی اس بات کو یکسر جھٹلاتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولی..... ”نہیں منشی چاچا! یہ جھوٹ ہے..... وہ مجھے چھوڑ کر تنہا کہیں نہیں جاسکتا..... بھلا اسے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی..... اس نے کسی کا کیا بگاڑا ہے.....؟“

”اڑی پلگی..... وہ وڈے سائیں کا مقروض ہے..... پورے دولاکھ کا جس پر ایک لاکھ روپے کا سود بھی چڑھ چکا ہے..... اس لئے تو وہ گوٹھ سے چپ چاپ تیرے ساتھ شہر بھاگ آیا تھا.....“ منشی کا لہجہ اچانک خاصا برہم ہو گیا تھا۔

خانو دھچر اب منشی کے ساتھ اس طرح آن کھڑا ہوا تھا جیسے اسے منشی کے ایک

اشارے کا انتظار ہو۔

اس بار اللہ رکھی کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہو گئے..... تاہم وہ انکلتے ہوئے لہجے میں بولی..... ”مگر ساون نے تو وہ رقم وڈے سائیں کو لوٹا دی تھی..... اس نے خود مجھے یہ بات بتائی تھی۔“

منشی کی آنکھوں میں مکاری سی تیر گئی اور وہ اللہ رکھی کو ایسے دیکھنے لگا جیسے اسے کسی نے بے وقوف بنا لیا ہو..... وہ اپنے لہجے کو رحم سے لبریز کرتے ہوئے بولا..... ”چچ..... دھی..... تجھ پر مجھے واقعی بڑا ترس آتا ہے..... اڑی..... بے وقوف چھو کر..... اس نے ایک پائی بھی واپس نہیں کی اب تک..... میرے پاس رجسٹر میں اس کے انگوٹھے کا نشان موجود ہے..... وڈیرا سائیں لکھ میر خان تو اسے قرض دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ وہ تو ہاتھ جوڑ کر..... منشی کر کے اس نے قرضہ لیا تھا وڈے سائیں سے..... کہتا تھا میں نے شادی کرنی ہے..... تیرا نام لے کر فریاد ڈال رہا تھا کہ وہ ایک غریب اور مسکین لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے..... جس کا دنیا میں کوئی نہیں۔ اس پر وڈے سائیں نے یہ سوچ کر اسے قرضہ دے دیا کہ چلو گوٹھ کی کسی گریب ناری کا بھلا ہو جائے..... اس کا گھر بس جائے..... اگر وڈیرے سائیں کو یہ پتہ چلا کہ وہ تجھے چھوڑ کر.....“

”نہیں..... نہیں منشی چاچا..... ساون مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں گیا.....“ اللہ رکھی درمیان سے اس کی بات کاٹ کر چیخنی..... فرط جذبات سے اس کی سرگیں آنکس نمناک سی ہو گئی تھیں۔

منشی کی شاطر نگاہوں نے معصوم اللہ رکھی کے چہرے پر یقین، وغیر یقینی کے آثار بھانپ لئے تھے..... وہ سمجھ رہا تھا کہ ساون کے سلسلے میں اللہ رکھی کو ایک خاص حد تک بدگمان کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے..... جبکہ اللہ رکھی ساون کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اس نے تو مجھ سے کہا تھا کہ وہ سائیں وڈیرے کو وہ سارے پیسے واپس دے چکا ہے جو اس نے اس کے سنگ کے سلسلے میں لئے تھے..... اسے منشی کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا..... تاہم وہ منشی کی اس بات پر بھی غور کر رہی تھی کہ آخر اتنی بڑی رقم کے سلسلے میں وہ جھوٹ بھی تو نہیں بول سکتا..... ادھر منشی اپنی بات کی اثر پذیری اس کے متذبذب چہرے پر بھانپتے ہوئے چالاکی سے دوبارہ بولا۔

”میڈی دھی..... تجھے اور بھی کئی ایسی باتوں کا علم نہیں..... لیکن ان کا جاننا تیرے لئے ضروری ہے..... تو بیٹھ آرام سے، میں تجھے بتاتا ہوں.....“ وہ مکاری اور ملائمت

بھرے لہجے میں بولا اور آگے بڑھ کر اللہ رکھی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے ایک قریب کے صوفے پر بٹھادیا۔ پھر خود بھی اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

ادھر خانو دھچر بھی اللہ رکھی کو عجیب نظروں سے گھورتا ہوا ایک طرف براجمان ہو گیا..... اللہ رکھی کو ہنوز اس کی موجودگی بری طرح کھل رہی تھی..... اس کے چپک دار چہرے پر ایک خباثت سی پھیلی ہوئی تھی۔ منشی کے چہرے سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسوہ کوئی اہم بات کہنے کے لیے اپنے ذہن میں الفاظ ترتیب دے رہا ہو..... بالآخر وہ اپنی جانب مستفسرانہ نگاہوں سے منشی اللہ رکھی سے مخاطب ہوا..... ”دیکھ میڈی دھی! تجھے شاید یہ بات معلوم نہ ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ تیرا چاچا سوڈھل..... دوسری شادی کرنا چاہتا تھا..... لیکن موت نے اسے مہلت نہ دی۔“

اس کے اس انکشاف پر اللہ رکھی بری طرح چونکی..... تاہم خاموشی سے ہمد تن گوش رہی منشی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا..... ”تیرا چاچا سوڈھل دوسری شادی کسی مجبوری کے تحت کر رہا تھا جس سے تو خود بھی اچھی طرح واقف ہوگی..... اس کی بیوی یعنی تیری چاچی عنایتاں بیمار رہتی تھی..... جبکہ تیرے چاچے سوڈھل کو اپنی خدمت کی ضرورت تھی..... آخر اس کو اس نے تجھے بھی بیاہنا تھا کہیں..... وہ دورانڈیش تھا اور اپنی جگہ پر وہ بھی درست تھا..... آخر اس کا بھی حق تھا کہ آخری عمر میں کوئی اس کی دل داری اور خدمت کرے..... لہذا اس نے فضلاں سے بیاہ کرنے کا فیصلہ کیا..... جو اس کی بہن ہے.....“ منشی نے ایک جانب بیٹھے خانو دھچر کی جانب اشارہ کیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا..... ”اس کا نام خانو ہے..... بالآخر سوڈھل اور خانو کے درمیان یہ طے پایا کہ خانو اپنی بہن فضلاں کا سنگ سوڈھل کو دے گا اور بدلے میں سوڈھل فضلاں کے بھائی یعنی خانو کو تیرا سنگ دے گا۔“

اللہ رکھی یک دم منشی کی اس بات پر دہل گئی..... وہ کہہ بک سی منشی کی جانب نکلے جا رہی تھی۔ منشی رک نہیں بولتا رہا۔ ”لیکن..... معاف کرنا دھی..... تیرا چاچا سوڈھل کچھ لالچی انسان بھی تھا..... میری عادت ہے بات میں صاف کرتا ہوں اس لیے کہ وہ سچی ہوتی ہے..... سوڈھل تیرا سنگ بدلے میں خانو کو دینے پر راضی تو تھا..... مگر ساتھ ہی چالیس ہزار بھی مانگ رہا تھا..... جو بالآخر خانو نے اسے دے دیئے تھے۔“ اتنا کہہ کر وہ ذرا رکھا.....

یہاں اس نے بلا کی دروغ گوئی اور مکاری سے کام لیا تھا۔

اللہ رکھی بے چاری کی حالت کا تو تو بدن میں لہو نہیں جیسی ہو رہی تھی۔ اس کے

اندر وحشتوں کے ناگ سے کلکانے لگے تھے..... اسے یوں لگا جیسے اسے آہستہ آہستہ نادیدہ اور خاردار زنجیروں سے جکڑا جا رہا ہو۔

”بہر حال ادھر بد قسمتی سے تیرے چاچا سوڈھل کو کسی نے قتل کر دیا..... اور پھر سے یہ بات بھی دفن ہوگئی..... مگر یہ..... خانو کی شرافت تھی کہ سوڈھل کی موت کے بعد اپنے چالیس ہزار کے سلسلے میں چپ رہا..... لیکن آخر کب تک خاموش رہتا..... یہ خود بھی ایک غریب باری ہے..... اب پتہ نہیں سوڈھل نے اس کے چالیس ہزار کا کیا کیا..... وہ رب سائیں جانے..... مگر باوجود اس کے اسے اپنی رقم کی پروا نہیں..... کیونکہ یہ اب بھی اپنی بات پر قائم ہے اور اپنے روپے واپس لینے کی بجائے..... تجھ سے شادی کرنے پر تیار ہے.....“ بالآخر منشی میرل نے اپنی بات ختم کی۔

اللہ رکھی کے نازک وجود میں جیسے برقی رودور گئی..... وہ زوردار آواز میں ”نہیں“ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی..... اس کا نرم و نازک حسین چہرہ گہرے دکھ و حزن کی عکاسی کر رہا تھا..... اور منشی میرل کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ کھل رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

”اسے کہتے ہیں کہ سانپ بھی مر گیا اور لالھی بھی نہ ٹوٹی“..... دوست محمد چمک کر اپنی بہن خیراں سے بولا۔

”لیکن سانپ تو ابھی زندہ ہے..... مرنا تو نہیں وہ.....“ خیراں دبی دبی مسرت سے بولی..... اس کا اشارہ علی بخش کی اکودھاڑیل سمیت گرفتاری کی طرف تھا۔

”ادی! علی بخش ایک بہت بڑے اور بدنام دھاڑیل سمیت گرفتار ہوا ہے..... پولیس اس کو بھی دھاڑیل کا ساتھی ہی سمجھے گی یوں سمجھو ساری عمر کے لیے اندر ہو گیا.....“ محمد علی نے بھی لب کشائی کرتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

علی بخش کی گرفتاری پر وہ چاروں خوش تھے..... انہوں نے اپنی راہ کے کاٹنے علی بخش کو بڑی صفائی اور آسانی کے ساتھ راستے سے ہٹا دیا تھا۔

”اب ہمیں ہوٹل اور گھر فروخت کرنے کے لئے اس مردود کی اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی.....“ محرم علی بھی خوشی سے بھرپور لہجے میں بولا۔

”میں آج ہی..... محمد پناہ سے مل کر مکان اور ہوٹل کی بات کرتا ہوں..... وہ دونوں ہی بکوا دے گا..... بلکہ مکان تو کہہ رہا تھا کہ وہ خود خرید لے گا..... اور ہوٹل کسی جاننے والے کے ہاتھ فروخت کروادے گا.....“ منصوبہ ساز دوست محمد پُر مسرت لہجے میں بولا۔

☆=====☆

یوں تو ساون کو دوائیں ہسپتال کے قریبی میڈیکل اسٹور سے مل چکی تھیں..... لیکن صرف ایک انجکشن اسے وہاں سے نہیں ملا تھا جو عین جوڑوں کے درمیان لگتا تھا اور خاصا مہنگا بھی تھا..... بس اسی انجکشن کو ڈھونڈنے میں اسے دیر ہو گئی جو اسے شہر کی خاک چھاننے کے بعد دوسرے کونے سے ملا تھا۔ ساون کے سینے سے بندھے ہوئے روپے تیزی سے ختم ہو رہے تھے اور وہ منشی میرل اور وڈیرے لکھ میر کی سازش کے مطابق مکمل طور پر ان کا مقروض ہوتا چلا جا رہا تھا..... اور اللہ رکھی بھی اس اندوہناک حقیقت سے واقف نہ تھی کہ غیر محسوس طریقے سے ساون کے گلے میں قرض کا طوق دن بدن تنگ ہوتا جا رہا ہے اور وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ ساون نے قرض کے روپے وڈیرے کو لوٹا دیئے ہوں گے مگر درحقیقت وہ روپے ساون چاچی عنایتاں کی بیماری پر صرف کر چکا تھا۔ بہر طور..... ساون جب دوائیں تھامے ہسپتال لوٹا تو اللہ رکھی کو غائب پا کر اسے پہلے تو اچنچا ہوا..... پھر اسے پریشانی لاحق ہونے لگی۔ کیونکہ ساون پہلے یہی سمجھا تھا کہ ہو سکتا ہے اللہ رکھی اندر وارڈ میں چاچی عنایتاں کے پاس ہو..... لہذا جب وارڈ کی جانب بڑھا تو ایک عجیب منظر اس کا منظر تھا..... ڈاکٹرز وغیرہ اپنا راونڈ مکمل کر کے جا چکے تھے اور اب مریضوں کو لواءحقین کو اپنے مریضوں کے پاس جا کر بیٹھنے کی اجازت مل چکی تھی..... اور یہی وجہ تھی کہ وارڈ میں ذرا رش بھی تھا..... مگر جو منظر ساون دم بخود کھڑا دیکھ رہا تھا..... سامنے چاچی عنایتاں کے بیڈ نمبر بارہ کے قریب ہسپتال کے سفید وردی میں ملبوس عملے کا ایک فرد چاچی عنایتاں کے پاؤں دونوں انگوٹھوں کو ملا کر کسی کپڑے کی دھجی سے گانٹھ لگا رہا تھا جبکہ دوسرا چاچی عنایتاں کی ناک کے دونوں نتھوں میں روٹی کھسیڑ رہا تھا..... اور منہ اور کانوں میں بھی یہ عمل کیا جا رہا تھا..... چاچی عنایتاں کی آنکھیں بند تھیں اور اس کا چہرہ ابدی نیند کا تاثر دیتا ہوا پُر سکون تھا..... کسی تکلیف کسی آزار کی رمت تک چہرے پر موجود نہیں تھی جو پہلے ہر وقت رقصاں رہتی تھی، پھر انہوں نے چاچی عنایتاں کے سیدھے سپاٹ پُر سکون وجود کو بہ آہستگی اٹھا کر اسٹریچر پر ڈالا..... اور وارڈ کے بیرونی دروازے کی جانب بڑھنے لگے..... وہاں دیگر مریضوں کے لواءحقین بھی افسردہ سے کھڑے تھے..... ساون دل میں ہزار وسوسے لئے آگے بڑھا..... جب وہ ذرا قریب آیا تو ایک موٹی سی سانولی نرس اسے دیکھ کر بڑبڑانے کے سے انداز میں بولی..... ”لو بھئی بیڈ نمبر بارہ کے تو یہ کھڑے ہیں..... ارے بھی کہاں ہو تم لوگ..... ہم بارہ ڈھونڈنے گئے تھے تمہیں..... تمہارا مریض ایکسپائر ہو چکا ہے۔“

”مجھے جانے کیوں..... علی بخش سے پھر بھی ڈر لگتا ہے..... کل کلاں وہ جیل سے باہر آ گیا تو.....“ خیراں انجانے خوف کے تحت بولی..... جانے کیا بات تھی علی بخش سے چھٹکارہ پانے کے باوجود بھی اس کے دل کا چور مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا..... اسے دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ ابھی علی بخش جیل کی سلاخیں توڑ کر نمودار ہوگا اور سب کو ہلاک کر ڈالے گا۔

”امڑ!..... ایک تو تجھے پتہ نہیں کیا خوف کھائے جا رہا ہے اس مردود کا.....“ محرم علی اپنی ماں سے بولا..... پھر جیسے اچانک اسے کوئی بات یاد آئی اور وہ اپنی ماں سے بڑے لاڈ سے مخاطب ہوا..... ”امڑ! اب تو سو رٹھ سے میری شادی کر دے نا.....“

”ہاں..... ہاں..... یہاں سے ہم لوگ جائیں گے تو..... تیری دلہن بھی ساتھ ہی لے کر جائیں گے..... تو گڑتی نہ کر..... سارے کام مکمل کر کے جائیں گے یہاں سے۔“

☆=====☆

مگوو ہاری کا چھوٹا بھائی پریل اپنے بھائی سے تعلقات منقطع کر چکا تھا..... وجہ اپنی بیٹی سورٹھ کا سنگ نہ اٹھانے کی تھی..... بہر طور وہ اب خیراں کے بیٹے محرم علی کی 25 ہزار میں رشتہ منظور کر چکا تھا..... ادھر سورٹھ بظاہر اس رشتے پر خاموش تھی مگر اس کا وجود غم نہاں سے نڈھال تھا وہ اپنے اندر کا دکھ کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی..... نہیں وہ اس رشتے سے خوش تھی..... وہ اب تک اپنے آپ کو ساون کی دلہن کے روپ دیکھتی آئی تھی..... مگر غلام تقدیر نے اس کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہونے دیا..... اور وہ دل موس کر رہ گئی تھی۔ وہ دہرے عذاب سے دو چار تھی..... کہ ایک تو ساون سے شادی نہ ہونے کا کرب..... دوسرے ایک طرف بحر الفت کے گرداب میں ڈوبنے ابھرنے کا عذاب..... جس کی شنوائی کوئی اہمیت نہیں رکھتی جس کا احتجاج بے معنی تھا..... سچ ہی تو تھا کہ ساون نے تو اس سے کبھی بھی محبت کا دعویٰ نہ کیا تھا..... اسے تو ہمیشہ سورٹھ نے خود سے جان چھڑاتے ہی پایا تھا۔ اس کی چوڑیاں پیس کر کھانے کی دھمکی نے بھی ساون کو مائل بہ التفات نہ کیا تھا۔ اس کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں..... اس کے گرد شوخ و چنچل سہیلیوں کا جھرمٹ تھا جو شادی کا مخصوص گیت..... گنگناتے ہوئے دلہن بنی سورٹھ کو بھی چھیڑے جا رہی تھیں..... اس کی متواتر ”چپ“ کو وہ شرم پر محمول کر رہی تھیں حالانکہ یہ بات نہ تھی وہ زندہ لاش کی طرح خاموشی طاری کئے بیٹھی تھی..... آرزوؤں اور شکستہ خوابوں کی لاش..... بہر طور شادی کا جام جم عروج پر رہا..... پھر رخصتی کا وقت آیا اور یوں وہ اپنی تقدیر کو محرم علی سے نکھنی کر کے اس کے ساتھ ہوئی۔

ساون ہونقوں کی طرح دواؤں کی تھیلی سنبھالے اس کا چہرہ تکتے لگا چاچی عنایتاں کے اسٹریچر کے قریب کھڑے ایک سفید وردی والے وارڈ اینڈنٹ نے نرس کو قدرے طنزیہ انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ارے سسٹر اس پیچارے کو ایکسپائر کا کیا پتہ اس سے بولو کہ اس کا مریض فوت ہو چکا ہے۔“

اس کی بے رحمانہ فحش ساون کی سمجھ میں آچکی تھی..... اس کے دل کو ایک جھٹکا سا لگا..... ”ہاں..... بھی ہمیں افسوس ہے تمہاری مریضہ کا انتقال ہو چکا ہے..... تم ایسا کرو باہر ذرا انتظار کرو..... لاش کے ساتھ ڈیٹھ سرٹیفکیٹ لے جانا.....“ نرس نے یوں کہا جسے اس کے لیے روز کا معمول ہو..... پھر وہ ساون کو گم صم چھوڑ کر..... وارڈ بوائے سے مخاطب ہوئی۔

”اس ڈیڈ باڈی کو باہر کوریڈور میں لے جاؤ.....“ پھر ساون کے سامنے سے چاچی عنایتاں کی لاش کو اسٹریچر سمیت کھینچتے ہوئے وارڈ سے باہر لے جا کر رابڈری کی دیوار سے لگا دیا گیا۔ ساون افسردگی سے چلتا ہوا اسٹریچر کے قریب آ کر چاچی عنایتاں کے سرخ کبل سے ڈھکے ہوئے پُر سکوت وجود کو دکھ آمیز نظروں سے تکتے لگا..... اسے چاچی عنایتاں کی موت کا از حد دکھ ہوا تھا..... اس نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں نمناک سی ہونے لگی تھیں۔

ہر چند کہ اس کا چاچی عنایتاں کے ساتھ کوئی خونی رشتہ نہ تھا تاہم وہ بہر حال اللہ رکھی کی چاچی تھی..... ساون دل مسوس کر سوچنے لگا کہ اللہ رکھی کو چاچی کی موت کا کتنا رنج ہوگا..... اللہ رکھی کا خیال آتے ہی وہ ایک بار پھر پریشان سا ہو کر چونکا..... چاچی عنایتاں کے اچانک انتقال کر جانے پر وہ ایک لمحے کو اللہ رکھی کی پُر اسرار غیر موجودگی سے غافل ہو چکا تھا..... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے..... یہاں موجود رہے یا اللہ رکھی کو تلاش کرے، وہ بے چارہ دہری پریشانی میں گھر چکا تھا، چاچی عنایتاں مر چکی تھی۔ اس کی لاش کو چھوڑ کر بھی ساون کہیں نہیں جانا چاہ رہا تھا، مگر اللہ رکھی کو بھی ڈھونڈنا لازمی تھا..... ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ وہ موٹی سی نرس دوبارہ آن وارد ہوئی اور ایک کاغذ سا اس کی جانب بڑھاتے ہوئے قدرے چھپتی ہوئی آواز میں بولی۔

”یہ مرحومہ کی موت کا تصدیق نامہ ہے..... تم اب فارغ ہو..... اور..... ہاں یہ اسٹریچر کب تک فارغ کرو گے..... میرا مطلب ہے..... لاش لے جاؤ اپنے ساتھ..... ہمیں یہ اسٹریچر چاہئے.....“ یہ کہتے ہوئے وہ استغہامیہ نظروں سے ساون کی طرف دیکھنے لگی۔

ساون کو حیرت ہوئی وہ سوچنے لگا کہ کیا اتنے بڑے ہسپتال میں صرف یہی ایک اسٹریچر ہے..... اسے خاموش پا کر وہ دوبارہ سڑیل سے انداز میں بولی..... ”ارے بھی بول..... گونگے کیوں بن گئے بھی.....“

”آں..... ہاں..... وہ میرے ساتھ ایک مسئلہ ہے.....“ پھر اس نے اسے بتایا کہ درحقیقت لاش کی اصل وارث اللہ رکھی یہاں موجود نہیں..... اور نہ ہی اس کا ابھی تک کہیں پتہ چل سکا ہے کہ وہ کہاں ہے.....؟ ساون نے قدرے چونک کر بتایا تو نرس منہ بسورتے ہوئے بولی۔

”یہ بڑا مسئلہ ہو جائے گا پھر ہمارے لئے..... لاش کو ہم زیادہ دیر یہاں رکھ نہیں سکتے.....“

”سسٹر میں خود پریشان ہوں..... اور اللہ رکھی کو ڈھونڈنے بغیر میں گھٹھ میں نہیں جا سکتا.....“ ساون نے بالآخر عذر پیش کیا..... تو اس کی بات سن کر نرس منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی ایک طرف کو چلی گئی اور ساون نے غنیمت جانا اور ایک آخری نظر اسٹریچر پر رکھی چاچی عنایتاں کی لاش پر ڈالتے ہوئے وہاں سے نکل آیا۔

وہ اب ہسپتال کے گیٹ کے قریب آچکا تھا وہ ابھی ہسپتال کے بیرونی احاطے میں ہی موجود تھا..... دن ڈھلنے کو تھا اور سردی میں بھی بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ ادھر ساون اللہ رکھی کی اچانک پُر اسرار کشدگی پر پریشان ہوا جا رہا تھا..... وہ سوچنے لگا کہ آخر اللہ رکھی کو کہاں تلاش کرے.....؟ وہ گئی کہاں؟..... اللہ رکھی ایسی لڑکی تو تھی کہ خود سے ہی کہیں چلی جاتی..... کیا پھر اسے کوئی ورغلا کر اپنے ساتھ لے گیا ہے؟ اس سے آگے قیاس آرائی کی اس میں ہمت نہ تھی..... اس نے اللہ رکھی کو تلاش کرنے کے سلسلے میں سب سے پہلے یہ کیا کہ..... وہاں قریب موجود دیگر لوگوں سے اس کے متعلق پوچھ گچھ شروع کی۔ تب بالآخر اسے کینٹین کے چھوکرے نے یہ بتا کر دہلا دیا کہ..... تھوڑی دیر پہلے اللہ رکھی کے ساتھ کچھ لوگ کھڑے باتیں کر رہے تھے پھر اس کے بعد وہ ان لوگوں کے ساتھ راضی خوشی چل پڑی تھی۔“

ساون کو اب ایک نئی پریشان کن صورت حال نے گھیر لیا..... اسے یہ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آخر وہ کون لوگ تھے..... جن کے ساتھ اللہ رکھی خوشی خوشی چل پڑی تھی۔ جہاں تک اسے یاد تھا کہ دور دور تک اللہ رکھی کا کوئی ایسا قریبی جاننے والا نہیں تھا جن کے ساتھ اسے جانے میں تامل نہ ہوتا، کیا گوٹھ کے لوگ تھے..... جو اسے ورغلا کر کسی بہانے اپنے ہمراہ

لے گئے تھے.....؟ بالآخر ساون نے ان خطوط پر غور کرنا شروع کیا تب اسے اپنے ایک خدشے پر یقین سا ہونے لگا..... لیکن..... یہ ”خدشہ“ ایک ایسا تعریف تھا جس کے اندھیروں میں تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ تھا۔ بہر طور ساون نے معصوم اللہ رکھی کو اس بھرے پُرے اجنبی شہر میں تلاش کرنے کے لیے اپنے قدم آگے بڑھا دیئے۔

☆=====☆=====☆

”میں اس سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔“ اللہ رکھی منشی میرل کی بات سن کر زور سے چلاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے جانے دو یہاں سے.....“ اسے اچانک ہی غیر یقینی حالات کی سفاکی کا احساس ہونے لگا تھا..... جو پریشانی اور گھبراہٹ کی ملی جلی کیفیت بن کر اس کی بڑی بڑی پھیلی ہوئی حسین آنکھوں سے مترشح ہو رہی تھی۔

”بیٹھو! یہاں..... اور پہلے میری بات پر اچھی طرح غور کرو.....“ منشی میرل نے اس بار قدرے سخت لہجے میں اللہ رکھی کی جانب گھور کر کہا اور اسے ڈراتے ہوئے بولا..... ”دیکھو..... تمہارے چاچا سوڈھل اور خانو کے بیچ جو معاہدہ طے پایا تھا..... اس کی باقاعدہ لکھت پڑھتے قانونی..... اور تیرے سنگ کے سلسلے میں اس شخص خانو نے سوڈھل کو جو چالیس ہزار کی رقم دی تھی اس کا ثبوت اور رسید بھی ہے اس کے پاس.....“ منشی نے خانو دھچکر کی جانب اشارہ کیا تھا جواب منشی میرل کے ساتھ ہی آن کھڑا ہوا تھا اور اللہ رکھی کو یوں گھورے جارہا تھا جیسے اسے نظروں ہی نظروں میں کھا جائے گا..... اللہ رکھی کو اس کا کالا بھنگ چہرہ انتہائی ناگوار معلوم ہو رہا تھا اور اسے کراہت سی محسوس ہو رہی تھی..... تاہم منشی میرل کی گفتگو..... جو سراسر جھوٹ پر مبنی تھی..... اس سے اللہ رکھی خاصی پریشان سی ہو گئی تھی..... عیار اور چال باز منشی میرل آنکھیں میکرے اپنی گہری مکارانہ نظروں سے سادہ لوح اللہ رکھی کے چہرے کو بغور تنکے جارہا تھا۔ پھر وہ خانو سے مخاطب ہو کر بولا..... ”اڑے خانو..... اسے شاید میری بات پر یقین نہیں آیا..... ٹو ایسا کر اسے وہ کاغذ اور رسید دکھا جس پر تیرے اور اس کے چاچا سوڈھل کے انگوٹھے کے نشانات ہیں.....“

خانو نے فوراً منشی میرل کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کچھ کاغذات کا پلندہ اللہ رکھی کی جانب بڑھایا اللہ رکھی کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا..... وہ پھٹی پھٹی پریشان کن نظروں سے خانو کے سیاہ روہاتھ مین چھوٹے بڑے کاغذات کو دیکھ رہی تھی جس پر کسی کے انگوٹھوں کے نشانات موجود تھے اور ان کے اوپر میزھے میزھے رسم الخط میں چاچا سوڈھل اور خانو کے نام بھی تحریر تھے..... اللہ رکھی گواہی زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی..... تاہم گوٹھ کے اکلوتے

اسکول میں بنیادی تعلیم ضرور حاصل کی تھی جو چوتھی پانچویں تک ہی محدود تھی..... اور مکاری منشی میرل بھولی بھالی معصوم اللہ رکھی کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے جھوٹے کاغذوں میں الجھانے کی کوششیں کر رہا تھا۔ اللہ رکھی انہیں دیکھ کر پریشان سی ہو گئی تھی لیکن پھر بھی وہ اپنی بات پر ڈٹی رہی اور اٹل لہجے میں بولی۔

”مم..... میں یہ روپے اسے لوٹا دوں گی..... لیکن شادی کسی قیمت پر بھی نہیں کروں گی اس سے۔“ اس کا اشارہ خانو دھچکر کی طرف تھا۔

خانو اس کی بات پر غصے سے بل کھا کر اٹھ گیا..... اور معصوم اللہ رکھی کو شکمے ایسی نظروں سے گھور کر بولا۔ ”مجھے روپے نہیں تیرا سنگ چاہئے اب..... سیدھی طرح مان جاو نہ میں پولیس کے ذریعے تجھے.....“ اس نے دانستہ اپنا جملہ اثر ڈالنے کی خاطر ادھورا چھوڑ دیا۔

اللہ رکھی بے چاری خوف سے سمٹ سی گئی اور ہراساں ہر بنی کی طرح نظر آنے لگی..... جو بھوکے بھیڑیوں کے غول میں پھنس گئی ہو۔

ایسے میں منشی میرل تصنع آمیز لہجے میں خانو کو ذرا ڈپٹتے ہوئے بولا..... ”ٹو چپ کر بابا..... میں بات کر رہا ہوں نا.....“ پھر وہ سہمی ہوئی کھڑی اللہ رکھی سے مخاطب ہوا..... ”دیکھ دھی..... بات تو خانو کی درست ہی ہے..... وہ کاغذوں کی راہ سے حق پر ہے کہ وہ کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹائے..... اور پولیس کے پاس جائے..... لیکن تو گڑتی نہ کر میں ایسا کرنے نہیں دوں گا..... ویسے بھی یہ غصے میں ایسا بول رہا ہے..... آخر کو تم دونوں ایک ہی گوٹھ کے رہنے والے ہو..... اچھا ایسا کر تو آرام سے بیٹھ کر سوچ لے..... ہم پھر آئیں گے..... لیکن میں پھر یہی کہوں گا کہ ہماری بات مان لینے میں ہی تمہارا فائدہ ہے..... سوچ لینا۔“ آخری الفاظ اس نے قدرے سنسناتے لہجے میں کہے تھے۔

اللہ رکھی کو جھرجھری سی آگئی..... جب منشی میرل اور خانو اسے تبا چھوڑ کر جانے لگے تو اللہ رکھی یک دم کپکپاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھی اور منشی میرل کے آگے اپنے دونوں نازک ہاتھ جوڑ کر لرزیدہ لہجے میں بولی..... ”منشی چاچا..... تجھے رب سائیں کا واسطہ..... ابھی یہ بات رہنے دے..... ہسپتال میں میری چاچی بیمار پڑی ہے..... وہ چاک (تندرست) ہو جائے تو.....“

منشی میرل فوراً اس کی داد فریاد کو رد کرتے ہوئے سراسر اتارے لہجے میں بولا، جس میں طنز کی بھی آمیزش شامل تھی۔ ”نا..... دھیئے..... نا..... اب تو زیادہ چالاک نہ بن..... اس

بے چارے خانو کے پورے چالیس ہزار داؤ پر لگے ہوئے ہیں تیری چاچی کا کچھ پتہ نہیں مرے کہ بچے..... پھر تو بھی اکیلی رہ جائے گی۔“

منشی میرل کے سنگدلانہ تبصرے پر بیچاری اللہ رکھی کا دل کٹ سا گیا۔ وہ بے اختیار بولی۔ ”منشی چاچا..... میری چاچی کو ایسی بد دعا تو نہ دے میرا اس کے سوا دنیا میں کوئی بھی نہیں.....“ یہ کہتے ہوئے بے اختیار اللہ رکھی کا دل بھرا آیا..... اور اس کے سینے میں دھواں سا بھرنے لگا..... مارے رقت کے اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی..... اور وہ اس وقت کو کو سننے لگی جب وہ..... ان مردودوں کے ساتھ ورغلانے میں آکر بنا سوچے سمجھے یہاں چلی آئی تھی..... خانو کی طرف سے تو اس کے دل میں گویا جیسے نفرت کا ایک بے اندازہ طوفان اٹھنے لگا..... وہ اس سے شادی تو کجا اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ پھر وحشت بھرے لہجے میں گڑ گڑاتے ہوئے منشی سے بولی۔ ”منشی..... دیکھ..... میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں تجھے دھڑیں سائیں کا واسطہ..... تجھے آپڑیں مرشد سائیں کا واسطہ دیتی ہوں..... میں بہت مصیبت میں ہوں..... مجھے..... ہسپتال چاچی کے پاس جانے دے..... اس وقت.....“ انتہائی بے بسی و بے چارگی کے مارے اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہتے ہوئے..... شبی لکیریں سی بناتے موتیوں کی طرح نیچے ٹپکنے لگے..... وہ دوبارہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں گڑ گڑائی۔ ”مجھے جانے دو..... میں مر جاؤں گی یہاں..... تمہیں اللہ سائیں کا واسطہ..... میں بہت دکھی ہوں.....“ اس کی گریہ زاری جاری تھی..... لیکن سنگ دل اور کھٹور منشی میرل اور خانو یہ اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا ہاں..... ان کے چہروں سے یوں ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ اللہ رکھی کی بے بسی سے حظ اٹھا رہے ہوں اس معصوم کے نالہ و شیون سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔

پھر وہ دونوں اللہ رکھی کو اس کے حال پر چھوڑ کر کمرے سے نکل گئے..... اللہ رکھی سستی، ہلکتی آگے کو بڑھی..... مگر دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا..... اسے قید کر دیا گیا تھا۔ اس نے مقدور بھر دروازہ کھولنے کے لیے زور آزمائی کی مگر بے سود..... وہ روتی آنکھوں کے ساتھ واپس پلٹی پھر ٹوٹے ٹوٹے انداز میں صوفے پر گرسی گئی..... اس کی ٹانگیں حتیٰ کہ پورا وجود..... وحشت انگیز ارتعاش میں مبتلا تھا۔ وہ خود کو ایک بے بس چڑیا کی مانند اپنی پنجرے میں محسوس کر رہی تھی وہ ساون کو یاد کر کے رونے لگی..... وہ اسے نہ پا کر کتنا پریشان ہو رہا ہوگا..... اسے منشی میرل کی اس بات پر ہنوز تردد تھا بلکہ یقین تھا کہ انہوں نے ساون سے متعلق سب کچھ جھوٹ کہا ہے۔ ساون کبھی اسے یوں تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتا..... بلکہ وہ

اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہوگا..... اب اللہ رکھی کو دھیرے دھیرے یہ ادراک ہو چلا تھا کہ اس کے ساتھ منشی میرل اور خانو نے دھوکا کیا ہے اور اسے چالاکی سے یہاں لے آئے ہیں اور اب جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ تاہم اسے اس بات پر بھی تشویش ہونے لگی تھی کہ کیا واقعی اس کے سوڈھل چاچا نے دودا خان کے علاوہ اس بد ذات خانو دھچر سے بھی روپے لے کر اس کا سودا کر رکھا تھا جس کا ثبوت خانو..... کاغذوں میں سوڈھل کے لگے انگوٹھے دکھا کر پیش کر رہا تھا..... اور بہ طور ثبوت منشی میرل بھی پیش پیش تھا..... لیکن باوصف اس کے اللہ رکھی کو اس ساری کہانی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بہر طور اللہ رکھی اب ساری باتوں کو ذہن سے جھٹک کر یہاں سے بھاگ نکلنے کے امور پر غور کرنے لگی اسے اس بات پر یقین واثق تھا کہ ایک بار وہ ساون کے پاس چلی جائے..... پھر اسے کسی سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

کمرے میں گہرا سا سکوت طاری تھا..... اللہ رکھی اپنی جگہ بیٹھی اب گہری نظروں سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی..... کمرہ نہ زیادہ بڑا تھا نہ چھوٹا..... تاہم وہ ہر طرح کی آرائش و زیبائش کی اشیاء سے آراستہ تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اس نے محسوس کیا جیسے اس کے اندر یکایک خود اعتمادی عود کر آئی ہو..... اس نے دل ہی دل میں اللہ سے دعا مانگی کہ وہ کسی طرح اسے اس جہنم سے بہ حفاظت فرار کر دے..... وہ اب کمرے سے فرار کے امکانات پر غور کر رہی تھی۔ کمرے کا ایک بیرونی دروازہ تو بند تھا..... جبکہ ایک عقبی دروازہ بھی تھا جسے اللہ رکھی نے کھول کر نہیں دیکھا تھا۔ یہ وہ دروازہ تھا جہاں سے ادھیڑ عمر ملازمہ نمودار ہوئی تھی یہ شاید اندرونی طرف بنگلے میں کھلنے والا دروازہ تھا۔ چار و ناچار اللہ رکھی نے اسے ہی آزمانے کا فیصلہ کیا۔ وہ یہاں سے نکلنے کے لیے ایک پل بھی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اسے منشی میرل کی یہ بات اچھی طرح یاد تھی کہ وہ بہت جلد اس کا فیصلہ سننے کے لیے دوبارہ لوٹیں گے۔ لہذا ان کے آنے سے پہلے ہی اللہ رکھی اس منحوس بنگلے سے نکل جانا چاہتی تھی..... جب اس نے اپنے مطلوبہ دروازے کو کھولنے کے لیے زور آزمائی کی تو اس کا دل خوشی سے دھڑک اٹھا..... کیونکہ دروازہ دوسری جانب سے بند نہیں تھا..... لیکن پھر جیسے ہی اللہ رکھی نے دروازہ پورا کھولا تو سامنے نگاہ پڑتے ہی وہ بری طرح ٹھٹکی تھی..... دوسری جانب ادھیڑ عمر ملازمہ کھڑی اللہ رکھی کو عجیب سی نظروں سے نکتے جا رہی تھی..... مگر اس طرح کہ اس کا سانولا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

”ہاں دھیئے! تجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہئے ورنہ..... ورنہ..... تو بھی میری

دھی فرزانہ کی طرح ان شیطانوں کی بھینٹ چڑھ جائے گی.....“ دروازے کی دوسری جانب کھڑی ادھیڑ عمر ملازمہ اپنی بھگی ہوئی آنکھوں سے اللہ رکھی کو دیکھتے ہوئے بولی تو اللہ رکھی کو اس کے رقت آمیز لہجے نے قدرے حوصلہ بخشا۔

لحہ بھر توقف کے، وہ ملازمہ جس کا نام مائی رحمت تھا دوبارہ لرزیدہ لہجے میں بولی۔  
 ”آجا..... میرے ساتھ..... تجھے بنگلے کے پچھواڑے سے باہر نکال دیتی ہوں..... آگے رب سائیں..... تجھ پر رحم کرے۔ آجا..... نکڑا.....“ یہ کہتے ہوئے وہ واپس مڑی۔

اللہ رکھی نے بھی اپنے قدم اس کے عقب میں بڑھا دیئے..... وہ مائی رحمت کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی..... ایک اور نسبتا بڑے ہال کمرے سے ہوتی ہوئی..... ایک تنگ سی راہداری سے گزرتی ایک جگہ رک گئی..... یہ بنگلے کا عقبی حصہ تھا جو خاصا شکستہ سا نظر آ رہا تھا..... یہاں ایک پٹ والا چوکھٹا بھی موجود تھا جس کا سالنورہ سا دروازہ بند تھا..... مدھم سی روشنی میں پُر سکوت سناٹا جتنا محسوس ہو رہا تھا..... مائی رحمت مذکورہ دروازے کے قریب پہنچ کر اطراف کی سن گن لیتی رہی۔ بنگلے کے مختلف کمروں کا یہ پچھواڑا تھا..... کمروں کے روشندان و اتھے اور کہیں کہیں ان میں مدھم سی روشنی بھی پھوٹ رہی تھی..... اللہ رکھی کا دل کسی اچانک ہونے والی انہونی سے بری طرح دھڑک رہا تھا..... مائی رحمت نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا تو سالنورہ دروازے کی ہلکی سی ناگوار چرچراہٹ پُر سکوت سناٹے میں وحشتناک محسوس ہوئی..... دروازہ کھلتے ہی ایک سردلہر نے اللہ رکھی پر جھرجھری سی طاری کر دی..... سامنے تاریکی سی پھیلی ہوئی تھی..... مائی رحمت نے اللہ رکھی سے سرگوشی میں کہا۔

”دھیئے!..... چند قدم سیدھے جانے کے بعد جب دیوار آجائے تو اس کے ساتھ ساتھ دائیں جانب چلی جانا..... تب تیرے سامنے ایک اور دیوار آجائے گی..... وہاں گٹر ہوگا جس پر خاصی اونچی سینٹ کی دکی (چبوترا) نظر آئے گی۔ وہیں عقب میں جہاں دونوں دیواروں کا ٹکون بن رہا ہوگا وہاں ایک اتنا بڑا سوراخ ہوگا کہ اگر تو زمین پر لیٹ کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کرے گی تو باسانی اس جہنم سے نکل سکتی ہے.....“ اتنا کہہ وہ چپ ہو رہی۔

اللہ رکھی نے اس کی بات غور سے سن کر ذہن نشین کر لی تھی..... اس نے ایک ثانے تشکر آمیز نگاہوں سے مائی رحمت کی جانب دیکھا تو وہ دوبارہ اللہ رکھی سے اس بار ذرا غلت میں بولی۔ ”دھیئے! دیر نہ کر..... ورنہ تیرے ساتھ میں بھی ماری جاؤں گی..... پھر

کون کسی ”فرزانہ“ کو اس جہنم سے نجات دلایا کرے گا۔“

اللہ رکھی اس کی بات کا مطلب فوراً سمجھ گئی اور پھر اس نے باہر نکلنے میں دیر نہیں لگائی تھی..... اس کے باہر نکلنے ہی پیچھے سے مائی رحمت نے دروازہ فوراً بند کر دیا تھا..... اللہ رکھی کے نازک چہرے پر ایک تنگ بستہ سیلن سی ٹکرائی اسے جھرجھری سی آئی..... اس نے آگے قدم بڑھائے..... یہاں زمین کچھ زدہ سی محسوس ہو رہی تھی..... اللہ رکھی کی نہیں..... ایک دو جگہ اس کا پاؤں پھسلا..... مگر سنہلے ہوئے وہ چلتی رہی..... یہ کافی زدہ سی جگہ تھی جہاں گندے آبی پودوں اور جا بجا گھاس کی ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی..... آسمان صاف تھا اور آخری تاریکوں کی مدھم سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی..... چند قدموں کے بعد سامنے دیوار آگئی مگر اللہ رکھی کی نہیں اور دیوار کے ساتھ ساتھ دائیں جانب مڑ گئی..... ذرا دیر بعد ہی..... گٹر کے اوپر بنا ہوا سینٹ کا چوکور چبوترہ نظر آ گیا..... اور اس کے بالکل عقب میں جہاں دیوار کا مثلث تھا نیچے کی طرف ایک آدم گزرا سوراخ نظر آیا..... اللہ رکھی فوراً جیسے تیسے خود کو زمین کے ساتھ لگا کر گھسٹی ہوئی تنگ سے سوراخ سے باہر نکل آئی..... یہ بنگلوں کا پچھواڑے کا علاقہ تھا جہاں خاصی گندگی سی نظر آ رہی تھی..... یعنی سامنے سے بنگلے خوبصورت تھے پیٹھ پیچھے ان کی گندگی تھی..... کچھ آلود زمین سے لگ کر سوراخ پار کرنے کی وجہ سے اللہ رکھی کے کپڑے، چہرہ سب گندے ہو رہے تھے..... اس وجہ سے اسے ٹھنڈ بھی کچھ زیادہ ہی لگ رہی تھی..... لیکن اسے اس کی ذرا پروا نہ تھی..... سامنے مدھم چاندنی میں اسے ایک ذیلی سڑک نظر آ رہی تھی..... تھوڑی دیر بعد اللہ رکھی پُر سکوت رات کے سناٹے میں مذکورہ سڑک کے کنارے آگے بڑھنے لگی۔ اس کا دل جیسے کپٹیوں پر دھڑک رہا تھا..... سانس بھی خاصی پھولی ہوئی اور بے ربط سی ہو رہی تھی..... پورے وجود میں عجیب سی کپکپی طاری تھی..... اسے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا کہ..... وہ کہاں جائے..... اس کے لیے تو یہاں کا چپہ چپہ اجنبی تھا جہر قدم بڑھاتی وہاں ایک نیا سوسہ اور اندیشہ ناگ کی طرح کنڈلی مارے موجود تھا..... تاہم اس کی کوشش یہی تھی کہ وہ کسی طرح سے ہسپتال..... چاچی عنایتاں اور ساون کے پاس پہنچ جائے..... ساون کا خیال آتے ہی اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا..... وہ کہاں ہوگا اس وقت..... ضرور وہ اس کی تلاش میں شہر کا کونا کونا چھان رہا ہوگا..... معاً چلتے چلتے اللہ رکھی کو یوں لگا جیسے کوئی اس کے عقب میں دوڑا چلا آ رہا ہو..... وہ بے چاری ایسی دہشت زدہ ہوئی کہ پیچھے مڑ کر اپنے ”متعاقب“ کو دیکھنے کی بھی سعی نہ کی اور دیوانہ وار دوڑنے لگی۔ چہار سو وحشت ناک رات کے سناٹے اسے خوفناک

بلاؤں کی طرح چیختے چلاتے اور اس کی بے بسی پر جیسے قہقہے لگاتے ہوئے محسوس ہونے لگے..... اللہ رکھی کا سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا..... نازک وجود بے دم سا ہونے پر پھر اگلے ہی لمحے اس کا پاؤں رپنا اور وہ بری طرح لڑکھڑا کر چیخ مارتے ہوئے گری تب اس کا سر..... ایک لیپ پوسٹ سے ٹکرایا اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆=====☆=====☆

ساون کے اطراف و جوانب میں ٹریفک کا ایک اثر و ہام سا تھا..... دن جیسے جیسے ڈھل رہا تھا ساون کی بے چینی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا وہ اللہ رکھی کی تلاش بسیار میں پاگلوں کی طرح شہر لاڑکانہ کا جیسے کونہ کونہ چھان مار رہا تھا..... اجنبی شہر کی اجنبی راہیں اس کے وحشت ناک اندیشوں میں اضافے کا سبب بن رہی تھیں اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ شہر کے ایک ایک گھر..... ایک ایک کمرے کو چھان کودیکھے کہ اس کی الم نصیب اللہ رکھی شاید کہیں کسی کونے میں بیٹھی اپنے تیرہ و تار مقدر پر آنسو بہا رہی ہو..... شام ڈھلی تو رات نے آلیا ساون کی پریشانی فزوں تر ہونے لگی..... اس کے دل و دماغ میں کوئی جیسے اندیشوں، وسوسوں کے کوڑے برسار رہا تھا۔

”اللہ رکھی! تو کہاں چلی گئی..... اس بھرے پُرے شہر میں..... میں تجھے کہاں ڈھونڈوں..... تجھے تو گوٹھ کے لوگوں نے نہیں بخشا..... یہ تو شہر ہے..... ایک نقاب ریا چڑھائے ہوئے انسانوں کا شہر.....“ ساون جیسے اپنے اندر چیختے لگا..... اپنی زندگی میں پہلی بار ساون نے محسوس کیا کہ وہ کتنا بے بس اور کمزور ہے..... ورنہ کیسے بھی دگرگوں حالات ہوتے، اس نے ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا اور یہی زعم اسے ہر طرح کے حالات سے نبرد آزما ہونے کی طاقت فراہم کرتا تھا..... لیکن آج..... وہ خود کو بالکل ٹوٹا ہوا محسوس کرنے لگا تھا..... اللہ رکھی کی اچانک گمشدگی سے اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا کوئی نازک سا آگینہ کہیں کھو گیا ہے اور جس کے ٹوٹ جانے کے اندیشے سے وہ خود اندر ہی اندر گھلتا جا رہا ہے۔ اللہ رکھی کی مجنونانہ تلاش میں گزرتا ہوا ہر لمحہ اس کی وحشتوں میں اضافہ کر رہا تھا..... دل و دماغ پر بوجھ بڑھنے لگا تو اعصاب بھی مضطرب ہونے لگے نتیجتاً..... جسم نے بھی تھکن سے چور کر ڈالا..... پھر پتہ نہ چلا کہ ساون نے وہ عذاب ناک رات کس جگہ بیٹھ کر گزار دی..... کسی نے درست ہی کہا ہے ایسے موقع پر کہ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے..... اور ساون نے بھی وہ رات سولی پر چڑھ کر گزار دی تھی۔ آنکھ کھلی تو کوئی اسے بھینچھوڑ کر جگا رہا تھا..... وہ ”کوئی“ اس کا باپ مگو تھا..... جو گوٹھ سے بیٹھ کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں

شہر آپہنچا تھا اور اب اچانک ساون ایک بند دکان کے ٹھہرتے ہوئے تھڑے پر ٹیک لگائے لیٹا ہوا تھا۔

”اٹھ..... میڈا پٹ ساون!..... یہ تجھے کیا ہو گیا ہے..... تو یہاں کیا کر رہا ہے.....؟“ مگو بیٹے کی ہیبت کدائی پر کڑھتے ہوئے بولا..... ساون بری طرح چونکا۔ وہ اب پوری طرح جاگ چکا تھا..... پر ایسے کہ اسے جاڑا پالے کی صورت لگ چکا تھا وہ بری طرح ٹھہر رہا تھا..... وہ باپ کو اپنے..... پہچان چکا تھا..... مگر بولا کچھ نہیں..... اس کے سینے میں مایوسیوں کا دھواں بھرا ہوا تھا اسے رشتوں کی بھی پہچان نہیں رہی تھی..... بلکہ اللہ رکھی کی گمشدگی کا ذمہ دار بھی وہ اپنے باپ کو ہی سمجھ رہا تھا..... اگر وہ اس کی اللہ رکھی کو اپنی بہو تسلیم کر لیتا تو آج نہ وہ کہیں کھوئی اور نہ ہی خود وہ اس کی تلاش میں در بدر اور خاک بسر ہو رہا ہوتا..... مگو نے بیٹے کی آنکھوں میں بے رخی بھانپ لی تھی وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے بڑے رسان سے مخاطب ہوا..... ”میڈا پٹ.....! تو اپریں پوکو بھی نہیں پہچان رہا..... میں تیرا بیو ہوں..... گوٹھ سے آیا ہوں..... اٹھ چل میڈے نال گوٹھ..... اٹھ شاباش“۔

”نہیں بابا..... میری اللہ رکھی کھو گئی ہے یہاں..... اس شہر میں..... میں اسے تلاش کئے بنا گوٹھ کا رخ تک نہیں کروں گا.....“ ساون نے بالآخر پر قابو پاتے ہوئے جواباً اٹل لہجے میں کہا..... لحظہ بہ لحظہ اس کے اندر باپ کو دیکھ کر تنگی سی اتر رہی تھی اور وہ یہی چاہتا تھا کہ اس سے کسی قسم کی گستاخی ہونے سے پہلے باپ کو واپس رخصت ہونے پر مجبور کر دے لہذا بولا..... ”بابا.....! تو واپس چلا جا گوٹھ“.....

”اڑے میڈا پٹ..... ایسے کیسے گوٹھ چلا جاؤں..... حالت تو دیکھ اپریں..... جاڑا لگ گیا ہے ڈرے تیکوں..... اتھے گوٹھ میں تیری امڑ اور ادی ہدایتاں گڑنی (فکر) کر رہے ہیں تیری اور تو“۔

”بابا! رہن دے ایسی باتوں کو تو.....“ ساون نے تلخی سے باپ کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور مزید بولا..... ”تیکوں اگر اتنا ہی خیال ہوتا ان باتوں کا تو پھر تو“۔

”ھل بابا! ھل..... ماٹھ کرھن..... چپ کر..... حیا کر کچھ بیوہوں میں تیرا.....“ جواباً مگو بھی اپنے بیٹے ساون کی بات کاٹتے ہوئے قدرے خفت آمیز لہجے میں بولا..... تاہم وہ اللہ رکھی کی اچانک گمشدگی کا سن کر ایک لمحے کو چونکا ضرور تھا۔ باپ کی خفت آمیز گھر کی سن کر ساون مجبور سا ہوا لہذا بولا۔



کیونکہ وہ بہر حال بے قصور تھا..... ایک بدنام دھاڑیل سمیت گرفتار ہونا اسے بھی عادی مجرموں کی صف میں کھڑا کر رہا تھا اور ای بات سے اکودھاڑیل کو علی بخش سے متعلق تشویش ہو رہی تھی..... اس کی کوشش بھی یہ تھی کہ کسی طرح علی بخش پر ”دھاڑیل“ (ڈاکو) کا لیبل نہ لگے ورنہ وہ ساری عمر اندھیروں میں گم ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ان سلاخوں کے پیچھے آنے والے کئی بے گناہ لوگ..... آج جنگلوں کے اندھیروں میں ڈوب چکے تھے جن میں وہ خود بھی شامل تھا۔ انہیں لاکھ اپ ہوئے یہاں آج تیسرا دن تھا..... اور پولیس مزید پندرہ بیس دنوں کا ان کا ریمانڈ لینا چاہتی تھی..... اس دوران حوالات میں اکودھاڑیل کا ایک ساتھی بھی بمشکل تھانے کے عملے کی مٹھی گرم کر کے اس سے ملاقات کرنے آیا تھا.....

”سردار سائیں! حکم کرو، تھانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں..... ہمراہ (ساتھی) سب گرم ہو رہے ہیں..... تیری گرفتاری پر۔“ اس نے سرگوشی میں اکودھاڑیل سے کہا تھا..... مگر اکودھاڑیل یہ نہیں چاہتا تھا..... کوئی اور موقع ہوتا تو وہ..... اپنے جاں نثار ساتھیوں کو ”گرین سگنل“ دے دیتا مگر اب وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا..... درحقیقت اس تھانے سے فرار ہونا اس کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی..... لیکن علی بخش کی مجبوری آڑے آ رہی تھی..... اگر وہ علی بخش سمیت یہاں سے فرار ہوتا تو اس پر ساری عمر کے لیے ایک عادی مجرم کی مہر ثبت ہو جاتی۔

لہذا اکودھاڑیل اپنے ساتھی کی بات پر اسے منع کرتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”نہیں..... یار.....! اس کا ابھی وقت نہیں آیا..... پر تو ایک کام کر.....“

”ہاں سردار سائیں! بولو.....“ وہ مستعدی سے بولا۔

”دیکھ..... وارہ..... سے آگے ایک گوٹھ ہے گڑھی جاگیر..... وہاں کاوڈیرا رب نواز میرا دوست ہے۔ اسے میرا سلام کہہ دینا اور صرف اتنا بتا دینا کہ ایک چھوکرے علی بخش ولد دودا خان مرحوم کی ضمانت کے سلسلے میں کچھ کرے.....“ اس کی بات بغور سننے کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی علی بخش نے ذرا حیرت سے پوچھا..... ”اکو چا چا! یہ کیا بات ہوئی..... تو نے صرف میری ضمانت کے لیے ہی کیوں کہا اسے..... کیا تو اپنی ضمانت نہیں کروائے گا؟“

علی بخش کی بات پر اکودھاڑیل نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا..... ”دیکھ علی بخش! جیل کی دیواریں ہی دراصل میری آزادی کی ضمانت ہیں جو میرے لئے پلک

”بابا..... تو گوٹھ چا جا واپس..... امڑ اورادی کو میری دل جا (تسل) دے جا کر..... میرا وعدہ ہے..... اللہ رکھی جیسے ہی مجھے مل گئی میں آجاؤں گا اس کے ساتھ گوٹھ واپس.....“ موگو، بیٹ کی بات پر قدرے مغموں چہرے سے اسے تنکے لگا آخر کو وہ اس کا باپ تھا، جانتا تھا کہ ہٹ میں سواہی ہوگا..... لہذا ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔

”اچھا..... پھر میری دعا ہے دھڑیں سائیں سے..... دھی اللہ رکھی تجھے لہجہ (مل) جائے..... تو سیدہ گوٹھ آجانا..... میں تم دونوں کی شادی کر دوں گا..... پروعدہ کر..... تو واپس مڑ کر آئے گا گوٹھ.....“ ساون باپ کی بات پر پہلے تو کھل سا گیا..... مگر پھر وہی اس پر قنوطیت طاری ہونے لگی..... اور وہ دل میں سوچنے لگا کہ کاش اس کا باپ شروع ہی میں مان لیتا..... تو آج اللہ رکھی گم نہ ہوتی..... ”اچھا تو اٹھ یہاں سے چل کر کسی ہوٹل میں مانی مکر کھاتے ہیں..... اٹھ.....“ موگو پدرانہ شفقت سے بولا..... اور ساون چارونا چار اٹھ کھڑا ہوا۔

☆=====☆=====☆

رات جیسے بھاری سل کی طرح سرک رہی تھی..... جا بجا اکھڑتے ہوئے فرش کی لہو کو برفاب بناتی ٹھنڈک رگوں میں سرایت کر رہی تھی..... بارہ بائی نو کے مختصر سے کمرے میں مدہم پاور کا بلب بوجھل سی روشنی پھیلا رہا تھا۔ تین اطراف کی اکھڑے ہوئے پلستر کی سیلن زدہ دیواروں کی چوتھی طرف سلاخ دار دروازے کے پار..... برآمدے میں تاریکی اتری ہوئی بڑی پڑاسرا محسوس ہو رہی تھی..... ایسی ہی چند اور بھی قطار در قطار بیرک نما کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں..... وہاں موجود سب قیدی میلی چیکٹ بوریاں سی اوڑھے فرش پر لیٹے خراٹے لے رہے تھے..... مگر مذکورہ بارہ بائی نو کی بیرک نما کوٹھڑی میں وہ دونوں دیوار کے قریب..... گودڑیاں اوڑھے سگڑے سمنے بیٹھے ہوئے تھے..... یہ اکودھاڑیل اور علی بخش تھے..... ان دونوں کے جوش اور غصے سے متماتے ہوئے چہروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے ان کے درمیان اس اچانک پلٹتی ہوئی مخدوش صورت حال پر کافی دیر تک تبادلہ خیال ہوتا رہا ہے..... اور اب ان کے پاس بیچ و تاب کھانے کے سوا کچھ نہیں بچا تھا۔

وہ دونوں اس وقت گوٹھ کے تھانے میں موجود تھے..... حوالات میں آنے سے قبل ہی اکودھاڑیل کو کسی گہری سازش کی بو محسوس ہو چکی تھی..... جس کی تصدیق علی بخش نے بھی جواباً یہ کہہ کر بھی دی تھی کہ..... یہ کام اس کے سوتیلے بھائی محرم علی اور اس کے دونوں ماموں کا ہی انجام کر رہا ہے، لیکن اکودھاڑیل کو خود سے زیادہ علی بخش کی فکر ستر رہی تھی.....

جھپکنے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں..... لیکن میں نہیں چاہتا کہ تجھے بھی اپنے ساتھ.....  
”مفروز“ بنا کر لے جاؤں..... اور ساری عمر پھر نو پولیس سے چھپتا پھرے۔“ علی بخش اس  
کی بات کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔

اکو کے ساتھی نے بڑی مستعدی کا مظاہرہ کیا تھا اس نے اکو دھاڑیل کی ہدایت پر  
فوری عمل کیا تھا کیونکہ اگلے دن ہی ایک سنجیدہ روخص جو سیاہ کوٹ اور پینٹ میں ملبوس تھا،  
وہ آکر علی بخش سے ملا..... اکو دھاڑیل پر اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی  
تھی..... اس نے چند لمحے علی بخش سے کچھ ضروری باتیں پوچھیں اور کچھ اسے ہدایت دیں  
پھر وہ کسی وکالت نامے ٹائپ کی چیز پر علی بخش کے دستخط وغیرہ لے کر چلتا بنا..... بہر طور بعد  
میں اکو دھاڑیل نے مسکراتے ہوئے علی بخش کو یہ بات سمجھا دی تھی کہ یہ شخص اس کے  
دوست و ڈیرے رب نواز کا بھجبا ہوا یعنی بند و بست کیا ہوا وکیل تھا جو اس کی (علی بخش)  
ضمانت اور مقدمہ لڑنے کے لیے یہاں بھجبا گیا تھا اس نے علی بخش کو تفصیلاً ”برین واش“ کر  
ڈالا تھا کہ اسے کون سا موقف اختیار کرنا ہے..... جس کا مختصر آلب لباب یہی تھا کہ اس کا  
دھاڑیل اکو سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ اسے جانتا ہے..... لہذا اسے محض ایک  
سازش کے تحت اس کے سوتیلے بھائی اور ماموؤں نے ہوٹل اور دیگر جائیداد وغیرہ سے  
”بے دخل“ کرنے کی کوشش کی ہے..... اور اس کا ”گٹھ جوڑ“ ایک بدنام دھاڑیل (اکو)  
سے جوڑا جا رہا ہے..... جو سراسر نا انصافی ہے..... وغیرہ وغیرہ۔“

لیکن اس سارے معاملے میں تھانے کا انچارج انسپکٹر ارشد لاشاری ڈرائیو بھی کھیر  
ثابت ہو رہا تھا..... اور وہ علی بخش پر تشدد کر کے اس سے یہ بیان لینے پر تلا بیٹھا تھا کہ وہ اپنا  
دیرینہ تعلق اکو دھاڑیل کے ساتھ تسلیم کر لے..... یہی وجہ تھی کہ..... وہ اس سلسلے میں علی بخش  
کا مزید پندرہ بیس دن کا عدالت سے ریمانڈ لینا چاہتا تھا..... مگر ادھر اکو دھاڑیل کے  
وڈیرے دوست رب نواز کا دوست وکیل زیادہ مستعد ثابت ہوا جس نے علی بخش کی فوراً  
عدالت کے ذریعے ذاتی چمکے پر ضمانت کروادی..... اس دن جیل سے رہا ہوتے وقت علی  
بخش بہت خوش تھا..... مگر تنہا آزاد ہونے پر مغموم بھی تھا..... اکو دھاڑیل اس کی افسردگی کی  
وجہ جانتا تھا لہذا اس کا شانہ تھپتھا کر سرگوشیاں لہجے میں اس تلی دیتے ہوئے بولا۔

”زے جوان!..... میری گزرتی نہ کر..... میں تو نکل ہی آؤں گا کسی طرح سے.....  
بس تو شریفوں کی طرح رہا ہو گیا..... یہی بہت ہے..... مل بابا بل، میرا انتظار کرنا..... ڈرنا  
بالکل نہیں۔“

اور یوں جب علی بخش خوش خوش رہا ہو کر..... دانستہ بجائے گھر جانے کے بجائے  
ہوٹل پہنچا تو..... حسب توقع محرم علی اور اس کے دونوں ماموں دوست محمد اور محمد علی خوش  
گپیوں میں مشغول تھے..... علی بخش پر نگاہ پڑتے ہی انہیں جیسے بچھونے ڈنک لیا..... وہ  
تینوں اسے دیکھتے ہی اچھل پڑے..... ان کے چہرے دھواں دھواں ہو گئے تھے جبکہ ہوٹل  
کے دیگر ملازمین کی کیفیت ذرا برعکس تھی..... وہ علی بخش کو صحیح سلامت اپنے سامنے موجود پا  
کر خوشی سے ”دھال“ ڈالنے لگے اور ہوٹل کا ریکارڈ بھی تیز آواز میں بجانا شروع کر دیا  
اور ”ہو جالو“ کا گیت باواز بلند گنگنانے لگے..... علی بخش کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ  
جیسے چسپاں ہو کر رہ گئی تھی۔

☆=====☆=====☆

یہ پُر تعیش اور بیش قیمت اشیاء سے آراستہ ایک شاندار کمرہ تھا جس کی ہر اک شے  
سے امارت نکلتی محسوس ہو رہی تھی لیکن ایک سوگواریت کا بھی احساس ہوتا تھا..... ایک  
جہازی سائز بیڈ پر اللہ رکھی آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھی اس کے سر پر پٹی بندھی تھی.....  
بے ہوش لیٹی اللہ رکھی کے بالکل سرہانے ایک نازک سی جوان خوبصورت لڑکی بھی بیٹھی  
اسے اپنے نرم و نازک ہاتھ سے سہلا رہی تھی۔ اس کے تلخ چہرے پہ تفکر آمیز پرچھائیاں سی  
پھیلی ہوئی تھیں..... جس میں دوستانہ حلاوت کی آمیزش بھی بدرجہ اتم موجود تھی..... معاً  
کمرے کا دروازہ کھلا اور سادہ سی ساڑھی میں ملبوس ایک پُر وقاری خاتون نمودار ہوئی.....  
وہ گوری رنگت کی ایک ادھیڑ عمر عورت تھی..... چہرے پر ایک ذمہ دارانہ گہری متانت چھائی  
ہوئی تھی..... ”روزی بیٹی! ہوش آیا..... اس لڑکی کو.....؟“ اس عورت نے اللہ رکھی کے  
سرہانے فکر مند سی بیٹھی لڑکی سے پوچھا۔

”جی جی! ابھی اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور پانی بھی مانگا تھا.....“ روزی نامی لڑکی  
نے جواب دیا اس کا پورا نام روزینہ تھا اور وہ عورت اس کی ماں تھی..... جو ایک معروف ایم  
پی اے کی بیوہ تھی..... اس کا نام..... اختر بانو تھا..... وہ اب بیڈ کے قریب آکر..... اللہ رکھی  
کو بغور تنقے لگی..... پھر دوبارہ اپنی بیٹی روزی سے بولی۔

”اس کا مطلب کچھ امپر ومنت ہوئی ہے..... اور خطرے والی بات بھی نہیں.....“  
روزی جواباً چپ رہی۔ اختر بانو قریب دھری ایک کرسی پر بیٹھ گئی..... اسی لمحے اللہ رکھی کے  
بے سدھ وجود میں جنبش سی ہوئی..... پھر اس نے کراہتے ہوئے دھیرے دھیرے اپنی  
آنکھیں کھولیں..... چند ثانیے چھت کو گھورتی رہی۔

تصویر بنا ساون اللہ رکھی کی تلاش میں پورے شہر میں در بندر ہو رہا تھا۔ اس کا باپ موگودل مسوس کر اور بیٹے کی دیوانگی و فرزانگی سے مجبور ہو کر واپس گھٹا اپنے لوٹ گیا تھا۔ ساون کو اس شہر کی نور دی کرتے آج دوسرا دن تھا۔ اسے نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا۔ بس ایک دھن سائی ہوئی تھی کہ اللہ رکھی کو بہر حال ڈھونڈتے ہی رہنا ہے۔ جب تک کہ وہ اسے مل نہیں جاتی۔ دن پوری طرح نکل آیا تھا۔ دھوپ بھی خاصی تیز تھی۔ اور ساون جس شاہراہ پر کھڑا تھا وہ خاصی مصروف تھی۔ معاً ساون کی نگاہ متلاشی ایک بڑی سی کار پر پڑی اور وہ بری طرح ٹھنک گیا۔ اسے یوں لگا جیسے پوری کائنات اس مذکورہ کار میں سمٹ گئی ہو۔ اس نے دیکھا کار کی پچھلی سیٹ پر اللہ رکھی براجمان تھی۔ خوشی اور حیرت کے امتزاج نے پہلے ایک لمحے کے لیے اسے گنگ سا کر کے رکھ دیا۔ مگر پھر معاوہ چونکا ادھر کار جب ایک دوسری طرف کی ٹریفک کا موڑ کاٹتی ہوئی اس کے قریب سے گزرنے لگی تو ساون دیوانہ وار کار کے سامنے آ گیا۔ کار کے بریک زور سے چرچرائے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اختر بانو بوجھان تھی جبکہ عقبی سیٹ پر اللہ رکھی کے ساتھ اس کی بیٹی روزینہ بیٹھی تھی۔ ان دونوں کو زور سے جھٹکا لگا۔

”اے لڑکے۔۔۔۔۔ اندھے ہوتم۔۔۔۔۔؟“ اختر بانو کار کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے اپنا سر ذرا باہر نکال کر ساون کو غصے سے گھورتے ہوئے بولی۔ ساون اس اثناء میں۔۔۔۔۔ ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کے نزدیک آ گیا تھا۔

”میم صاحب؟۔۔۔۔۔ گاڑی روکنے۔۔۔۔۔ آپ کو اللہ کا واسطہ۔۔۔۔۔“ وہ جیسے گڑگڑایا۔۔۔۔۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ میری اللہ رکھی کو کہاں۔۔۔۔۔ لے جا رہے ہوتم۔۔۔۔۔؟“ اس کی بات پر اختر بانو چونکی۔ اور بغور بدحواس ساون کا چہرہ تکتے لگی۔ اتنے میں پیچھے سے آنے والی موٹر گاڑیوں کے ہارن چلانے لگے۔ اختر بانو کچھ سوچتے ہوئے کار سڑک کے کنارے لے آئی۔۔۔۔۔ ساون بھی پاگلوں کی طرح کار کے ساتھ ساتھ یوں چیکارہا جیسے وہ نکل نہ جائے۔ روزینہ کے چہرے پر الجھن سی نمودار ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھی اللہ رکھی نے بھی ایک اچنتی ہوئی بے تاثر نگاہ سے ساون کو دیکھا تھا۔۔۔۔۔ خود ساون کو ذرا حیرت سی ہوئی تھی اس بات پر کہ آخر اللہ رکھی اسے دیکھ کر کار سے اتر کیوں نہیں رہی۔ کیا جو میرے اندر اس کے لیے جتنی تڑپ اور پیاس ہے اس سے وہ مبرا ہو چکی ہے۔۔۔۔۔؟ درحقیقت ساون اسے اس شاندار سی گاڑی میں دیکھ کر متحیر بھی تھا۔۔۔۔۔ اختر بانو آپ کار کا دروازہ کھول کر باہر اتر آئی تھی۔ اس پاس کے کچھ لوگ انہیں دلچسپ اور پُر شوق نظروں سے نکتے جا رہے تھے۔

”ممی، اسے ہوش آ گیا ہے۔“ معار روزی اللہ رکھی کو ہوش میں آتے دیکھ کر قدرے خوشی سے بولی۔

”مم۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ کہاں ہوں۔۔۔۔۔؟“ اللہ رکھی جواب ذرا ہوش میں آچکی تھی لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

”بہن! تم ہمارے ہاں ہو۔۔۔۔۔ اور بالکل محفوظ ہو۔۔۔۔۔“ روزی نے ملائمت سے کہا۔ اللہ رکھی کو پورے وجود میں ناطقاتی سی محسوس ہوئی۔ خصوصاً اسے اپنے سر میں شدید اینٹھن اور درد کا احساس ہوا۔ اتنا کہ۔۔۔۔۔ بے اختیار اس کے منہ سے کراہی سی نکل گئی۔ اسے اپنے ذہن میں دھند سی چھائی محسوس ہونے لگی۔

”بیٹی!۔۔۔۔۔ اب کیسا محسوس کر رہی ہوتم۔۔۔۔۔ ٹھیک تو ہونا۔۔۔۔۔“ اختر بانو نے معاً کرسی سے اٹھ کر اللہ رکھی کے قریب آتے ہوئے اس سے نرم لہجے میں پوچھا۔ اللہ رکھی اب آہستہ آہستہ روزی کا سہارا لیتے ہوئے بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ باری باری متحیر نظروں سے پہلے اپنے آس پاس اور پھر دونوں ماں بیٹیوں کا چہرہ تکتے لگی۔ اس کے معصوم سے چہرے پر ان گنت سوالیہ نشان جیسے ثبت ہو کر گئے تھے۔ وہ دل و دماغ کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر کر کچھ یاد کرنے کی کوششیں کر رہی تھی۔

”مم۔۔۔۔۔ مجھے کیا ہوا تھا۔۔۔۔۔؟“ اس نے کپکپاتے لہجے میں سوال کیا۔

”بہن! تم ہمیں سڑک پر بے ہوش پڑی ہوئی ملی تھیں۔۔۔۔۔ تمہارے سر پہ چوٹ لگی ہوئی تھی۔۔۔۔۔“ روزی نے جواب دیا۔ لیکن اللہ رکھی کو جیسے تسلی نہیں ہوئی۔ وہ کچھ یاد کرنے کی سعی کرنے لگی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ ذہن عجیب سی گتھیوں میں الجھا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”بیٹی! تمہارا نام کیا ہے؟۔۔۔۔۔ تم کون ہو؟“ اس بار روزی کی ماں اختر بانو نے ملائمت سے اللہ رکھی کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ چند ثانیے تو اللہ رکھی انجانے انتشار کا شکار رہی پھر جیسے زور سے چلاتے ہوئے بولی۔

”مجھے نہیں معلوم۔۔۔۔۔ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔۔۔۔۔ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔“ اللہ رکھی نے یہ کہتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا اور دونوں ماں بیٹیاں تشویش آمیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی جانب تکتے لگیں۔

☆=====☆

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد۔۔۔۔۔ تہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو۔۔۔۔۔ کی

”تم اس کے کیا لگتے ہو.....؟“ اختر بانو نے کچھ سوچتے ہوئے ساون سے پوچھا..... وہ اس وقت لائٹ اسکاٹ کی کمری میں ملبوس تھی۔

”جی..... وہ..... یہ..... یہ میری اللہ رکھی ہے..... میرے گوٹھ داد پور کی رہواسی ہے..... آ..... آپ میم صاحب..... اس سے بے شک پوچھ لو.....“ ساون کے لہجے میں دیہاتی معصومیت اور بدحواسی تھی..... پھر وہ کارکی دوسری جانب والی عقبی سیٹ کی کھڑکی کی طرف آیا..... جدھر اللہ رکھی چپ اور بے تاثر چہرہ لئے بیٹھی تھی..... اس طرف کاشیشہ نیچے اترا ہوا تھا..... ”اللہ رکھی!..... تو بولتی کیوں نہیں..... ان لوگوں کو بتا..... کہ ہم کون ہیں.....؟“ ساون اللہ رکھی کے گنگ چہرے پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے بولا..... لیکن اس وقت ساون کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اللہ رکھی..... اسے پاگل سمجھتے ہوئے اپنے ساتھ بیٹھی..... روزینہ سے چمٹ گئی..... اور وہ ساون کو اجنبی اجنبی اور ڈری ہوئی نظروں سے تیکنے لگی جیسے ساون اسے کھا جائے گا..... ساون اللہ رکھی کو خود سے خائف اور انجان دیکھ کر شدید حیرت اور دکھ سے مجبور سا ہونے لگا..... وہ دوبارہ دیوانوں کی طرح اللہ رکھی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا..... ”اللہ رکھی؟ تو مجھے نہیں پہچان رہی؟..... مم..... میں..... ساون ہوں تیرا ساون..... تجھے کیا ہو گیا ہے..... اللہ رکھی تو مجھے پہچانتی کیوں نہیں.....؟“ یہ کہتے ہوئے ساون پاگلوں کی طرح کارکا دروازہ کھولنے کے لیے زور آزمائی کرنے لگا..... صورت حال خاصی عجیب سی ہو رہی تھی جس میں اختر بانو خود کو جھل سامحوس کرنے لگی..... لہذا وہ جلدی سے کارکی دوسری جانب تیز قدموں سے چلتی ہوئی آئی اور قدرے سخت لہجے میں ساون کو مخاطب کر کے بولی۔

”ظہرو؟..... لڑکے..... یہ کیا پاگل پن ہے..... اس لڑکی کو پریشان مت کرو یہ بیمار ہے۔“

”نہیں..... تم لوگ جھوٹ بولتے ہو..... تم نے میری اللہ رکھی کو کچھ کھلا دیا ہے۔“ ساون پر واقعی مجنونانہ جنون طاری تھا۔

”لڑکے ہوش کرو..... یہ لڑکی..... اپنی یادداشت کھو چکی ہے..... تم ہمارے ساتھ چلو..... ہم خود اس کے وارثوں کی تلاش میں تھے..... اچھا ہوا تم ہمیں مل گئے.....“ اس بار اختر بانو نے قدرے ملائمت بھرے لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا..... تب کہیں جا کر ساون کے دل کو ایک جھکسا لگا اور وہ کچھ سوچتی اور کچھ الجھی ہوئی نظروں سے اختر بانو کی طرف تیکنے لگا۔

اختر بانو ایک سمجھدار خاتون تھی اسے ساون کی ذہنی کیفیت کا بہ خوبی اندازہ ہو رہا تھا

لہذا وہ ساون سے پھر مخاطب ہوئی..... ”دیکھو لڑکے..... تم ہمارے ساتھ چلو..... ہمارے گھر تمہیں ساری بات کا پتہ چل جائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے اختر بانو نے حیران پریشان ساون کو کارکی اگلی سیٹ والا دروازہ کھول کر بٹھایا اور خود گھوم کر دوسری جانب..... ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھی..... پھر چند لمحوں بعد کار آگے بڑھ گئی..... سارے راستے عجیب سی خاموشی طاری رہی..... یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ بولنا قبل از وقت ہو..... لہذا انہوں نے بنگلے تک کا سفر انتہائی خاموشی کے ساتھ کاٹا..... بنگلے کے اندرونی حصے تک آتے ہوئے ساون کی دلی اور دماغی کیفیت تعجب ہو رہی تھی..... اس عرصے میں وہ اللہ رکھی کے معصوم چہرے کی طرف ہی تکتا رہا تھا کہ شاید وہ ایک شناسا جج کے ساتھ اس سے لپٹ جائے..... اور اس سے کہہ دے کہ ”ساون! تم کہاں کھو گئے تھے.....؟“ میری نگاہیں تو تمہیں دیکھنے کو کب سے ترسی ہوئی تھیں۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اللہ رکھی تو بلکہ الٹا ساون سے ڈری سہی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر شناسائی کی رمت تک نہ آئی تھی..... پھر وہ سب ایک بڑی سی پیراستہ نشست گاہ میں آکر بیٹھ گئے..... ساون اس شہری طرز کے ماحول میں خود کو عجیب سا محسوس کر رہا تھا..... روزینہ اللہ رکھی کو دوسرے کمرے میں چھوڑ کر اب اپنی ماں اختر بیگم کے ساتھ فیملی سائز کے صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور خاصی پُرشوق نگاہوں سے ساون کی جانب تکتے جا رہی تھی..... اس کا شوخ ذہن خود بہ خود ایک معصوم گرد لپچپ ٹریبیڈی کی توقع کئے بیٹھا تھا۔

”ہاں..... بیٹے!..... اب بتاؤ..... کہ یہ لڑکی جسے تم اللہ رکھی کے نام سے پکار رہے تھے کون ہے..... اور تم اسے کیسے جانتے ہو.....؟“ بالآخر اختر بیگم نے ساون سے نرم اور دھیمے لہجے میں استفسار کرنے کی ابتداء کی..... اس دوران ایک ملازمہ بیش قیمت صوفوں کے بچ رکھی شیشے کی ٹاپ والی لمبی اور مستطیل ٹیبل پر خورد و نوش کی کچھ اشیاء سرو کر کے چلی گئی..... ساون نے اختر بیگم کی بات سن کر لمحہ بھر کسی سوچ میں غلطاں رہنے کے بعد..... انہیں محض اس حد تک اللہ رکھی سے متعلق تفصیل بتائی کہ..... وہ چاچی عنایتاں کو بہ غرض علاج شہر کے ہسپتال داخل کرانے کے لیے گوٹھ سے یہاں لائے تھے..... ادھر وہ یعنی ساون کچھ دوائیاں لینے شہر کی طرف نکل گیا اور جب لوٹا تو اللہ رکھی کو وہاں نہ پا کر اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ مزید یہ کہ اس عرصے میں چاچی عنایتاں کا بھی انتقال ہو چکا تھا اور اس کی لاش ابھی تک ہسپتال میں موجود تھی..... دونوں ماں بیٹیوں کو ساون کی دکھ بھری کہانی جان کر خاصا رنج ہوا..... بہر طور پھر بعد میں انہوں نے بھی ساون کو یہ بتایا کہ کس

پکڑنے کا تھا۔

☆=====☆=====☆

مائی رحمت کی گردن خانو دھچر نے سختی سے دبوچ رکھی تھی..... اور اس بے چاری کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں سی نکل رہی تھیں..... اور وہ بری طرح خود کو خانو دھچر کے شکنجے سے چھڑانے کی ناکام سعی بھی کئے جا رہی تھی..... اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر کو ابل رہی تھیں۔ ”بتا حرام زادی..... کہاں بھگا گیا ہے تُو نے اس چھو کر رکھی کو.....“ خانو دھچر خونخوار نظروں سے جاں بلب مائی رحمت کو گھورتے ہوئے غرایا..... وہ غصے سے آگ بگولا ہو رہا تھا۔ قریب ہی منشی میرل بھی کھڑا تھا..... وہ خاصا متفکر اور پریشان نظر آ رہا تھا..... اللہ رکھی کے فرار نے اسے پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا..... تاہم خانو دھچر کی طرح اسے بھی مائی رحمت پر پورا شبہ تھا کہ اللہ رکھی کو فرار کرانے میں اس کا پورا پورا ہاتھ تھا..... مگر جب اس نے دیکھا کہ خانو دھچر..... اس کی جان لینے پر تیار ہوا ہے تو وہ اسے بولا۔

”خانو..... ہت ذرا ہولا رکھ..... کہیں یہ کیمنی مر ہی نہ جائے.....“

”میں اسے مار کر ہی دم لوں گا..... منشی سائیں..... اس کیمنی نے ہماری پیٹھ پہ خنجر گھونپا ہے.....“ خانو دھچر غیظ آلود لہجے میں بولا..... مخاطب منشی میرل ہی تھا۔

”اڑے بابا..... اتنا کافی ہے..... اس کیمنی کے لیے..... اب چھوڑ اسے..... کچھ بتانے تو دے اسے.....“ منشی میرل نے خانو دھچر کو متنبہ کیا تو خانو نے ایک جھٹکے سے مائی رحمت کی گردن چھوڑ دی..... وہ بے چاری نڈھال سی ہو کر کئی قدم پیچھے کو لڑکھڑا گئی..... وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن کی انٹھن کو سہلانے لگی..... اس کی آنکھوں میں خوف اور برہمی کی عجیب سی ملی جلی آمیزش تھی۔

”بتا..... اب..... ورنہ اس بارتری گردن دبوچ کر ہی دم لوں گا.....“ خانو دھچر دوبارہ اسے دھمکاتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر اتر ہوا تھا اور حالت اس کی اس کتے جیسی ہو رہی تھی جو اپنے ہی زخموں پر خارش زدہ ہو رہا ہوتا ہے..... ”بتاتی کیوں نہیں حرام زادی..... کیا پھر تیری گردن پکڑوں.....“ خانو پھر اس کی جانب بڑھا تو مائی رحمت زور سے ہڈیانی انداز میں چلاتے ہوئے بولی۔

”مجھے نہیں معلوم..... میں بے قصور ہوں..... میں نے اللہ رکھی کو نہیں بھگایا.....“ اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ خانو دھچر پھر آپے سے باہر ہونے لگا اور بڑے جا جانہ انداز میں ایک بار پھر اسے دبوچنے کے لیے اس کی طرف بڑھا۔

طرح..... ایک سرد اور ٹھنڈی ہوئی اندھیری رات میں اللہ رکھی انہیں زمین پر بے ہوش اور زخمی پڑی ہوئی ملی تھی..... جس کی بعد میں یادداشت جاتی رہی تھی..... انہوں نے ساون کو اس بات کی بھی تسلی دی کہ اللہ رکھی کا ایک مشہور ماہر دماغی امراض سے علاج چل رہا ہے۔ جس نے اللہ رکھی کی اچانک یادداشت چلی جانے سے متعلق اچھی توقعات رکھنے کی خوش کن خبر دی ہے..... لہذا..... یہ سب باتیں ساون کو بتانے کے بعد اختر بانو جو فطرنا ایک نیک دل خاتون تھیں..... ساون سے گزارش کے طور پر اس نے یہ بھی کہا کہ..... اگر اس کو اعتراض نہ ہو تو اللہ رکھی کو کچھ عرصے تک اس کے پاس ہی رکھا جائے تاکہ اس کا علاج مکمل اور صحیح طور پر جاری رہ سکے۔

”ساون بیٹا!..... تم بے فکر رہو..... اللہ رکھی میرے پاس بیٹیوں کی طرح رہے گی.....“ اختر بانو نے آخر میں نرم لہجے میں ساون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور..... میں نے اسے اپنی بہن اور سہیلی بھی بنا لیا ہے..... میری اور کوئی بہن جو نہیں.....“ روزینہ نے بھی اپنے حصے کا قلمہ دینا ضروری سمجھا..... اور ساون ان دونوں ماں بیٹیوں کی بات بہ غور سننے کے بعد سوچنے لگا کہ..... یہ لوگ درست ہی کہہ رہے تھے..... ساون کو اللہ رکھی کی اس اچانک پلٹنے والی ذہنی رو پر بہت زیادہ رنج ہوا تھا..... اسے اس بات پر حیرت اور خاصی پریشانی بھی ہوئی تھی کہ اللہ رکھی ہسپتال سے نکل کر..... آخر اس علاقے میں کس طرح پہنچی تھی یا لائی گئی تھی..... جو بعد میں ان شریف لوگوں کو اندھیری ٹھنڈی رات میں زخمی حالت میں ملی تھی..... ویسے اختر بانو نے ساون کو اللہ رکھی سے متعلق ”تسلی بخش“ گفتگو گوش گزار کر دی تھی..... اب ساون یہی سوچ رہا تھا کہ اللہ رکھی کو اگر وہ اپنے ساتھ دوبارہ گھٹھ لے جانا بھی چاہے تو وہ ہرگز اس کے ساتھ جانے پر تیار یا راضی نہ ہو گی..... کیونکہ وہ (ساون) اب اس کے لیے اچھی تھا..... اللہ رکھی کی یادداشت محو ہوتے ہی..... ساون کی شبیہ بھی اس کے ذہن سے دھندلا چکی تھی اور اب وہ ان لوگوں کو ہی اپنا ہمدرد تصور کرنے لگی تھی..... لہذا ساون اللہ رکھی کو وہاں رکھنے پر معترض نہیں ہوا..... ویسے اختر بانو اور ان کی بیٹی روزینہ اسے شریف اور خدا ترس انسان محسوس ہوئے تھے..... ورنہ کون آج کل ایک پرانی لڑکی کے ساتھ اتنی بے لوث و بے غرض ہمدردی کرتا ہے..... بالآخر ساون نے اللہ رکھی کو..... جب تک اس کا علاج چلتا ہے..... انہی کے پاس ہی رہنے دینے کی ہامی بھر لی..... وہ دونوں ماں بیٹیاں ساون کے فیصلے پر کھل سی گئیں..... قصہ کوتاہ..... ساون وہاں سے لوث آیا..... اب اس کا ارادہ اپنے گھٹھ داد پور کی لاری

طویل عرصے تک ایم پی اے رہے تھے۔ محمد ایوب سومرو ان کا نام تھا اور وہ انٹریئر سندھ کے ایک معروف سیاستدان کہلاتے تھے۔ بہر طور..... ایسے ہی حالات دیگرگوں نے روزینہ کے چہرے پر بلکہ اس کی پوری شخصیت کے ایک عجیب اور ناقابل بیان سی مہر سکوت ثبت کر کے رکھ دی تھی۔ لیکن اب بھولی بھالی بالکل گڑیاسی اللہ رکھی کی صورت میں اسے گویا ایک کھلونا مل گیا تھا..... جس کے معصوم چہرے پر اسے بیک وقت بہن اور سہیلی کا بھی عکس نظر آتا محسوس ہوتا تھا..... اب تک وہ یہی سمجھتی آئی تھی کہ اللہ رکھی دنیا میں اکیلی ہے..... لیکن ساون کے اچانک منظر عام پر آنے سے وہ کچھ اداس سی ہو گئی تھی..... لیکن یہ بات بھی اسے معلوم ہی تھی کہ جب تک اللہ رکھی کی یادداشت لوٹ کر نہیں آتی..... وہ اسی کے پاس رہنے پر مجبور تھی..... مگر اس کے ساتھ ساتھ نازک اندام روزینہ..... ساون کی بتائی ہوئی باتوں کے ایک اہم پہلو کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اس کے نازک اور خفہ جذبات میں حسرت انگیز چٹکیاں لے رہا تھا..... وہ نازک پہلو ساون اور اللہ رکھی کے بیچ پنپنے والا ایک جذبہ تعلق خاطر کا تھا..... جس نے روزینہ کے خانہ دل کے نرم گوشوں کو جھنجھوڑ ڈالا تھا..... وہ اللہ رکھی اور ساون کو اپنے معیار دل کے مطابق خوش قسمت تصور کر رہی تھی کہ وہ دونوں کسی حد تک ایک دوسرے کو چاہتے ہیں..... یقیناً جتنا ساون اللہ رکھی کو چاہتا تھا، اتنا ہی اللہ رکھی بھی اسے چاہتی ہوگی..... یہی تو ساون دیوانوں کی طرح اللہ رکھی کو اس بھرے پڑے اجنبی شہر میں ڈھونڈتا پھر رہا تھا تاہم روزینہ کو اس انوکھی ٹریجڈی پر افسوس بھی ہو رہا تھا کہ اللہ رکھی..... اب اپنے محبوب ساون کو پہچاننے سے قاصر ہو چکی تھی..... اسے ان کی معصوم سی کہانی دلچسپ بھی محسوس ہو رہی تھی..... جو اس کے لیے ایک اعلیٰ نصاب کا درجہ رکھتی تھی..... ایک درس وفا کا درجہ..... پھر پتہ نہیں کیوں روزینہ کو سیدھا سادہ دیہاتی سا نوجوان اچھا محسوس ہونے لگا اور معاً ہی ایک خیال نے جیسے اس کے من میں چٹکی سی بھری اور اس کا صبح چہرہ یکدم سرخ ہو گیا۔

☆=====☆=====☆

علی بخش ضنانت پر کیا رہا ہو کر آیا کہ اس کی سوتیلی ماں خیراں اور اس کے دونوں چہیتے بھائی دوست محمد اور محمد علی، بیٹا محرم سمیت سب کو جیسے سانپ سونگھ کر رہ گیا..... وہ علی بخش کو ایسی عجیب عجیب سی نظروں سے تنکے لگے تھے جیسے وہ کسی اور سیارے کی مخلوق ہو..... جبکہ علی بخش ان کی اس میت کڈائی سے محظوظ ہو رہا تھا اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے ایک بار پھر ان سب سانپوں کا زہر نکال دیا ہو..... اور اب وہ محض خالی پھنکاراں

”ظہر..... خانو..... چھوڑ دو اسے کوئی فائدہ نہیں اس کا.....“ منشی میرل، خانو کی خونخوار آنکھوں میں خطرناک عزائم کو بھانپتے ہوئے بہ آواز بلند اسے مخاطب کر کے بولا..... خانو دھچکے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے تھے۔ ”جا..... ڈی..... توں..... اندر دفع ہو۔“ منشی میرل نے جیسے مائی رحمت کی گلو خلاصی کروائی اور ڈری سہی مائی رحمت کے لیے منشی میرل کی جھڑکی جیسے پروانہ راہداری ثابت ہوئی اور وہ فوراً وہاں سے کھسک گئی۔

”منشی سائیں! یہ کیا کیا تم نے..... اسے یونہی جانے دیا.....“ خانو دھچکے لہجے میں شکایت تھی۔

”اڑے بابا؟..... کیا فائدہ..... اس کا..... اگر بتا بھی دیا تو..... بھلا پھر بھی اسے یہ تو معلوم نہیں ہو گا نا..... کہ اللہ رکھی اس وقت کہاں ہوگی..... ویسے مجھے لگتا ہے..... یہ بے قصور ہی ہے.....“ منشی میرل نے گویا خانو دھچکے کا غصہ سرد کرنے غرض سے کہا..... لیکن خانو دھچکے کے غصے میں پھولے ہوئے چپک زدہ سیاہ رو..... چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ منشی میرل کی بات سے مطمئن نہ تھا۔ شاید منشی میرل بھی یہ تاثر تاڑ گیا تھا لہذا بولا۔ ”اڑے خانو..... اب آگے کی سوچ کیا کیا جائے..... میں تو کہتا ہوں کہ اسے خود ہی شہر میں تلاش کرنا چاہئے یہ کوئی اتنا بڑا شہر بھی نہیں..... آخر کو اللہ رکھی جوان اور خوبصورت چھو کر رہے کہیں نہ کہیں سے اس کا سراغ ضرور مل جائے گا.....“

”سائیں! آدمی تو میں نے دوڑا ہی دیئے ہیں..... ویسے تمہاری بات بھی درست ہے..... ہمیں خود بھی اپنے طور پر اس چھو کر کی تلاش میں نکلنا چاہئے..... مجھے لگتا ہے وہ ہمیں مل جائے گی.....“ خانو دھچکے بالآخر منشی میرل کی بات سے متفق ہوتے ہوئے بولا.....

”اچھا خاصا پھل جھولی میں آگرا تھا.....“ وہ آخر میں بڑبڑایا..... اس کے لہجے میں پچھتاوے کی جھلک تھی۔

☆=====☆=====☆

یہ حقیقت تھی کہ روزینہ نے اللہ رکھی کو ایک بہن اور سہیلی کی طرح رکھا ہوا تھا..... نرم و نازک اور معصوم گڑیا جیسا حسن رکھنے والی اللہ رکھی..... اسے بالکل گڑیا کی طرح لگتی تھی۔ درحقیقت روزینہ بچپن سے ہی ایک تنہائی سی محسوس کرتی آئی تھی جس میں سر فہرست باپ کا خلا تھا اور بعد میں بہن اور بھائی کا..... ایک ماں اختر بانو ہی تھی جس کے سہارے اس کی شخصیت سنبھلی ہوئی تھی ورنہ تو وہ بالکل شخصی لحاظ سے ٹوٹ کر بکھر چکی ہوتی۔ اس کے والد کو اس کے بچپن میں ہی کسی نامعلوم قاتل نے سیاسی مخاصمت کی بناء پر ہلاک کر ڈالا تھا۔ وہ

اس نے اسی وقت شہر جا کر..... اللہ رکھی اور ساون کو تلاش کرنے کی ٹھانی..... مگر پھر اچانک یوں ہوا کہ جس طرح ساون کے اچانک گوٹھ سے اللہ رکھی سمیت غائب ہونے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی..... اسی طرح اب اس کی اچانک پراسرار واپسی کی خبر بھی پھیلی چلی گئی..... مگر اس بار ساون کی واپسی سے متعلق ایک سنسنی خیز، پہلو یہ وابستہ تھا کہ اس کے ہمراہ اللہ رکھی نہ تھی..... حالانکہ اس کے اور اللہ رکھی کے درمیان معاشرے کا قصہ گوٹھ کے ہر شخص کی زبان پر عام ہو چکا تھا..... علی بخش نے جو یہ سنا تو اس نے اسی وقت اپنے جسم پر اجرک اوڑھی کلبھاڑی کا ندھے پر نکائی..... اور ساون کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

علی بخش کو ساون راستے ہی میں مل گیا تھا۔ اس وقت مطلع صاف تھا مگر ہلکی ہلکی سرد فضا سے پتہ لگ رہا تھا کہ آج غضب کا جاڑا ترے گا..... ساون نے موٹی سی چادر اوڑھ رکھی تھی اور سر پر شیشوں کے کام والی سرخ ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ ان کے بائیں پہلو پر تل اور منگ کے کھیت پھیلے ہوئے تھے جبکہ دائیں جانب کچے مکانوں کی بے ترتیب قطاریں تھیں..... اطراف کا ماحول خاصا دیران تھا۔

وہ دونوں اچانک ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھنک سے گئے تھے دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ علی بخش کی آنکھوں میں معاندانہ چمک لہریں مار رہی تھی جبکہ ساون عجیب اور الجھی ہوئی نظروں سے اس کی جانب تنکے لگا..... وہ شاید علی بخش کی آنکھوں سے کچھ بھانپنے کی سعی کر رہا تھا۔

”ساون! اللہ رکھی کہاں ہے؟“..... بالآخر علی بخش نے اپنی برماتی ہوئی نظریں ساون کے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔ ساون ایک لمحے کو اس کی بات پر چونکا لیکن پھر اسے تعجب ہوا کہ آخر علی بخش اللہ رکھی کے بارے میں کیوں استفسار کر رہا ہے۔ اسے کیا دلچسپی ہے۔ ساون چونکہ اس بات سے بے خبر تھا کہ علی بخش اپنے باپ دودا خان کے مرنے کے بعد اللہ رکھی کے گھر آیا تھا اور چاچی عنایتاں کو منسوب کیا تھا کہ وہ اللہ رکھی کی شادی اب گوٹھ سے باہر کرے..... کیونکہ وہ اس کا باپ کی منگ تھی۔ اللہ رکھی نے ساون کو اس بات سے بے خبر رکھنا ہی مناسب سمجھا تھا تا کہ ساون اور علی بخش کے درمیان کسی قسم کا فساد نہ پھیلے، بہر حال اس بات کو ظاہر تو ہونا ہی تھا سو آج یہ ظاہر ہو گئی۔ جب علی بخش نے جارحانہ انداز میں اس کا راستہ روکتے ہوئے اللہ رکھی کے بارے میں اس سے استفسار کیا تو ساون کا متعجب ہونا ایک فطری امر تھا۔

”میں..... سمجھا نہیں علی بخش کہ تو اللہ رکھی کے بارے میں مجھ سے اس طرح کا سوال کیوں کر رہا ہے۔“ بالآخر ساون نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرسراتے لہجے

مارنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ علی بخش اب خود کو ان لوگوں کے ساتھ قوی تر اور طاقت ور محسوس کرنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب ہونٹل سے لے کر گھرنیک اکڑتا پھر رہا تھا..... تاہم اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ اسے گرفتار کرانے میں انہی لوگوں کا ہاتھ تھا مگر علی بخش..... اکودھا ٹیل کی ہدایت کے مطابق ان پر یہ ابھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ یعنی علی بخش ان کی سازش کا شکار ہو کر حوالات جا پھنچا تھا کیونکہ اکودھا ٹیل نے علی بخش کو اس بات کی تسلی دی تھی کہ..... اس کی ضمانت ہوتے ہی وہ خود بھی زیادہ عرصے حوالات میں نہیں رہ سکتا..... جب وہ باہر آئے گا تو اس بار اس کی سوتیلی ماں خیراں اس کے دونوں بھائیوں اور بیٹے کو ایسا سبق سکھائیں گے کہ وہ ساری زندگی..... یاد رکھیں گے..... پھر بھی اکودھا ٹیل نے اسے چونکارنے کی تاکید کی تھی..... یہی وجہ تھی کہ جب علی بخش رہا ہو کر پہلی بار گھر آیا تو اس کی ماں خیراں نے چہرے پر بظاہر دنیا جہان کی متاؤں کا بہروپ بھرتے ہوئے رسماً اس کی بلائیں لینی چاہیں تو علی بخش نے نفرت اور نخوت سے اس کا ہاتھ پرے جھٹک دیا تھا..... اور یہی سلوک اس نے اپنے دونوں سوتیلے ماموں اور بھائی محرم علی سے بھی کیا تھا جو اسے جیل سے رہا ہوتا دیکھ کر محض رسوا اور خود کو اس کا خیر خواہ ظاہر کرتے ہوئے اسے مبارکباد دے رہے تھے..... علی بخش اب انہیں ایسی تیز نظروں سے گھورتا تھا جیسے موقع ملتے ہی وہ انہیں چیر پھاڑ دے گا..... بہر طور اب علی بخش واقعی اپنا ایک طاقت ور اثران کے سازشی دماغوں پر قائم کر چکا تھا۔

علی بخش کو ایک دن اچانک اللہ رکھی کا خیال آیا..... تب اس نے سوچا کہ ابھی تو ایک اور حساب بھی چمکتا کرنا ہے..... اور وہ تھا اپنے مرحوم باپ دودا خان کی حج اللہ رکھی کو اس گوٹھ کے کسی شخص سے نہ بیا ہے گا..... اور وہ اس سلسلے میں کئی روز پہلے..... بہ زور دھمکی..... اس کی چاچی عنایتاں کے کانوں میں یہ چتونی ڈال آیا تھا کہ..... وہ اپنی بھتیجی اللہ رکھی کو گوٹھ سے باہر بیا ہے..... ورنہ..... اور اس ورنہ کے بعد علی بخش لوٹ آیا تھا..... اب اللہ رکھی کا خیال آتے ہی..... اس کی نظروں کے سامنے ساون کا بھی چہرہ گھوم گیا..... اور تب اس کا دل و دماغ جاہلانہ غیظ و غضب کی آگ میں سلگنے لگا..... ”ساون..... میرے جیتے جی تو اللہ رکھی سے شادی نہیں کر سکتا..... اس لیے کہ وہ میرے باپ کی حج..... اور میرے لیے ہونے والی ماں کا درجہ رکھتی تھی.....“ وہ غصے سے دانت اپنے بھیجنے کر بڑبڑایا..... اسی دوران جب اس کے کانوں میں انواہ بھی پڑی کہ..... ساون اللہ رکھی، چاچی عنایتاں سمیت کافی روز سے ایک ساتھ ہی پراسرار طور پر غائب ہیں تو وہ آگ بگولا سا ہو گیا.....

ساتھ..... تجھے میری بات کا یقین نہیں تو جا اپنے ماٹریلے (سوتیلے) بھائی محرم علی کی ماں سے پوچھ جو چاچی عنایتاں سے روپے لے کر کھا گئی ہے..... اور تجھے بتایا تک نہیں.....“ ساون کی اس بات نے علی بخش کو متردداور قدرے خفیف سا کر دیا..... یہ حقیقت تھی کہ اسے خیراں نے رقم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جو اللہ رکھی کی چاچی عنایتاں، دودا خان کے مرنے کے بعد اسے لوٹا گئی تھی۔

کئی لمحے تو علی بخش کے چڑھے ہوئے تیوروں پر بل پڑے رہے پھر دھیرے دھیرے وہاں طیش کی جگہ سوچ کی لکیریں نمودار ہوتی چلی گئیں۔ اس وقت اس کی درشت نظروں کے سامنے ساون کی بجائے اپنی لالچی سوتیلی ماں خیراں کا چہرہ محو گردش ہو گیا..... اس نے اپنے دانت بھیج لئے۔

ساون ذرا دیر اسے گوگو میں مبتلا دیکھتا رہا پھر اسے اسی حالت میں چھوڑ کر اپنے قدم آگے بڑھائے تو اس کی سماعت سے دوبارہ علی بخش کی گونجدار آواز نکلرائی..... ”ٹھہرو ساون! میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی۔“

ساون کے بڑھتے قدم رک گئے..... مگر ساتھ ہی اسے اپنا دماغ گرم ہوتا محسوس ہوا..... اس نے پُر تیش نظریں علی بخش کے چہرے پر گاڑ دیں..... جس میں دعوت جنگ کے تاثرات نمایاں تھے جبکہ علی بخش اس کے اس انداز سے مرعوب ہوئے بغیر سخت لہجے میں مخاطب ہوا..... ”کچھ بھی ہو..... میں نے تجھ سے جو کہنا تھا سو کہہ دیا ہے..... آئندہ محتاط رہنا..... ورنہ.....“ علی بخش دانستہ اپنا فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے آگے بڑھنے لگا اور جب وہ مثل آتش فشاں سلگتے ہوئے ساون کے قریب سے گزرنے لگا..... تو اچانک ساون نے اس کا راستہ روک لیا اور قہر بار نظروں سے علی بخش کو گھورتے ہوئے بولا۔

”علی بخش!..... بالکل اسی طرح تیرا باپ دودا خان..... بھی مجھے اللہ رکھی کے راستے سے ہٹ جانے کا کہتا تھا..... مگر وہ یہ حسرت لئے اس دنیا سے سدھار گیا..... اب تم بھی وہی غلطی کر رہے ہو۔“ یہ کہہ کر ساون آگے بڑھ گیا..... تو اسے اپنے عقب سے علی بخش کی چنگھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”ساون! میں کل تک تجھے موقع دے رہا ہوں اگر کل تک اللہ رکھی گوٹھ نہ پہنچی تو میں تجھے اس کے ساتھ ”کارو“ کر کے مار ڈالوں گا.....“ ساون اس کی دھمکی کو سنی اُن سنی کر کے آگے بڑھتا رہا۔

میں کہا تو علی بخش کی تیوری پر پڑے ہوئے بل مزید گہرے ہوتے چلے گئے۔

”ساون! یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ میں پوچھتا ہوں اللہ رکھی کہاں؟“ علی بخش نے دوبارہ درشت اور بلند لہجے میں کہا تو ساون کو بھی غصہ آ گیا وہ چند قدم اور آگے بڑھتے ہوئے جواباً غیظ آلود لہجے میں بولا۔

”تو پھر میرے بھی یہ سوال کا جواب نہیں کہ تو اللہ رکھی کے بارے میں مجھ سے ایسا سوال کیوں پوچھ رہا ہے۔“

علی بخش کی آنکھوں میں درشتگی اور گہری ہو گئی..... ساون نے بھی بدستور اپنی تیز نگاہیں علی بخش کے چہرے پر گاڑے رکھی تھیں۔ علی بخش کا ہاتھ اپنی کپھاڑی کی جانب ریٹگنے لگا تو ساون کی آنکھوں میں یکا یک تعجب در آیا اسی لمحے علی بخش نے گویا آخری بار ساون سے کھر کھراتے لہجے میں کہا۔ ”تو جانتا ہے اچھی طرح سے کہ اللہ رکھی میرے باپ دودا خان کی منگ تھی..... لہذا اب وہ کسی بھی صورت میں گوٹھ پر کسی دوسرے شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی، نہ ہی شادی کر سکتی ہے۔ یہ ہمارے رواج کی بات ہے..... بابا..... اس لیے میں تجھے خبردار کرتا ہوں کہ اب اللہ رکھی سے شادی کا خیال بھی تو اپنے دل میں نہ لانا۔“ علی بخش کی صراحت بھری گفتگو نے ایک ایسی ساون کے دل و دماغ کو جھوڑ ڈالا۔

لمحہ بھر توقف کے بعد وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔ ”علی بخش! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جو کہانی تم نے مجھے اپنے باپ کے متعلق سنائی ہے اس میں کتنی صداقت ہے۔ تمہارے باپ کا تعلق محض ایک طرفہ پسند کی حد تک تھا..... کوئی باقاعدہ منگنی وغیرہ کی رسم نہیں ہوئی تھی۔“

”میرے باپ نے اللہ رکھی کے سنگ کے سلسلے میں اس کے چاچا سوڈھل کو ایک خاص رقم ادا کی تھی، اس سے بڑھ کر اور کون سی رسم ہو سکتی ہے۔“ علی بخش اسے گھورتے ہوئے بولا۔

ساون بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر استہزایہ لہجے میں بولا۔ ”چاچا سوڈھل کو تو اللہ جنت نصیب کرے..... اس نے مجھ سے بھی پچاس ہزار لئے تھے..... اسی سلسلے میں لیکن سوڈھل کے قتل کے بعد اس کی بیوی عنایتاں نے وہ روپے تمہاری ماں کو فوراً لوٹا دیئے تھے۔“

”بکواس کرتا بیٹو.....“ علی بخش غصے سے دھاڑا..... تو ساون بھی ہتھے سے اکھڑ گیا اور اسی لہجے میں بولا۔

”میں اس لہجے کا عادی نہیں ہوں علی بخش..... زبان سنبھال کر بات کر میرے



”ہونہہ..... تو نہیں سمجھا.....“ وڈیرے کے لہجے میں استہزائیہ غراہٹ تھی..... اور آنکھوں میں انتہا درجے کی برہمی۔ ساون نے وڈیرے کے درشت چہرے سے اپنی نگاہیں نہیں ہٹائی تھیں۔

”دودن شہر کی ہوا لگ گئی ہے تو بہت چالاکی آگئی ہے تیرے کو چھو کر..... میں اللہ رکھی کی بات کر رہا ہوں..... جسے تو شہر بچ آیا ہے.....“ وڈیرا گرج دار لہجے میں بولا۔

ساون کے وجود میں ان لفظوں نے جیسے آگ سی بھردی..... کسی اور نے اگر یہ توہین آمیز الفاظ نکالے ہوتے تو ساون اب تک اس کا منہ توڑ چکا ہوتا..... تاہم وہ اپنی آنکھوں میں ابھرنے والی برہمی اور لہجے میں در آنے والی کاٹ کو چھپانہ سکا..... ”وڈیرا سائیں!..... آپ نے بغیر تصدیق کے..... مجھ پر ایسا شرمناک الزام لگا دیا..... کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے آپ کے دماغ میں اتنی گندی بات ڈالی ہے۔“

”اڑے چپ کر..... پورا گوٹھ یہ بات کہہ رہا ہے..... خود میرے آدمی شہر جا کر یہ خبر لائے ہیں۔“ وڈیرا اس کی بات سن کر گرج کر بولا۔

”تو پھر سائیں..... آپ کو غلط اطلاع دی گئی ہے..... سچ یہی ہے کہ.....“ پھر ساون نے چاچی عنایتاں کی بیماری اور وفات سے لے کر اللہ رکھی کی محو یادداشت کے بارے میں ساری کھنڈا ہرادی اور یہ بھی گوش گزار کر دیا کہ اللہ رکھی کا ایک دماغ کے ڈاکٹر سے علاج چل رہا ہے اور وہ مختیر اور شریف لوگوں کے درمیان بالکل خوش و خرم رہ رہی ہے۔

وڈیرا لکھ میر خان غور سے اس کی ساری رام کہانی سن رہا..... پھر کئی رنگ اس کے سرخ و سپید مگر جھری دار چہرے پر آ کر گزرتے رہے۔ اس کے بعد وہ ایک لمبی ”ہوں“ خارج کر کے ساون کو بر مانی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے کھر کھراتی آواز میں بولا۔ ”ساون! اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو اس کا ثبوت دو..... اس گھر کا مکمل پتہ مجھے بتاؤ..... میں اپنے طور پر بھی تسلی کرنا چاہتا ہوں.....“

وڈیرے کی بات پر ساون ایک لمحے کو چپ سا ہو گیا..... وڈیرا بغور اسے گھورنے لگا..... پھر اسے خاموش پا کر بولا..... اس بار اس لہجہ قدرے نرم تھا۔ ”دیکھ ساون! اس میں تیرا اپنا بھی بھلا ہے..... جب میری تسلی ہو جائے گی کہ تیری بات درست ہے تو پھر گوٹھ کے لوگوں کی بھی تسلی ہو جائے گی اور ان کے منہ بھی بند ہو جائیں گے..... ورنہ لوگ تیرے کان کھا جائیں گے طعن و تشنیع کر کے..... اس طرح گوٹھ میں فساد پھیلنے کا بھی خدشہ ہے.....“ وڈیرے نے چند ثانیے خاموشی اختیار کی پھر دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ”میں گوٹھ کا وڈیرا ہی

ساون کی گوٹھ واپسی سے متعلق دبی ہوئی چمگیوں پر پھر سے بیدار ہو گئی تھیں، اگرچہ ساون نے گوٹھ کے لوگوں کو ساری حقیقت بلا کم و کاست بتادی تھی کہ چاچی عنایتاں کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی..... اور اسے راتوں رات شہر کے ہسپتال لے جانا پڑا تھا مگر پھر بھی وہ جان بر نہ ہو سکی تھی..... علاوہ ازیں اللہ رکھی ایک حادثے میں اپنی یادداشت کھو چکی ہے اور اس کا شہر میں علاج چل رہا ہے وغیرہ..... کہنے کو تو یہ چند الفاظ تھے..... لیکن گند میں بیٹھنے والی مکھیوں کو ان سیدھے سادے لفظوں میں بھی گند ہی نظر آیا لیکن ساون کو اس کی ذرہ برابر بھی پروا نہ تھی..... کہ لوگ اس کی باتوں کا اعتبار بھی کر رہے ہیں یا نہیں..... وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھا..... مگر اب علی بخش جیسی میزبانی شخصیت نے اسے کسی حد تک الجھا ضرور دیا تھا تاہم وہ اللہ رکھی کے حصول کے سلسلے میں ہر طرح کی رکاوٹوں کو عبور کرنے کا عزم صمیم کر چکا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس کے حوصلوں کے بادبان..... اب تک تند و تیز طوفانی ہواؤں کے سامنے سینہ سپر تھے..... اور سفینہ وفا یونہی بحر الفت میں اپنی منزل محبت کی جانب رواں دواں تھا۔

ابھی ساون، علی بخش کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اسے اوطاق سے وڈیرے لکھ میر کا بلاوا آ گیا..... اس وقت گھر میں اس کا باپ موگو موجود نہ تھا..... البتہ ساون کی ماں اور بہن ہدایتاں بے چاری پریشان سی ہو گئیں۔

”امڑ! تو پریشان نہ ہو..... میں ابھی آ جاؤں گا.....“ اس نے اپنی ماں کو تسلی دی اور اوطاق جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”پٹ! اپڑیں بیو کو ذرا آ جانے دیتا..... میرا مطلب ہے تم دونوں ساتھ چلے جاتے اوطاق تو اچھا تھا.....“ اس کی ماں تفکیر بھرے لہجے میں بولی تو ساون بہ ظاہر بے فکری سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”نہیں امڑ! میں خود اکیلا ہی وڈیرے سائیں سے مل آتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے وہ مجھے کیوں بلارہا ہے۔“ اس کا لہجہ معنی خیز تھا اور پھر وہ اپنی ماں کو حیران پریشان چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

”ہاں..... بابا..... ساون! یہ میں کیساں رہا ہوں.....؟“ اوطاق پہنچتے ہی وڈیرے نے جارحانہ قسم کا سوال داغا..... اس کی آنکھوں میں خاصی درشتگی نظر آرہی تھی۔

ساون وڈیرے کے سوال پر ایک لمحہ کو گڑبڑا سا گیا۔ لہذا مودبانہ انداز میں بولا۔ ”میں سمجھ نہیں سائیں.....؟“

نہیں..... بلکہ مکھ بھی ہوں..... اسی طرح گوٹھ کی بے سہارا عورت یا لڑکی کو تحفظ کی چھت فراہم کرنا میری ذمہ داری ہے.....“

☆=====☆=====☆

وڈیرے کی اوطاق سے نکلنے کے بعد ساون کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے وڈیرے لکھ میر خان کی اوطاق میں اپنی محبوب ہستی اللہ رکھی کی قبر کھود آیا ہے۔ وہ اپنے تئیں اپنے سر سے ایک بوجھ سا ہٹا کر اپنے گھر کی راہ ہولیا تھا۔ جی میں تو اس کے یہ بھی آئی تھی کہ وہ علی بخش کی بھی شکایت وڈیرے سے کر ہی دیتا..... مگر علی بخش اس کو بزدل اور کم ہمت نہ سمجھے اس لئے ساون نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ ویسے بھی وہ علی بخش سے خود ہی اکیلے منٹے کی خواہش رکھتا تھا دل میں..... وڈیرے سے ملاقات کرنے کے بعد ساون کو جانے کیوں اب ایک خوش فہمی سی محسوس ہو رہی تھی..... اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اب اسے اللہ رکھی کے سلسلے میں وڈیرے کی حمایت حاصل ہو گئی ہے، غربت کی چکی میں پسے اور گارے مٹی کی شکستہ چھت تلے رہنے والوں کو جب پختہ حویلی کے دروہام سے ذرا بھی نرم ہوا کے جھونکے، خواہ مصنوعی کیوں نہ ہوں، میسر آ جائیں تو ایسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا فطری امر ہوتا ہے۔ ساون جب گھر پہنچا تو بیٹے کو صحیح سلامت دیکھ کر اس کی ماں اور بہن نے سکھ کا سانس لیا..... ساون کا اب ارادہ فوری شہر جا کر اللہ رکھی کی خیر خبر لینے کا تھا..... لہذا وہ لاڑکانہ جانے کی تیاری باندھنے لگا۔

چہار سو سازشوں بھری سیاہ رات طاری تھی..... خیراں اپنے دونوں بھائیوں اور بیٹے سمیت ایک کمرے میں موجود تھی۔ درمیان میں سلگتے کونکوں سے بھری انگلیٹھی رکھی تھی جس کی حدت سے کوٹھڑی نما کمرے کی محدود فضا قدرے گرم ہو رہی تھی۔ یہ سردیوں کی طویل ترین رات تھی حالانکہ ابھی رات کے نو ہی بجے کا عمل رہا ہوگا..... علی بخش اس وقت ہوٹل میں موجود تھا..... محرم علی اب کم ہی ہوٹل بیٹھنے لگا تھا۔ اس میں ابھی علی بخش کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اب کوئی اس پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتا تھا۔ دراصل علی بخش جب سے ضمانت پر رہا ہو کر آیا تھا یہ چاروں شتو گٹڑے ڈر سے گئے تھے..... مگر اپنی سازشی خو پھر بھی نہیں چھوڑی تھی یہی وجہ تھی کہ اب یہ چاروں شیطان سانپ کی طرح کنڈلی مارے ایک ساتھ اکٹھے بیٹھے علی بخش کے خلاف ایک نئی سازش میں مصروف تھے..... سلگتی ہوئی انگلیٹھی پر سلور کی ایک بڑی چائے والی کیتلی بھی دھری تھی..... وہ چاروں آپس میں سرگوشیوں کے انداز میں باتیں کر رہے تھے اور پیالوں میں چائے بھی اندیلے ہوئے پیتے جارہے تھے..... قریب ہی فرش پر برتنوں کا چھینکا بھی رکھا ہوا تھا۔

سادہ لوح ساون بہ ظاہر چپ تھا مگر دماغ میں اس کے وڈیرے کا ایک ایک لفظ گردش کر رہا تھا اسے وڈیرے کی باتوں میں منفی اور مثبت دونوں ہی پہلو نظر آ رہے تھے اور خود وہ الجھ کر رہ گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آیا وہ وڈیرے کو اختر بانو کے بنگلے کا پتہ بتا دے یا نہیں۔ درحقیقت وہ اس گھناؤنی اور مکروہ سازش سے ہنوز قطعی طور پر ناواقف تھا کہ عیار وڈیرے لکھ میر خان نے اپنے ایک دیرینہ مذموم مقصد کے حصول کی خاطر اپنے ”ڈشکروں“ کو کب سے معصوم اللہ رکھی کے پیچھے بھوکے کتوں کی طرح چھوڑ رکھا ہے اور نہ ہی ساون یہ جانتا تھا کہ وڈیرے کا ایک اہم گماشتہ منشی میرل اپنے وڈے سائیں کی دیرینہ خواہش کو پورا کرنے کی خاطر معصوم اللہ رکھی کے پیچھے لاڑکانہ شہر جا پہنچا تھا اور اللہ رکھی کو بہلا پھسلا کر لکھ میر خان کے پرانے بنگلے میں بھی لے جا چکا تھا اور جہاں سے بعد میں اللہ رکھی خوش قسمتی سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی..... اور اب بھی یقیناً منشی میرل اپنے گماشتوں کے ساتھ اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا..... اگر ساون کو ان سب باتوں کا علم ہوتا تو وہ کبھی بھی وڈیرے کو اللہ رکھی کا پتہ نہ بتاتا..... مگر وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ وڈیرا سچ کہہ رہا ہے اور وہ اس کی اب خاطر خواہ مدد بھی کر سکتا ہے..... لہذا پھر کچھ سوچ کر بالآخر ساون نے وڈیرے کو اختر بانو کے عالیشان بنگلے کا مفصل پتہ سمجھا دیا..... مفصل پتہ معلوم ہونے کے بعد وڈیرے کی آنکھوں میں اچانک شکرے ایسی چمک عود کر آئی تھی اور صحرائی بچکوں کے ڈنک کی طرح اٹھی ہوئی گھٹی مونچھوں تلے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی..... ساون اوطاق سے کب کا جا چکا تھا۔

☆=====☆=====☆

منشی میرل اور خانو دچھر دونوں نادام اور مجرموں کی طرح وڈیرے لکھ میر خان کے آگے سر جھکائے خاموش کھڑے تھے..... ”لعنت ہو تم دونوں پر.....“ معا وڈیرا گر جا..... وہ دونوں پھر بھی خاموش رہے..... وڈیرا پھر غصیلے لہجے میں بولا..... ”تم لوگ اتنے عرصے سے شہر میں جھک مارتے پھر رہے ہو..... جبکہ میں نے اپنی اوطاق میں بیٹھے بیٹھے اس جھوکری اللہ رکھی کا پتہ لگا لیا۔“ وڈیرے کی بات پر دونوں نے اپنے اپنے سر ایک دم اٹھا کر چونکتی ہوئی نظروں سے اس کی جانب دیکھا..... اور پھر وڈیرا انہیں اختر بانو..... کے بنگلے کا پتہ سمجھانے لگا..... اس کے بعد منشی میرل اور خانو دچھر اپنے چند آدمیوں کے ساتھ اسی وقت

لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہی۔

کافی دیر کی خاموشی کے بعد خیراں نے مہر سکوت توڑی..... اور بڑے رसान کے ساتھ دونوں بھائیوں کو مخاطب کرنے کے انداز میں تشکر آمیز لہجے میں بولی۔ ”تم دونوں میری بات کا غلط مطلب نہیں لو..... یہ تمہاری مجھ پر بڑی مہربانی ہے کہ تم نے..... اپنی پوری کوشش کرتے ہوئے ایک بیوہ بہن کا ساتھ دیا..... لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اللہ سائیں کی مہربانی کی وجہ سے ابھی ایسا برا وقت بھی نہیں آیا ہے مجھ پر..... کہ ہم اتنا پریشان ہو جائیں.....“ وہ لمحہ بھر کی پھر بولی۔ ”میں شروع ہی سے اس بات کی مخالفت کرتی رہی ہوں کہ علی بخش کو جان سے مارنے والی کسی سازش میں تمہارا ساتھ نہ دوں گی اور نہ ہی یہ ہونے دوں گی.....“ خیراں نے اپنی بات مکمل کی تو اس کے چہرے پر ایک نئے عزم کی چٹکتی کھنڈ آئی تھی۔

اس کے دونوں بھائی ایک دوسرے کا منہ ٹکٹنے لگے..... تاہم دوست محمد نے اس بار نرم رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا..... ”لیکن ادی!..... تجھے تیرا حق تو ملنا چاہئے.....“ ”میرا حق کوئی مجھ سے نہیں چھین رہا۔“ خیراں نے متانت سے جواباً کہا۔ ”لیکن ادی! علی بخش..... تو تیرے حق پر سانپ بنا ہوا ہے..... آخر کو اسے گھر اور ہوٹل پہنچنے پر کیوں اعتراض ہو رہا ہے.....“ اس کے دوسرے بھائی محمد علی نے لقمہ دیا اور مزید خبردار کرتے ہوئے اضافہ کیا..... ”وہ چاہتا ہی یہی ہے کہ..... تو ہمارے ساتھ نہ رہے..... تاکہ وہ یہاں رہ کر تم دونوں کو تمہارے حق سے ایک دن بے داخل کر دے۔“ ”اور وہ کرے گا بھی اسی طرح.....“ دوست محمد بھی اپنے بھائی کی تائید میں فوراً بولا..... مجرم علی نے ابھی تک گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا وہ خاموشی سے باتیں سننے میں مصروف تھا۔ خیراں بولی۔ ”جتنا میرا اور میرے بیٹے..... مجرم علی کا میرے شوہر دودا خان کی جائیداد پر حق ہے اتنا علی بخش کا بھی ہے..... مجھے آج اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ اگر ہم نے علی بخش کے ساتھ ایسی زیادتی کی تو روز حشر مجھے اللہ سائیں اور اپنے شوہر دودا خان کے آگے جواب دہ ہونا پڑے گا..... آخر کو..... علی بخش اس کا بیٹا ہے..... بے شک میں اس کی سوتیلی ماں سہی۔“

”واہ ادی! کیا بات کہی تو نے..... یعنی ملی نوسو چوسے کھا کر حج کو جا رہی ہے..... تو پھر اب تک تم نے ہمارے ساتھ مل کر یہ سارا ڈرامہ کیوں رچایا..... ہمارا بھی وقت برباد کیا۔“ دوست محمد کے لہجے میں اپنی بہن خیراں کے لیے طنز کوٹ کوٹ کر بھر ہوا تھا۔ مگر

”اب تو اس سانپ کا پھین کچلنا ہی پڑے گا.....“ منصوبہ ساز خیراں کے بھائی دوست محمد نے چائے کی آخری چسکی لیتے ہوئے پیالہ فرش پر رکھ کر اپنی بہن سے کہا۔ ”میں تو کہتی ہوں..... اس سارے چکر کو ہی دفع کر دو..... بس ادا، ہم نہیں بیچتے اپنا گھر اور ہوٹل.....“ خیراں قدرے دزدیدہ نظروں سے اپنے بھائی دوست محمد کی جانب دیکھتے ہوئے بولی تو دوست محمد کا منہ حیرت سے کھل سا گیا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہے ادی! ہم تیری اور پٹ محرم علی کی بھلائی کی خاطر اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر یہاں تمہارے ساتھ مل کر اس سانپ علی بخش کا مقابلہ کر رہے ہیں تاکہ تجھے تیرا حق پورا ملے اور تو ہمارے آبائی گوٹھ مد پور ہم لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہ سکے اور اب تو.....“ اس نے ذانتہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا..... انداز ایسا ہی تھا جیسے اسے بہن کی بات پر دلی صدمہ پہنچا ہو۔

خیراں، بھائی کی بات پر ذرا خفیف سی ہونے لگی..... ادھر اس کے دوسرے چھوٹے چہیتے بھائی محمد علی نے بھی بہن کی..... ”نکرو“ کرنا مناسب سمجھا اور بولا..... ”ادی! تو نے آج واقعی ہمارا دل دکھا دیا..... کیا ہم اتنے بزدل ہیں کہ اس علی بخش کا سر بھی نہیں کچل سکتے..... بھادوست محمد صحیح تو کہہ رہا ہے کہ ہم نے اپنے گھر بار چھوڑ رکھے ہیں تاکہ علی بخش سے نمٹ ک ہی دم لیں۔“

محرم علی کے چہرے سے یوں ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے دونوں ماموؤں کی بات سے پوری طرح متفق ہو۔ درحقیقت دوست محمد اور محمد علی دونوں ہی نکھٹو تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کا پیسے والا بہنوئی راہی عدم ہو گیا ہے تو فوراً مکھی کی طرح اپنی بہن خیراں سے چٹ گئے تھے جھوٹے ہمدرد بن کر..... اس سے پہلے انہوں نے مڑ کر بہن کی کبھی خبر تک نہ لی تھی۔ بہانہ نہ آنے کا یہی کرتے تھے کہ بھائی دودا خان کو ہمارا آنا اچھا نہیں لگتا۔ اب ان دونوں کا ارادہ یہی تھا کہ کسی طرح سے بہن کو بہلا پھسلا کر یہاں سے اپنے گوٹھ مد پور لے جائیں..... اور وہ وہاں دونوں بہن اور بھانجے کو ایک کوٹھڑی میں جگہ دیکر خود ان کی دولت پر عیش کریں..... اور انہی پیسوں سے بڑا ہوٹل کھول کر آرام سے زندگی بسر کریں۔ وہ مزدوری سے سخت عاجز آگئے ہوئے تھے اور ایک عرصے تک وڈیروں زمینداروں کی ”رہاکی“ کر کر کے تنگ تھے، لیکن اب جو انہوں نے اپنی سونے کی چڑیا ایسی بہن خیراں کو ہاتھ سے نکلنے محسوس کیا تو فوراً ہی دونوں ناراضگی دکھاتے ہوئے اس پر اپنا احسان جتانے لگے..... خیراں کو اگرچہ اپنے دونوں بھائیوں کی یہ احسان جتانے والی بات بری لگی تھی.....

خیراں نے پھر بھی برا نہیں منایا۔

ادھر محمد علی..... اپنے بھانجے سے طنز آمیز مخاطب ہوا..... ”سن رہے ہونا محرم..... اپڑیں امڑ (ماں) کی باتیں کیا کہہ رہی ہے..... سانپ کو ساری عمر اپنی آستین میں پالے گی یہ..... جو ایک نہ ایک دن تم دونوں کو ڈس کر ہی رہے گا۔“

جو اب محرم عجیب سی خاموشی کے ساتھ اپنی ماں خیراں کا چہرہ تکتے لگا..... ادھر دوست محمد نے ایک اور پیتر بدلا..... اور آخری کوشش کے طور پر بہن کو سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو دادی! تمہیں آخر یہ بات کیوں نہیں سمجھ میں آرہی ہے کہ..... علی بخش تجھے اپنا اور اپنی مرحوم ماں حضوراں بی بی کا قاتل سمجھتا ہے کیونکہ تو اس کی ماں پر سوکن بن کر آئی تھی اور اسی غم میں گھل گھل کر اس کا انتقال ہو گیا۔ اگر بھائی دودا سائیں زندہ ہوتا تو اور بات تھی لیکن اب اس کے مرنے کے بعد تم دونوں اکیلے رہ گئے ہو..... لہذا علی بخش کو اب آسانی سے گل کھلانے کا موقع ملے گا وہ تم دونوں سے انتقام ضرور لے کر رہے گا۔“ دوست محمد اتنا کہہ کر چپ ہو گیا اور اپنی عیارانہ گفتگو کی اثر پذیر خیراں کے چہرے پر بھانپنے کی سعی کرنے لگا لیکن خیراں..... جس کے دل میں اچانک ہی اپنے سوتیلے بیٹے علی بخش کے لیے خوف خدا سما گیا تھا..... بھائی کی اس بات سے متاثر ہوئے بغیر بولی۔

”اگر ایسی بات ہوئی تو..... میرے اس جوان پٹ محرم علی میں اتنی طاقت ہے کہ وہ ہر سازش کا مقابلہ کر سکے.....“ آخری الفاظ اس نے تقاضا آمیز لہجے میں اپنے بیٹے محرم علی کی طرف دیکھتے ہوئے ادا کئے تھے.....

دوست محمد اور محمد علی ایک دوسرے کا منہ تکتے لگے..... پھر وہ اپنی بہن خیراں کے اس اچانک بدلے ہوئے رویے پر اتنے بد دل ہوئے کہ ذرا دیر بھی وہاں نہ رہے اور اسی وقت اٹھ کر باہر چلے گئے۔

محرم علی حیران پریشان اپنی ماں کا چہرہ تکتے لگا۔ اسے خود اپنی ماں کے اچانک بدلے والے رویے پر حیرت ہو رہی تھی..... لہذا وہ ماں سے پوچھنے بنا نہیں رہ سکا..... ”امڑ!..... یہ آج تجھے کیا ہو گیا ہے تو نے مادا دوست محمد اور محمد علی کو کیوں ناراض کر دیا.....؟“

خیراں نے ایک نظر بیٹے کی جانب دیکھا اور پھر جب بولی تو اس کا لہجہ واضح طور پر مرتعش تھا۔ ”پٹ محرم!..... شاید تجھے میری بات پر یقین نہ آئے لیکن یہ سچ ہے کہ ایک رات کو میں نے خواب میں تیرے بیوہ دودا خان کو دیکھا تھا..... اور..... اس کے ساتھ علی بخش کی ماں حضوراں بی بی بیٹھی کھڑی تھی..... وہ بالکل حور پر ہی نظر آرہی تھی..... اس نے زرق برق

لباس پہن رکھا تھا اس کے گرد نور ہی نور پھیلا ہوا تھا.....“ خیراں پر بتاتے ہوئے عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ ”اور..... اور تیرا باپ دودا خان اس کے آگے بچھا جاتا تھا..... جبکہ میری حالت انتہائی خستہ ہو رہی تھی میں پھٹے پرانے بوسیدہ لباس میں ملبوس تھی اور میرے ارد گرد ایسی کھائیاں منہ پھاڑے موجود تھیں جن کے اندر عجیب و غریب بلائیں اور سانپ، بچھو کلبلا رہے تھے..... پھر پتہ ہے کیا ہوا..... حضوراں بی بی نے مجھے دیکھتے ہی دودا خان سے آواز بلند میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا..... دودا خان!..... اس عورت نے میرا حق مارا لیکن میں نے بخش دیا..... لیکن اس نے میرے لخت جگر علی بخش کو بھی نہیں چھوڑا..... یہ میں کبھی برداشت نہیں کر سکتی..... اسے ان خونی کھائیوں میں دھکیل دے دودا خان..... اسے ان خونی کھائیوں میں دھکیل دے.....“

خیراں پر اچانک ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی اور محرم علی یک دم اپنی ماں کو سنبھالنے کے لیے چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا..... اس کی ماں کو غش آرہے تھے..... کہتے ہیں اگر دنیا میں انہو نیاں نہ ہوں تو دنیا ہی نہ ہو..... معجزات اور انہونی کے بغیر انسانی زندگی کچھ نہیں۔ یہاں بھی ایک انہونی وقوع پذیر ہو چکی تھی۔ اس حقیقت کا اب تک کسی کو پتہ نہ چل سکا تھا کہ جانے کب سے کوٹھڑی نما کمرے کے دروازے کے عقب سے علی بخش چپکا کھڑا آج کی اسی انہونی کا حصہ بنا سب کچھ سن رہا تھا۔ کسی کو بھی پتہ نہ چل سکا تھا کہ وہ اچانک کب ہوٹل سے خاموشی کے ساتھ لوٹ آیا تھا..... اسے یوں لگا جیسے ایک اکیلی خود اس کے اندر سے بھی اپنی سوتیلی ماں خیراں اور بھائی محرم کے لیے نفرت کا جذبہ مانند پڑنے لگا ہے..... وہ من ہی من میں ایک دھکنے کی سی کیفیت سے گزر رہا تھا..... پھر وہ اچانک اندر داخل ہو گیا..... اس وقت محرم اپنی ماں کو سنبھالنے میں لگا ہوا تھا..... کہ اچانک علی بخش نے بڑھ کر اپنی سوتیلی ماں خیراں کو سنبھال لیا۔

”امڑ!.....! ہوش میں آ..... تجھے کچھ نہیں ہوگا..... میں ہوں نا..... تیرا پٹ علی..... علی بخش..... تجھے کچھ نہیں ہونے دوں گا..... امڑ..... حوصلہ کر.....“ علی بخش کی آواز میں نمناک رقت سی اتر آئی تھی..... دونوں ماں بیٹوں کے درمیان صدیوں کے فاصلے یوں چٹکی میں سمٹ رہے تھے اور انہونی اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی تھی۔ محرم علی کی آنکھیں بھی اشکِ ندامت سے نمناک ہو رہی تھیں۔

☆=====☆=====☆

وہ دن روزینہ کی سالگرہ کا دن تھا..... سالگرہ اگرچہ دونوں ماں بیٹی سادگی سے مناتی

”جی“ اللہ رکھی نے جوابا کہا۔

”کیا تم واقعی اپنے ساون کو بھول گئی ہو.....؟“ روزینہ نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

اللہ رکھی اس کی بات پر قدرے چونکی اور گردن گھما کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے حیرت سے بولی..... ”نہیں، سہیلی مجھے واقعی یاد نہیں آ رہا کہ..... ساون کون ہے؟“ روزینہ اس کی بات سن کر ذرا دیر کو کسی سوچ میں غلطاں سی ہو گئی..... درحقیقت اسے اللہ رکھی کے دماغی معالج ڈاکٹر احسان احمد کی ہدایت یاد آ رہی تھی..... جس کے پاس اللہ رکھی کو ایک دن چھوڑ کر مشورے کے لیے جایا جاتا تھا جہاں ڈاکٹر احسان احمد..... اپنے خاص چیمبر میں اللہ رکھی کو ”تجشش“ کے ذریعے اس سے محکوم ہوتا..... نیز انہوں نے اختر بانو اور روزینہ کو اللہ رکھی کی یادداشت لوٹانے کی خاطر یہ بھی ہدایات دی تھی کہ وہ دونوں اللہ رکھی کے ساتھ تبادلہ خیال کرتے رہیں اور اس کے ”قریبی“ لوگوں کا بار بار اس کے سامنے ذکر کرتے ہوئے اس سے کچھ نہ کچھ پوچھتے رہیں..... لیکن یہ بد قسمتی ہی تھی کہ ابھی تک روزینہ اور اس کی ماں کو بے چاری اللہ رکھی کا کوئی بھی قریبی عزیز نہیں مل سکا تھا سوائے ساون کے..... جس کی شخصیت ذرا مشکوک تھی..... لیکن اس کی زبانی انہیں معلوم ہو سکا تھا کہ اللہ رکھی کا اب اس دنیا میں کوئی نہیں رہا۔ ایک چاچی عنایتاں تھی اس کا سبھی انتقال ہو چکا تھا۔ جس کی اختر بانو اور روزینہ نے تسلی کی خاطر مقامی سرکاری ہسپتال سے تصدیق بھی کرا لی تھی۔

اب ڈاکٹر احسان احمد کے اس مشورے پر عمل کرنا دونوں ماں بیٹی کو مشکل نظر آ رہا تھا..... کیونکہ ساون کو وہ اللہ رکھی کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں کیونکہ وہ بہر حال اس کے لیے ایک نامحرم شخص تھا..... لیکن روزینہ سمجھتی تھی کہ اللہ رکھی کی کھوئی ہوئی یادداشت کو لوٹانے میں ساون کی شخصیت سو فیصد معاون ثابت ہو سکتی تھی..... کیونکہ ساون اختر بانو اور روزینہ سے اشاروں کنایوں میں اللہ رکھی سے اپنا تعلق ظاہر کر چکا تھا..... مگر اختر بانو کو اب بھی اعتراض تھا لیکن روزینہ کو پورا یقین تھا کہ ساون ہی کے باعث اللہ رکھی کی کھوئی یادداشت لوٹ سکتی ہے..... کیونکہ وہ دونوں بالآخر ایک دوسرے کے لیے بھی یک جان دو قالب رہ چکے تھے۔ لہذا اسی اہم نکتے کو مدنگاہ رکھتے ہوئے روزینہ اکثر اللہ رکھی کے سامنے ساون کا ذکر کرتی رہتی تھی لیکن آج ساون کا ذکر کرتے ہوئے روزینہ کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی..... اور یوں لگ رہا تھا جیسے آج وہ ساون کو اللہ رکھی کی لوح ذہن پر اجاگر کرنے کی کوشش کی بجائے اپنے ذہن بلکہ اپنے دل پر اجاگر کرنا چاہ رہی ہو..... لیکن کیوں.....؟

تھیں لیکن روزینہ اپنی چیدہ چیدہ سہیلیوں کو ضرور مدعو کرتی تھی اور ظاہر ہے دھماچو کڑی بھی خوب مچتی تھی..... کیونکہ وہ سب اس کی ”کلوز فرینڈ“ تھیں اور جی بھر کر ہلا گلا کرتی تھیں..... پورے بنگلے میں صرف روزینہ کا ہی ایک کمرہ اس وقت خوشیوں، قہقہوں اور خوش گپیوں کا مرکز بنا رہا تھا..... اس بار بھی گنتی کی پوری پانچ سہیلیاں اس کے بڑے سے کمرے میں موجود تھیں..... لیکن اس بار انہیں ایک نیا ایڈ ونچر میسر تھا..... پہلے پہل تو روزینہ کی ممی اختر بانو کی موجودگی کی وجہ سے وہ سب اپنی صورتوں پر بلا کی سنجیدگی سجائے بیٹھی رہیں مگر پھر ان کے کمرے سے نکلنے ہی انہوں نے روزینہ سمیت اللہ رکھی کو گھیر لیا..... اللہ رکھی نے اس وقت ثقافتی نمونے کا حامل لباس پہن رکھا تھا جس کا گلا شیشوں والی کڑھائی کر کے اس نے خود ہی بنایا تھا..... پھر اس عرصے میں اللہ رکھی نے اپنی دست کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے روزینہ کے لیے ایسے ایسے نادر نمونے تخلیق کئے تھے جسے دیکھ کر روزینہ دنگ رہ گئی تھی..... ان نادر نمونوں میں..... خوبصورت رنگین رلیاں، کڑھائی کئے ہوئے قمیضوں کے گلے..... پراندے..... رومال اور دسترخوان شامل تھے۔

”واو..... واٹ اے گرلیس.....!“ روزینہ کی ایک چنپل سہیلی کے ہونٹوں سے کلمہ تحسین بلند ہوا۔

”ایسے نایاب نمونے تو ہم نے اونچے اونچے شوکیسوں میں بھی نہیں دیکھے.....“ ایک دوسری نے لقمہ دیا۔

”میں تو یہ سب مال غنیمت کے طور پر سمیٹوں گی“..... تیسری نے گویا اپنے خطرناک ارادوں کو ظاہر کرتے ہوئے کہا اور روزینہ تھی کہ اپنی سہیلی اور بہن اللہ رکھی کی تعریفوں کے ذکر پر فخر سے پھولے نہیں سمار رہی تھی..... ایک چوتھی منچلی لڑکی نے اللہ رکھی کو بھی ایک ملکوٹی حسن کا حامل نادر نمونہ قرار دے دیا، اللہ رکھی اپنی ہمدرد سہیلی روزینہ کی دوستوں کے اپنے بارے میں خوش کن تبصروں پر مسرور ہوئے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ وہ گاہے بہ گاہے ان کے تیکھے شیریں سوالوں کا جواب ملی جلی سندھی اردو میں دینے کی سعی کر رہی تھی۔ بہر طور رات گئے یہ ہنگامہ اختتام پذیر ہوا..... سردی زوروں پر تھی مگر کمرے میں روم ہیٹر کی وجہ سے فضا قدرے گرم ہو رہی تھی..... روزینہ کی ماں اختر بانو اپنے کمرے میں محو استراحت تھیں..... جبکہ روزینہ اور اللہ رکھی جہازی ساز بیڈ پر گرم لافوں میں دبی ہوئی تھیں..... دیوار گیر کلاک میں اس وقت بارہ کا ٹل تھا..... لیکن جانے کیا بات تھی کہ روزینہ کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ تب وہ کن آنکھوں سے اللہ رکھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اللہ رکھی!“

اس نے سوچا..... میں اس لڑکے ساون کے بارے میں کیوں سوچ رہی ہوں..... وہ میرا کیا لگتا ہے.....؟ اس کے دل میں کلیاں سی چٹکنے لگیں..... آپوں آپ نہ چاہتے ہوئے بھی اس دیہانی سے لڑکے ساون کی شبیہ من ہی من میں ابھر رہی تھی..... تاہم تھوڑی دیر بعد روزینہ جیسے اس کی یادداشت کو ہمیز کرنے کی غرض سے دوبارہ بولی۔

”اللہ رکھی! کیا تمہیں..... کسی کی..... محبت..... یاد نہیں آ رہی..... میرا مطلب ہے کوئی ایسا شخص جو تمہیں بہت چاہتا ہو..... اور..... تم اسے چاہتی ہو.....“ روزینہ کی بات پر اللہ رکھی کے چہرے پر حیرت اور شرم کے ملے جلے تاثرات نمودار ہو گئے..... مگر اس کے گلنار چہرے سے یہ بھی مترشح تھا جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش میں اپنے ذہن پر زور دے رہی ہو..... چوری..... چوری.....

”ہاں..... ہاں..... اللہ رکھی یاد کر..... اچھی طرح سے سوچو..... کوئی ایسا شخص، ایسا وجود..... ایسی ہستی..... جو تم سے بہت پیار کرتا ہو..... تمہارے لئے فکر مند ہو اور..... اور تم اس کے لیے پریشان..... بتاؤ..... سوچو.....“ روزینہ اسے تحریک دیتے ہوئے خوابناک کیفیت میں بولی لیکن اللہ رکھی کے چہرے پر سہمی خاموشی طاری رہی۔

☆=====☆=====☆

ساون اس دن شہر لاڑکانہ جانے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا..... وہ اس دن صبح کو کادو جھکرائی کے ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا تھا..... اس کے قریب ہی دو آنے سامنے رکھی بیچوں پر گوشتوں کے چند افراد بیٹھے چائے کی چسکیوں کے دوران معنی خیز انداز میں اس کی جانب نکلے جا رہے تھے..... تب ان میں سے ایک کی رگ شیطنت پھڑکی اور وہ ساون کو سنانے کی خاطر اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے قدرے بلند آواز میں مخاطب ہوا..... ”اڑے یار.....! سنگت خالق سائیں اور سنا ہے تونے..... آج کل کے مجنوں اپنی محبوباؤں کو بہلا پھسلا کر شہر کے خواب دکھا کر انہیں فروخت کر کے آ جاتے ہیں۔“

ساون کو ایک جھٹکا سا لگا اس نے شعلہ بارنگا ہوں سے اس طعنہ زن شخص کی طرف دیکھا جو کن انکھیوں سے اس کی جانب تک رہا تھا..... پھر ایک دم اس نے اپنی نگاہیں گھما دیں تب جواباً اس کے دوسرے ساتھی نے بھی ایک نشتر ساون کی جانب اچھالنا فرض سمجھا۔ ”ہاؤ سنگت یار محمد.....! تو بالکل صحیح کہہ رہا ہے.....“ پھر اس نے بھی ایک ناقابل اشاعت تبصرہ کیا تب ساون کے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی اور وہ غصے سے چائے کی پیالی

ان کی جانب اچھالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا..... اور طیش میں بولا۔

”اڑے بزدلوں کی طرح کیا آپس میں چونچیں لڑا رہے ہو..... ادھر آ کے بات کرو نا.....“ ساون کی پھینگی ہوئی چائے کی ادھ بھری پیالی عین سامنے رکھی لکڑی کی میز پر گر کر ٹوٹی تھی اور چائے کے چھیننے ان کے کپڑوں پر آن گرے تھے..... وہ تعداد میں چار تھے ایک دم غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے..... اور ایک ساتھ ہی ساون کے قریب آ گئے۔

”اڑے تو پھر اتنا غیرت مند ہے تو بتاتا کیوں نہیں..... بے چاری سوڈھل چا چا کی بھتیجی اللہ رکھی کہاں بیچ آیا ہے.....“ ان میں سے ایک نے ساون کی طرف گھورتے ہوئے زہرا گلا۔ ساون کا دماغ اس کی یادہ گئی سے ایک بار پھر اٹنے لگا..... دل تو اس کا یہی کر رہا تھا کہ اس کمینے کی زبان گدی سے کھینچ لے لیکن وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے پہلے جوابی کارروائی کا ارادہ رکھتا تھا لہذا غراتے ہوئے بولا۔

”اڑے..... اتنے غیرت مند بنتے ہو تو اس وقت کہاں تھے جب سوڈھل چا چا کی گھر والی بیماری کے مارے ایڑیاں رگڑ رہی تھی.....“

”یہ ہمارے سوالوں کا جواب نہیں ہے ساون.....“ ان میں سے ایک بھراٹے دار لہجے میں بولا، جواباً ساون بھی ترکی بہ ترکی بولا۔

”تمہیں پھر کس قسم کا جواب چاہئے.....“

اس اثنا میں ہوٹل میں موجود دیگر افراد بھی ان کی تکرار میں دلچسپی لیتے ہوئے جمع ہو گئے تھے..... ہوٹل کے ”دخل“ پر بیٹھا بذات خود ہوٹل کا مالک کادو جھکرائی بھی مجمع پر پریشان نگاہیں ڈالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”اتنے بھولے نہ بنو ساون.....! ہم اللہ رکھی کا پوچھ رہے ہیں..... جو تیرے ساتھ شہر گئی تھی.....“ ساون نے لمحہ بھر توقف کے بعد ایک نظر قرب و جوار میں دیدے پھاڑے کھڑے لوگوں کی طرف دیکھا..... اسے یوں لگا جیسے بھرے مجمع نے اس سے یہ سوال پوچھا ہو..... اور ادھر وہ چاروں شرپسند..... اپنے چہروں پہ مکروہ مسکراہٹ لئے ساون کو یوں گھور رہے تھے کہ جیسے بھرے مجمع میں اسے ذلیل کر دینا چاہتے ہوں۔

ساون نے سوچا یہی وقت ہے کہ وہ ان شیطانوں کی بات کا مدلل جواب دے ورنہ اس کا گوتھ میں رہنا دوبھر ہو جائے گا..... کیونکہ اللہ رکھی کے حوالے سے یہ ایک نازک اور حساس مسئلہ تھا..... پھر وہ بولا تو اس کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا..... اس نے بلا کم و کاست..... چاچی عنایتاں کی بیماری، اور اسے شہر لے جانے پھر اس کے انتقال اور تدفین

ساتھ ساون یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سب..... ایک حادثہ کی وجہ سے غیر ارادی عمل ہے اس میں اللہ رکھی کا کوئی قصور نہیں، وہ ایک دماغی ماہر کے زیر علاج تھی اور اس نے خاطر خواہ امید دلائی تھی کہ ایک نہ ایک دن اللہ رکھی کی یادداشت ضرور لوٹ آئے گی۔ ساون بھی انہی خیالوں میں گم تھا کہ اچانک وہ ایک تیز آواز پر چونکا کسی نے بڑے درشت لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا..... ”اڑے او..... چھو کر..... کہاں بھاگنے کی تیاری کر رہا ہے.....“

ساون نے آواز کی سمت ٹھٹک کر دیکھا تو اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ سامنے انسپکٹر ارشد لاشاری ہتھکڑی لیے چند مسلح سپاہیوں کے ساتھ کھڑا اسے مسکراتی نظروں سے گھور رہا تھا۔ مگر ساون اگلے ہی لمحے خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ لہذا جواباً سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا..... انسپکٹر صاحب میں بھلا کہاں بھاگ رہا ہوں.....“

انسپکٹر ارشد بدستور اسے گھورتی ہوئی نظروں، اور ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ لئے چند ثانیے دیکھتا رہا..... پھر اس کے بعد یک دم اپنے لہجے میں سرد مہری پیدا کرتے ہوئے بولا..... ”ساون! تجھے مرحوم چاچا سوڈھل..... کی یتیم اور معصوم بیٹی اللہ رکھی کو درغلانے اور اغوا کرنے کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔“ یہ کہہ کر انسپکٹر ارشد نے آگے بڑھ کر اسے ہتھکڑیاں پہنا دیں اور ساون ہکا بکا ہو کر اس کی جانب نکلنے لگا۔

انسپکٹر ارشد لاشاری نے ساون کو آنا فنا توالات میں بند کر دیا تھا..... اور بے چارہ ساون درطہ حیرت میں مبتلا سلاخوں کے پیچھے تصویر غم بنا تقدیر کے اس کھوپرن پر انگشت بدنداں ہو کر سوچنے لگا کہ آخر اسے یہ کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے؟..... کچھ گھٹنے بیٹے طبیعت میں ذرا ٹھہراؤ سا آیا تو اس فضول تکرار کو چھوڑ کر ساون ان عوامل پر غور کرنے لگا جس کے تحت وہ بے گناہ گرفتار کیا گیا تھا۔ سنجیدگی سے غور کرنے پر اسے کسی سازش کی بو محسوس ہونے لگی..... جیسے کسی نے اسے دانستہ بھنسوا یا ہو..... پہلا شک اسے علی بخش پر ہوا۔ جو اپنے کاندھے پر خود ساختہ غیرت کی صلیب اٹھائے جہالت کی تصویر بنا اس کا میری ہو رہا تھا، پھر دوسرا شک اسے گوٹھ کے ان چند شر پسند افراد پر بھی ہوا جن لوگوں کو اس نے کا دو جکھڑانی کے ہوٹل میں منہ توڑ جواب سے نوازا تھا..... اگرچہ ساون نے انسپکٹر ارشد لاشاری سے پوچھا بھی تھا کہ اس کے خلاف کس نے رپورٹ درج کرائی ہے۔ اس کے جواب میں انسپکٹر ارشد لاشاری نے مکاری سے اپنی ایک آنکھ میچ کر لٹھ مار لہجے میں کہا۔

”اڑے بابا چھو کر!..... پورے گوٹھ نے تیرے خلاف تھانے میں رپورٹ درج

سے لے کر اللہ رکھی کی اچانک گمشدگی اور پھر ایسے حالات میں اس کا اچانک ملنا کہ وہ اپنی یادداشت گنوا بیٹھی تھی، بتایا۔

”اگر تم لوگوں کو میری باتوں میں ذرا بھی شک ہے تو..... تم میں سے کوئی میرے ساتھ چلے..... جس ہسپتال میں چاچی کا علاج اور پھر انتقال ہوا اس کے پرچے میرے پاس اب تک محفوظ ہیں..... اور میں ان شریف لوگوں کا بھی پتہ دے دیتا ہوں جو لوگ اللہ رکھی کا ایک دماغی ڈاکٹر کے پاس علاج کروا رہے ہیں..... میرا خدا جانتا ہے کہ میں نے یہ سب گوٹھ کے ایک ہمدرد انسان ہونے کے ناتے کیا..... اگر یہ سب باتیں جھوٹ نکلیں تو مجھے تم سب لوگ اس ہوٹل میں الٹا کر کے بجلی کے تار سے باندھ دینا..... ہے کوئی..... جو آگے آئے اور یہ ساری جتو کرے.....؟“ ساون اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ فرط جوش و جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آس پاس کھڑے کتھا گوش لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا..... پھر وہ سب باری باری خاموشی کے ساتھ اپنی اپنی جگہوں کی طرف چلے گئے۔ جبکہ وہ چاروں شیطان بھی دیگر لوگوں کی طرح چپ چاپ وہاں سے کھسک لئے..... اور ہوٹل کا مالک کا دو جکھڑانی بھی بات کو کٹتی دیکھ کر سکون کا سانس لے کر رہ گیا تھا پھر ساون خاموشی کے ساتھ وہاں سے چلا آیا۔

☆=====☆

آسمان دور تک بالکل صاف تھا اسی لیے دھوپ خوشگوار چمک لئے ہوئے تھی..... کا دو جکھڑانی کے چھپر ہوٹل کے قریب سے گزرتی ہوئی شہر جانے والی سڑک ویران تھی..... سڑک کی دوسری جانب چاولوں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے جہاں محنت کش ہاری..... مرد، عورتیں کنٹائی میں مشغول تھے..... ساون سڑک کے کنارے کھڑا شہر جانے والی لاری کا منتظر تھا..... وہ اللہ رکھی کی خیر خیریت معلوم کرنے کی غرض سے شہر اختر بانو کے ہاں جا رہا تھا۔ جب سے اس کی اللہ رکھی کی یادداشت محو ہوئی تھی ساون تب سے اپنے اندر ایک ناقابل بیان بے چینی محسوس کرنے لگا تھا..... اس کا دل اس وقت بڑا کڑھتا تھا جب وہ اپنی محبوبہ دلربا اللہ رکھی کے سامنے جاتا تو وہ اسے اجنبیوں کی طرح خالی خالی نظروں سے گھورتی رہتی، وہ دل موس کے سوچتا کہ اللہ رکھی کی سرگئیں اور بڑی بڑی آنکھوں میں ہر سے اس کے لیے ایک اشتیاق سا جھلکتا رہتا تھا۔ مگر اب وہ ساری کیفیات اک نامعلوم سی تیرگی شب کی نذر ہو چکی تھیں..... اس کی خوبصورت اور دلکش آنکھوں کی چھتتا پر لپکوں پر اب اجنبیت کے گدھ آ بیٹھے تھے..... وہ لگا ہیں اب شناسا نہ رہی تھیں..... لیکن اس کے ساتھ

کروائی ہے..... کہ تُو نے مرحوم چاچا سوڈھل کی جوان، کنواری بھتیجی کو شہر لے جا کر فروخت کر دیا ہے.....“

”بکواس کرتے ہیں یہ سب لوگ.....“ ساون انسپکٹر ارشد لاشاری کی بات پر زور سے بولا..... تو اسے بھی غصہ آ گیا اور وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے لکڑی کے سیاہ رول کو سلاخوں پر زور سے مارتے ہوئے دوسری جانب کھڑے ساون کو گھور کر بولا۔

”ڑے چھو کر! آواز اپنی آہستہ رکھ سمجھا..... یہ تھانہ ہے تھانہ..... گوٹھ..... کا گلیارا نہیں ہے..... یہاں اونچا بولنے والے کی میں زبان کھینچ لیا کرتا ہوں۔“

ساون اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تاکھڑا رہا..... وہ انسپکٹر ارشد لاشاری کے لہجے سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا تھا بلکہ اسے وہ بھی اس سازش کا ایک مہرہ نظر آ رہا تھا..... بہر طور..... ناچار اس نے چپ اختیار کر لی۔

☆=====☆=====☆

”سائیں وڈا!..... چھو کرے کو میں نے اندر کر دیا ہے..... اور کوئی حکم.....؟“ بالآخر انسپکٹر ارشد لاشاری نے رخصت ہوتے ہوئے آخر میں مودبانہ لہجے میں اپنے سامنے چار پائی پر نیم دراز وڈیرے لکھ میر خان سے کہا تو..... وڈیرے کے چہرے پر ایک لمحے کو عجب سی مسکراہٹ رقصاں ہو کر رہ گئی پھر وہ اپنی مونچھوں کو مروڑیاں دیتے ہوئے سر کو اثباتی جنبش کے دوران بولا۔

”ہا..... بابا..... انسپکٹر سائیں!..... مہربانی..... پر خیال رہے کہ..... مجھ پر شک کا بھی خیال اس چھو کرے کے ذہن میں نہ آئے۔“

”ہرگز نہیں آئے گا سائیں بھوتار!..... اور حکم.....“ انسپکٹر ارشد نے مستعدی سے کہا اور جب وہ وہاں سے لوٹنے لگا تو وڈیرے نے دوبارہ اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”اڑے بابا..... انسپکٹر صاحب..... آج رات اوطاق آنا بڑا جشن پاڑیں..... کا بندوبست کیا ہے میں نے تیرے واسطے.....“ وڈیرے کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔

انسپکٹر ارشد کی یہ بات سن کر ہاتھیں پھیل گئیں..... ”لاڑکانہ سے بڑی مشہور گانے والیاں بلوائی ہیں میں نے اور ولایتی شراب کا تو پورا کریٹ آئے گا.....“ وڈیرے کی صراحت پر انسپکٹر ارشد کے منہ میں پانی بھر آیا..... وہ ساون کو گرفتار کرنے کے بعد اپنے کارنامے کی رپورٹ دینے..... سر کے بل وڈیرے لکھ میر خان..... کی اوطاق آدھکا تھا۔

درحقیقت..... وڈیرے ہی کی ایماء پر انسپکٹر ارشد نے ساون کو گرفتار کر کے سلاخوں

کے پیچھے دھکیلا تھا..... ساون کی فوری گرفتاری کے پیچھے..... وڈیرے لکھ میر خان کی ایک بڑی گہری اور گھناؤنی سازش کا فرما تھی..... کیونکہ جب ساون نے اپنی سادہ لوحی میں آ کر..... وڈیرے کو اللہ رکھی کے متعلق ساری کتنی سناٹی تو مکار وڈیرے کے شیطانی ذہن نے فوراً ایک تدبیر لڑاتے ہوئے پہلے ساون کو گرفتار کروایا..... اور اب اس کا ارادہ ساون کے بتائے ہوئے اختر بانو کے بنگلے کے پتے پر اپنے آدمیوں کے ذریعے اللہ رکھی کو کسی طرح حاصل کرنے کے بعد..... ساون پر اللہ رکھی کو اغوا اور فروخت کا مقدمہ چلا کر..... ہمیشہ کے لیے..... اسے پابند سلاسل کروانا تھا۔ لہذا اب وہ بڑی شدت سے منشی میرل وغیرہ کا منتظر تھا۔

☆=====☆=====☆

علی بخش کی تو اب دنیا ہی بدل گئی تھی۔ خیراں اب اسے اپنی سگی اولاد کی طرح چاہنے لگی تھی اور محرم علی بھی علی بخش کو اپنا حقیقی معنوں میں بڑا بھائی سمجھنے لگا تھا..... ماں کی ذہنی کایا کلپ کیا ہوئی تھی کہ محرم کا رویہ بھی اب خوش کن حد تک بدل گیا تھا، اور دونوں مل جل کر ہوٹل میں بیٹھنے لگے تھے..... ادھر دونوں ماں بیٹوں کو عقل آتے ہی ابن الوقت دونوں ماموں..... دوست محمد اور محمد علی نے بھی ادھر کارخ بھر بھی نہیں کیا تھا..... علی بخش کو اب بس ایک ہی فکر سوار تھی کہ کسی طرح سے اپنے مرحوم باپ دودا خان کی وصیت کو جلد سے پورا کرنے کی کوشش کرے..... یعنی کسی طور بھی اللہ رکھی کا بیاہ..... گوٹھ کے کسی شخص سے نہ ہونے پائے..... یہی وجہ تھی کہ علی بخش مسلسل اب ساون کے تعاقب میں تھا..... یعنی وہ کسی طرح اللہ رکھی کا سراغ لگانا چاہتا تھا لیکن پھر جیسے ہی اسے پتہ لگا کہ..... ساون کو تو جیل ہو گئی ہے..... تو وہ ذرا مطمئن ہو کر چپکا بیٹھ رہا..... تاہم پھر بھی اسے اللہ رکھی کے بارے میں کھد بد ضرور لگی ہوئی تھی..... ادھر خیراں اپنے بیٹے محرم علی کی شادی سے فراغت کے بعد علی بخش کے بیاہ کی فکر میں رہنے لگی تھی..... مگر علی بخش اپنے باپ سے کئے گئے وعدے کے ایفاء تک شادی وغیرہ کے جھیلوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ ادھر سورتھ جو ساون کے ساتھ شادی کی خواہش کا جنازہ اٹھائے محرم علی کی دلہن بن چکی تھی اور شتم پشتم زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہی تھی۔ ساون سے شادی نہ ہونے کے غم نے اسے ایک زندہ لاش بنا دیا تھا..... جبکہ اس کی اداسی اور غمناک چہرے کو دیکھتے ہوئے محرم بھی سمجھتا تھا کہ شاید نئی نئی دلہنوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ چونکہ عرصے تک وہ ماں باپ کے پاس رہتی ہیں..... پھر جب بیاہ کر پیا کے دیس سدھارتی ہیں تو ماحول اور لوگ اجنبی ہوتے ہیں ایک نئی نویلی دلہن کے لئے..... لہذا..... ان کی اداسی ایک فطری عمل ہے..... لیکن محرم علی کو ایک بات پر اچنبھا



ضرور تھا کہ..... دلہن بے شک جتنی بھی نئی ہو..... مگر دھیرے دھیرے بہر حال وہ خود کو سسرال اور شوہر کے ماحول میں ڈھال ہی لیتی ہے..... جبکہ سورٹھ توھی بھی اسی گوٹھ کی..... دو گلیارے چھوڑ کر اس کے باہل کی چوٹ تھی پھر اس کی مستقل اداسی کی کیا وجہ تھی..... جو دن بہ دن سوائی ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن بالآخر محرم علی نے سورٹھ سے پوچھ ہی ڈالا۔ ”سورٹھ!..... کیا بات ہے آخر..... تو اتنی چپ چاپ اور اداس کیوں رہتی ہے؟“

وہ اس وقت اپنے شوہر محرم علی کے آگے کھانا چن رہی تھی۔ قدرے چونک کر بولی۔ ”نن..... نہیں..... تو.....“ اس کی گہری اداس آنکھوں سے چور جھلکنے لگا۔

محرم دوبارہ اس کی جانب بہ غور دیکھتے ہوئے پُر زور لہجے میں بولا..... ”نہیں سورٹھ! کوئی تو بات ہے..... جسے تو چھپا رہی ہے.....“ سورٹھ کو ایک جھٹکا لگا..... وہ محرم علی کی طرف چونکتی نظروں سے دیکھ کر گویا بات بناتے ہوئے بولی۔

”نہیں سہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں..... وہ بس امڑ اور پیو یاد آتے ہیں.....“ وہ چپ ہوئی مگر محرم تب بھی مطمئن نہ ہوا..... بولا۔

”تو کون سا..... سو کوس کے گوٹھ سے بیاہ کر آئی ہے..... اسی گوٹھ کی تو ہے تو..... اور دو گلیارے ترے ماں پیورہتے ہیں.....“

سورٹھ یکدم لا جواب ہو کر خاموشی ہو گئی۔ محرم علی..... نے بھی زیادہ جرح نہ کی..... درحقیقت وہ اپنی بیوی سورٹھ سے بہت محبت کرتا تھا..... اور یہ اس سے بے اندازہ محبت ہی کا نتیجہ تھا کہ سورٹھ کی ہر سے اداسی اسے گھائل اور متفکر کرتی تھی..... وہ تو اسے حکیم بدھل کے پاس بھی لے گیا تھا..... یہی نہیں..... گوٹھ کے جنوب میں واقع ایک چھوٹے سے دیہات میں بھی لے جا کر اس نے ایک ”سید بی بی“ کے حجرہ خاص کا چکر سورٹھ کو لگوا دیا تھا..... مگر اس کی پُر اسرار اداسی تھی کہ سوائی ہوتی چلی جا رہی تھی۔

اسی وقت علی بخش اندر داخل ہوا..... سورٹھ نے فوراً سر پہ اجرک رکھ لی اور سر جھکا دیا..... محرم..... صحن میں رلی کچھی چار پائی پر اس وقت دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہا تھا۔

”سلام ادا.....!“ سورٹھ نے ادب سے اپنا سر جھکاتے ہوئے اپنے جیٹھ علی بخش کو سلام کیا، علی بخش نے خاموشی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر چار پائی پر بیٹھ گیا..... اب دونوں بھائی آمنے سامنے شیر و شکر بیٹھے تھے..... محرم نے فوراً اپنی بیوی کو کہا۔ ”سورٹھ بھالی بخش کے لیے بھی مانی (کھانا) لے آ.....“

سورٹھ رسوئی کی طرف بڑھ گئی..... محرم چاولوں کی روٹی کا نوالہ توڑ کر علی بخش کو دعوت دیتے ہوئے بولا۔ ”بھالی بخش!..... جب تک تیری روٹی آتی ہے..... میرے ساتھ شروع ہو جا..... تجھے بھک لگی ہوگی۔“ جب سے دونوں ماں بیٹوں کو اللہ کی طرف سے معجزاتی ہدایت نصیب ہوئی تھی..... محرم کا رویہ علی بخش سے یکسر بدل گیا تھا وہ اب اسے اپنا حقیقی بڑا بھائی سمجھنے لگا تھا..... یہی وجہ تھی کہ وہ اسے ”بھا“ کہہ کر ہی مخاطب کرتا تھا۔ علی بخش نے بھی برادرانہ بے تکلفی سے نوالہ توڑا اور ساگ کے ساتھ لگا کر کھانا شروع کر دیا..... تاہم اس کی عجیب سی خاموشی کو بھانپتے ہوئے محرم نے پوچھا۔ ”بھا..... خیر تہ آ..... کچھ پریشان سا نظر آ رہا ہے، کوئی مسئلہ ہے تو بول.....“

علی بخش اس کی بات پر ذرا چونکا..... پھر اس نے اپنی گردن کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے گویا ثابت نوالہ نگلا پھر قدرے دھیمے لہجے میں بولا..... ”وہ..... ساون کو شاید پولیس پکڑ کر لے گئی ہے.....“

محرم..... ساون سے اچھی طرح واقف تھا، قدرے چونک کر بولا۔ ”اچھا..... کس الزام میں.....؟“ ادھر سورٹھ بھی تب تک علی بخش کے لیے کھانا لے کر چار پائی کے قریب آ چکی تھی، ساون سے متعلق بات اس کی سماعت تک پہنچ چکی تھی..... لہذا وہ اپنے چہرے پر ابھرنے والے اچانک تاثرات پر قابو پاتے ہوئے ہمہ تن گوش ہو کر علی بخش کے آگے روٹی کی ٹوکری رکھنے لگی۔ علی بخش پھر جواباً بتانے لگا۔

”وہ..... چاچا سوڈھل..... نہیں تھا..... جس کے قتل میں پولیس نے بابا کو دھریا تھا..... اس کی بھتیجی تھی ایک اللہ رکھی..... اسے درغلانے اور اغوا کے الزام میں..... پولیس نے ساون کو گرفتار کر لیا ہے۔“

”او..... اچھا۔“ محرم ازراہ حیرت بولا اور اضافہ کیا..... ”یہ اللہ رکھی، وہی تو نہیں جس سے بابا سائیں.....“

”ہا..... وہی ہے یہ لڑکی.....“ علی بخش اس کی بات کاٹ کر بولا اور روٹی کا نوالہ توڑنے لگا..... ادھر سورٹھ کے دل میں ساون کی گرفتاری کا سن کر..... دھکڑ پکڑی شروع ہو چکی تھی..... اور وہ دونوں بھائیوں کی مزید گفتگو سننے کے لیے دانستہ قریب ہی کھڑی رہی۔

”میرا تو خیال ہے پولیس نے بے چارے ساون کو بلا وجہ ہی گرفتار کیا ہے.....“ محرم نے نوالہ نگل کر دوسرا بناتے ہوئے غیر جانبدارانہ تبصرہ کیا۔ مگر علی بخش اس کی بات سے قطعاً متفق نہیں ہوا اور فوراً بولا۔

”پورے گوٹھ کا متفقہ خیال یہی ہے کہ پولیس نے ساون کو درست گرفتار کیا ہے۔“  
”چلو..... پھر ہمیں اس سے کیا مطلب بھلا.....؟“ محرم بولا اور علی بخش کا منہ اس کی بات سن کر نوالہ چباتے ہوئے رک گیا اور پُر سوچ نظروں سے محرم کے چہرے کے جانب تکتے ہوئے گویا بڑبڑانے والے انداز میں بولا..... ”ہمیں اس سے بڑا مطلب ہے.....“  
”محرم.....“

محرم اس کے پُر اسرار لہجے پر چونک کر علی بخش کی طرف تکتے لگا..... پاس کھڑی سورٹھ بھی..... ذرا چونکی..... خیر اس وقت وہاں موجود نہ تھی۔  
”میں سمجھا نہیں.....“ محرم نہ سمجھنے والے انداز میں فوراً بولا تو علی بخش نے سورٹھ کی جانب دیکھا..... محرم نے اس کا اشارہ بھانپتے ہوئے سورٹھ کو وہاں سے چلے جانے کا کہا۔  
”محرم!..... تو شاید بھول رہا ہے کہ..... بابا سائیں..... اللہ رکھی سے بیاہ کرنا چاہتا تھا۔“ سورٹھ کے وہاں سے چلے جانے کے بعد علی بخش محرم کو مخاطب کر کے بولا..... تو وہ بدستور استفسار طلب نظروں سے علی بخش کی جانب تکتے لگا..... علی بخش پھر صراحت بھرے لہجے میں بتانے لگا۔ ”ساون اللہ رکھی سے شادی کرنا چاہتا ہے..... مگر اللہ رکھی بابا سائیں کی منگ تھی اور یہ بات سوڈھل چا چا کے ساتھ طے ہو چکی تھی..... اگرچہ اب دونوں اس دنیا میں نہیں رہے..... مگر اس لحاظ سے اب اللہ رکھی گوٹھ کے کسی بھی شخص سے بیاہ نہیں کر سکتی.....“

”ہوں..... بات تو درست ہے تیری..... مگر اب ساون سے کیسا جھگڑا..... وہ تو اندر ہی ہو گیا ہے.....“ محرم نے آخر اظہار خیال کیا..... اور علی بخش کچھ سوچتے ہوئے چپ ہو رہا..... اندر رسوئی میں بیٹھی سورٹھ کے کانوں تک علی بخش کے کھر کھراتے لہجے کی گونج پہنچ چکی تھی اور وہ یک دم متوحش سی نظر آنے لگی۔

☆=====☆

ثقافتی کونسل کی نائب منتظم، رشیدہ پیرانی کے روزینہ کی والدہ اختر بانو سے کافی گہرے اور پرانے مراسم تھے..... نٹ کھٹ روزینہ کے دل میں کیا ساسی کہ اس نے ایک دن معصوم اللہ رکھی..... کے بنائے ہوئے فن دست کاری کے ثقافتی نمونوں کی نمائش کا پروگرام بنا ڈالا..... اور نہ صرف یہ..... بلکہ اسے انجام تک بھی پہنچایا..... ان نادر نمونوں میں..... اجرک..... لکڑی کی چھوٹی بیل گاڑیاں..... کڑھائی کئے ہوئے گلے کی قمیصیں، جھلملاتے پراندے اور خوبصورت رلیاں شامل تھیں اور جن معصوم ہاتھوں نے ان بیش بہا

ثقافتی نمونوں کو اتنی محنت شاقہ اور خون پسینی سے سینچا تھا اس کے اعتراف میں بہ طور خراج تحسین..... ایک مقامی اور غیر سرکاری سوشل تنظیم نے مبلغ ایک لاکھ روپے بھی دیئے تھے..... جبکہ بعد میں ان مذکورہ دست صناعی کے شاہکاروں کی ہاتھوں ہاتھ فروخت سے جو آمدنی ہوئی تھی وہ رقم اس سے بھی سوا تھی..... روزینہ تو خوشی سے پھولے نہیں سار ہی تھی..... وہ بڑے فخر و انبساط اور ہر ایک سے اللہ رکھی کا تعارف اپنی سگی بہن ہی کے طور پر کروا رہی تھی..... جاننے والے روزینہ کی اللہ رکھی سے بے انتہا محبت بھی بر محمول کرتے ہوئے زیر لب مسکرا دیتے تھے..... روزینہ اللہ رکھی سے اپنے ”تعلق“ پر بڑا فخر محسوس کر رہی تھی، بہر طور جب روزینہ نے ایک دن اللہ رکھی کے آگے ڈھیروں روپے رکھتے ہوئے اسے مطلع کیا۔ ”اگرچہ یہ اس کے فن..... کی قیمت نہیں ہے کیونکہ فن انمول ہوتا ہے۔ وہ محض اچھے اور ستھرے احساسات و جذبات کا اظہار چاہتا ہے..... اور وہ اس کی قیمت بھی ہوتی ہے..... لیکن یہ روپے محض ایک رسم دنیا کے طور پر ہیں.....“

اللہ رکھی بے چاری پھٹی پھٹی آنکھوں سے اتنے ڈھیر سارے نوٹوں کو..... تکتے جا رہی تھی پھر تحیر آمیز لہجے میں روزینہ کو مخاطب کر کے بولی۔ ”یہ اتنے سارے روپے میرے ہیں؟“  
روزینہ..... اللہ رکھی کے بھولپن پر زیر لب مسکرا دی اور بولی۔ ”ہاں..... میری پیاری بہن!..... یہ تمہارے ہیں سب۔“

”لیکن کیوں..... میں نے تو کسی سے بھی یہ روپے نہیں مانگے.....“  
”تم نے نہیں مانگے لیکن یہ تمہاری اس معصوم محنت کے صلے میں ایک معمولی سا نذرانہ ہے..... جو چیزیں تم نے تیار کی تھیں اور جس کی آرٹ گیلری میں نمائش کی گئی تھی..... وہ سب بڑے بڑے لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ خرید لی ہیں..... یہ رقم انہی چیزوں کی ہے.....“ روزینہ نے پُر زور لہجے میں اسے تفصیل بتاتے ہوئے کہا..... تو اللہ رکھی کی خوبصورت و دلکش حیرت سے کھلی ہوئی آنکھوں کا تحیر سوا ہو گیا اور وہ اسی لہجے میں بولی۔

”میری بنائی ہوئی چیزوں کی اتنی ساری قیمت..... وہ اتنی قیمتی تو نہ تھیں..... ایسی چیزیں تو ہمارے گوٹھ کی ہر چھو کر بنالیتی ہے.....“  
”تمہارا گوٹھ جو خوبصورت ہے اس لئے.....“ روزینہ نے پیار سے اللہ رکھی کے بلبح چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

”لیکن میں اتنے روپوں کا کیا کروں گی!..... ایسا کرو یہ سب تم رکھ لو.....“

نے اپنی سی کوشش جاری رکھی..... ”میں اللہ رکھی کے سلسلے میں آیا ہوں..... اور ساتھ ہی آپ کا شکر گزار بھی ہوں کہ آپ نے ہماری گوٹھ کی چھو کری کو اپنے گھر پناہ دی..... اور اس کا علاج بھی کروایا.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے عقب میں کھڑے ایک خدمت گار کو اشارہ کیا جس نے فوراً اپنی کھلی ڈلی نمیش کی جیب سے ایک چیک بک نکال کر نہایت مؤدبانہ انداز میں منشی میرل کی جانب بڑھا دی..... پھر منشی چیک بک اس سے لے کر اپنی گود میں کھولتے ہوئے پین سنجال کر اختر بانو کی جانب تکتے ہوئے بولا..... ”آپ کے اس ہمدردانہ رویے سے ہمارے وڈے سائیں لکھ میر خان بہت خوش ہوئے ہیں..... اور انہوں نے خاص طور پر ہمیں آپ کے پاس پہنچنے کی ہدایت کی ہے اور اللہ رکھی کے سلسلے میں جو خرچہ آپ نے اب تک کیا وہ ہم آپ کو دینے کے لیے تیار ہیں..... سائیں وڈے نے ایک خالی چیک پر اپنے دستخط کر دیئے ہیں..... اب آپ بولیں کتنی رقموں.....“ منشی میرل نے اپنی بات ختم کی اور اختر بانو کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگا..... جبکہ اختر بانو کے چہرے پر یک دم ناگوار تاثرات ابھر آئے تھے..... لہذا جب پہلی بار منشی میرل کو مخاطب کر کے بولی تو اس کے لہجے کی تلخی چھپی نہ رہ سکی۔

”منشی صاحب! آپ کے سائیں وڈے کا دل تو واقعی بڑا ہے لیکن دماغ چھوٹا لگتا ہے..... تبھی انہوں نے ہمارے بارے میں اتنی چھوٹی بات سوچی اور آپ کو ”خالی چیک“ پر دستخط کر کے بھیج دیا..... رہی بات اللہ رکھی کی تو اس پر ہم نے کوئی احسان نہیں کیا ہے..... اور جو ہم تھوڑا بہت اس معصوم لڑکی کے ساتھ کر سکے ہیں..... وہ ہمارا ایک انسان ہونے کے ناتے فرض تھا.....“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئیں مگر چہرے پر ان کے تلخی ہنوز مترشح تھی۔

منشی میرل اختر بانو کی بات پر قدرے جزبہ تو ہوا مگر پھر ڈھٹائی سے کھسیانی ہنسی کے ساتھ بولا..... ”نہیں نہیں جی یہ بات نہیں..... آپ نے ہمیں غلط سمجھا..... دراصل.....“

”میرا خیال ہے آپ کام کی بات کر لیں تو بہتر ہوگا۔“ اختر بانو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سنجیدگی سے کہا..... درحقیقت منشی کی بات پر ان کا موڈ ہی خراب ہو چکا تھا اور وہ..... اس کے ”وڈے سائیں“ سمیت اس کی ”اعلیٰ ذہنیت“ کا بہ خوبی اندازہ لگا چکی تھی۔

اس بار منشی کے چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ دوڑ گئی..... لہذا وہ عیاری سے بات بناتے ہوئے بولا..... ”آپ ٹھیک کہتی ہیں ہمیں واقعی افسوس ہے..... بہر حال..... اگر آپ اسے اب ہمارے ساتھ روانہ کر دیں تو بڑی مہربانی ہوگی..... کیونکہ گوٹھ میں اس کے عزیز رشتے دار پریشان ہو رہے ہیں۔“ اس کی بات پر اختر بانو نے قدرے چونکتے ہوئے کہا۔

”ہاں انہیں میں ہی رکھ لیتی ہوں..... لیکن یہ تمہاری امانت ہوگی میرے پاس.....“ روزینہ نے نرم لہجے میں کہا۔

معا کال بیل کی گنگناہٹ سی گونجی..... اور دونوں کے درمیان گفتگو کا سلسلہ لمحہ بھر کے لیے منقطع ہو گیا اس وقت سردشام اپنے سرمئی گیسو دراز کر رہی تھی..... کمرے میں دو ہزار واٹ کا برقی ہیئر آن تھا یہ اللہ رکھی اور روزینہ کا مشترکہ کمرہ تھا۔

”پتہ نہیں کون ہے باہر..... ویسے دیو گیا ہو گیا دروازہ کھولنے.....“ روزینہ بڑبڑائی..... اور پھر اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئی..... یہاں بھی کمرے کی فضا کو برقی ہیئر سے گرم رکھا گیا تھا..... ایک سکون آمیز پنجا موشی پھیل ہوئی تھی..... ایک صوفے پر اختر بانو حسب معمول سادہ سی ساڑھی میں بیٹھی سویٹر بننے میں مصروف تھیں..... اتنے میں دیو نے آ کر اختر بانو کو بتایا..... ”بی بی جی! باہر کچھ لوگ آئے ہیں..... آپ سے ملنا چاہتے ہیں؟“

اختر بانو ذرا چونکی پھر بولی..... ”کون لوگ ہیں وہ..... کس لئے ملنا چاہتے ہیں؟“

”بی بی جی.....! پہلے کبھی تو انہیں نہیں دیکھا میں نے..... کہہ رہے تھے..... وہ کسی داد پور نامی گاؤں سے آئے ہیں..... چھوٹی بی بی اللہ رکھی کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں.....“

اس کی بات سن کر روزینہ کو ایک جھٹکا سا لگا..... تاہم بیگم اختر بانو نے ملازم کو انہیں اندر بلانے کی ہدایت کی اور اوڑھی ہوئی سیاہ شال کو درست کرنے لگی..... روزینہ گوگو کے عالم میں اپنے کمرے میں آ گئی..... وہ کچھ متفکری نظر آنے لگی تھی۔ ادھر دیو کے ساتھ منشی میرل کاٹن کے کلف لگے شلوار میض اور واسکٹ پر اجرک پھیلائے..... دو آدمیوں سمیت بڑے کروفر کے ساتھ چلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ خانودہ چھر نہیں تھا وہ باہر جیب میں موجود تھا..... اختر بانو کو دیکھ کر منشی میرل نے اپنے مخصوص لہجے میں سلام کیا جس کا اختر بانو نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا اور ساتھ ہی سنجیدہ نظروں سے منشی میرل کی جانب تکتے ہوئے اسے سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شفاف عدسوں اور سنہری فریم والی عینک کے عقب سے ان کی پُر متانت نگاہیں منشی میرل اور اس کے عقب میں تنے کھڑے دونوں خدمت گاروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”میرا نام منشی میرل ہے..... اور میں گوٹھ داد پور سے آیا ہوں.....“ منشی میرل نے کہنا شروع کیا۔ اختر بانو ہمہ تن گوش تھیں انہیں جانے کیوں یہ سب لوگ ایک خاص بخلت کا شکار نظر آ رہے تھے..... منشی میرل کو اگرچہ اپنا لہجہ بدل کر بولنے میں دقت ہو رہی تھی مگر اس

یادداشت کو لوٹانے کے لیے اس کے اپنے سابقہ ماحول اور لوگوں کے بیچ میں رہنا زیادہ بہتر تھا..... اور یہی مشورہ اس کے معالج نے بھی انہیں کئی بار دیا تھا..... ادھر نشی میرل کی مکار آنکھیں اپنی فنکارانہ گفتگو کی اثر پذیری اختر بانو کے چہرے پر بھانپنے میں کوشاں تھیں بالآخر اختر بانو نے سیدھے سبھاؤ اپنے خیال کا اظہار کر ڈالا اور بولی..... ”دیکھئے بات آپ کی درست سہی..... لیکن ہم ایک جوان جہاں لڑکی کو کس طرح ایسے لوگوں کے حوالے کر دیں جنہیں ہم بھی نہ جانتے ہوں..... اور وہ بھی اس صورت میں..... جبکہ وہ ہم میں گھل مل بھی گئی ہو.....“

”بی بی..... ہماری جہاں تک پہچان کی بات ہے تو..... ہم اللہ رکھی کے لیے پرانے نہیں ہیں..... یا اجنبی نہیں ہیں.....“ نشی میرل پھر کوئی دلیل تلاش کرنے میں محو ہو گیا..... بہر حال اس نے اپنی بات جاری رکھی..... ”ویسے آپ کا شک بھی اپنی جگہ بجا ہے..... اب جیسے آپ کہیں..... ویسا ثبوت ہم دینے کی آپ کو کوشش کریں گے.....“ نشی میرل نے بات ختم کی تو اختر بانو کے شفاف چہرے پر ایک بار پھر سوچ کی لکیریں نمودار ہو گئیں..... وہ سوچنے لگی کہ آخر ایسا کون سا ثبوت ان سے مانگے..... جس سے وہ خود مطمئن ہو کر اللہ رکھی کو ان کے حوالے کر دے..... تب اچانک ان کے دماغ میں اس سیدھے سادے دیہاتی سے لڑکے ساون کا چہرہ گھوم گیا..... وہ انہیں کافی حد تک سچا محسوس ہوا تھا..... اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اللہ رکھی کے زیادہ ”قرب“ اور اس کے گاؤں کا بھی تھا..... بالآخر وہ بولیں..... ”ساون کو تو یقیناً آپ جانتے ہی ہوں گے..... میرا خیال ہے اگر وہ بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہوتا تو شاید کچھ سوچا جاسکتا تھا.....“

ان کی بات پر نشی میرل ذرا چونکا..... اسے اس بات کا تو اچھی طرح اندازہ تھا کہ اختر بانو..... اتنی آسانی سے اللہ رکھی کو ان کے حوالے کرنے پر تیار نہیں ہوں گی..... اور نشی میرل زبردستی کرنا چاہتا تھا کیونکہ..... وہ اختر بانو کے اثر و رسوخ سے واقف تھا..... پہلے تو اس کا یہی ارادہ تھا کہ اگر کوئی ایسے ویسے لوگ ہوئے تو ان کے ساتھ دھونس دھمکی سے بھی کام چلایا جاسکتا تھا مگر یہاں آتے ہی اس کا ارادہ بدل گیا تھا..... تب اس نے اختر بانو کی بات پر غور کیا کہ اگر وہ ساون کے ساتھ اللہ رکھی کو ان کے حوالے کرنے پر مصر ہیں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں..... ساون کو ہلکے جھپکتے یہاں لایا جاسکتا تھا لہذا پھر وہ اختر بانو سے یہ وعدہ لے کر رخصت ہو گیا کہ وہ اگلی بار ساون کو لے کر آئے گا..... اور تب اللہ رکھی کو ان کے ساتھ جانے پر کسی کو اعتراض نہ ہوگا۔

”میرا خیال ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ جہاں تک ہمیں اللہ رکھی کے بارے میں علم ہوا ہے کہ اس کا گوشت میں اب کوئی نہیں رہا..... وہ ایک یتیم اور بے سہارا لڑکی ہے..... جبکہ ایک چاچی کا حال ہی میں یہاں کے ہسپتال میں انتقال ہوا ہے.....“ اختر بانو نے دانستہ ساون کا نام نہیں لیا تھا..... مگر کائیاں نشی سیانے کوے کی طرح بھانپ گیا تھا کہ اس خاتون کو اللہ رکھی سے متعلق معلومات بہم پہنچانے کا فریضہ ضرور ساون ہی نے سرانجام دیا ہوگا..... لہذا ایک دم محتاط لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا.....

”آپ کو شاید یہ بات اس ساون نامی چھوکرے نے بتائی ہوگی جو اللہ رکھی کو گوشت سے شہر لایا تھا لیکن شاید پھر اللہ رکھی اس کے شیطانی چنگل سے کسی طرح نکل کر آپ کے پاس پہنچ گئی..... اللہ رکھی بے شک ایک یتیم لڑکی ہے..... لیکن یہ غلط ہے کہ اس کا دنیا میں اب کوئی نہیں رہا..... پورے گوشت میں اس کے رشتے دار موجود ہیں.....“ وہ خاموش ہوا..... اختر بانو گہری نظروں سے میرل کی طرف دیکھ رہی تھیں..... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہتا ہے مگر مختصر آہولی..... ”بہر حال اب آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”بس یہی کہ آپ اللہ رکھی کو ہمارے ساتھ کر دیں..... ہمارا خیال ہے وہ اپنے گوشت میں..... اپنے لوگوں کے ساتھ زیادہ خوش رہے گی.....“ نشی میرل نے مکاری سے اختر بانو کی جانب دیکھتے ہوئے کہا..... اس نے لفظ اپنے لوگوں پر زیادہ زور دیا تھا.....

اختر بانو اس کی بات پر سوچ میں غطاں ہو گئی..... پھر چند ثانیے بعد بولی..... ”نشی صاحب!..... اللہ رکھی کو آپ لوگوں کے حوالے کرنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں..... لیکن..... بات یہ ہے کہ اس کی ایک حادثے میں یادداشت چلی گئی ہے وہ کسی کو پہچاننے سے قاصر ہے..... اور دوسری اہم بات یہ کہ وہ ہم سے کافی مانوس ہو چکی ہے اس کا علاج بھی جاری ہے..... اس حالت میں اس کا آپ لوگوں کے ساتھ جانا اللہ رکھی کے لیے نامناسب ہوگا.....“

ان کی بات کے اختتام پر نشی میرل کے چہرے پر یکدم گہری سنجیدگی سی کھنڈ آئی اور وہ بولا..... ”میرا تو خیال ہے اللہ رکھی اگر اپنے لوگوں اور اپنے گوشت..... میں رہے گی تو اس کی گمشدہ یادداشت پر زیادہ خوشگوار اثر پڑے گا جو اس کی یادداشت لوٹانے میں معاون ثابت بھی ہوگا.....“ نشی میرل کی اس دلیل نے اختر بانو کو جواب سا کر دیا.....

مگر وہ بہر طور اتنی جلدی اور بغیر کسی شناخت کے اللہ رکھی کو ان کے حوالے کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی مگر ویسے اسے نشی میرل کی بات دل کو لگی تھی کہ اللہ رکھی کی گمشدہ

☆=====☆=====☆

”معاف کرنا سائیں وڈا! آپ نے ساون کو اندر کروا کر صحیح نہیں کیا.....“ منشی میرل دبے دبے لہجے میں بولا۔

اس نے گوٹھ پہنچتے ہی..... وڈیرے لکھ میرخان سے اختر بانو سے متعلق ساری گفتگو گوش گزار کر دی تھی..... مگر جب اسے یہ پتہ چلا کہ ساون حوالہ پولیس ہو چکا ہے اور مزید یہ کہ یہ سب وڈیرے کے ایما پر ہوا ہے تو اس نے بلا تامل اپنے خیال کا اظہار وڈیرے سے کر ڈالا تھا۔ وڈیرا اس کی بات پر کھرکھراتے لہجے میں بولا۔

”منشی!..... ساون کو اندر کروانے کا مقصد میرا یہ تھا کہ اللہ رکھی کو اغوا یا فروخت کروانے والی بات زیادہ سے زیادہ پھیلے..... پھر جب تم اللہ رکھی کو کسی طرح یہاں لے آتے تو.....“ وڈیرا دانستہ اپنی آنکھ مکاری سے میچتا ہوا چپ ہو رہا اس کی نگاہیں منشی کے چہرے کی طرف تھیں۔

منشی نے وڈیرے کی بات سن کر اپنے ناریل جسے سر کو ہولے سے اٹھاتی جنبش دی پھر بولا۔ ”مگر سائیں وڈا اب کیا کیا جائے ساون کو تو اب اپنے ساتھ شہر لے جانا پڑنے گا اس ”جج صاحبہ“ کے سامنے.....“ منشی کا اشارہ بلاشبہ اختر بانو کی طرف ہی تھا۔

”ہالا بابا..... تو پھر ٹھیک ہے..... ساون کو ضمانت پر رہا کروا دیتے ہیں..... میں خود اس کی ضمانت کرواؤں گا..... ابھی وہ ادھر ہی کے تھانے میں ہے..... اپڑیں انسپکٹر ارشد کے پاس.....“ وڈیرا اپنے مخصوص لہجے میں بولا..... اور منشی عیاری سے ہنستے ہوئے بولا۔

”ہا سائیں وڈا!..... یہ تو اور بھی اچھا ہو جاوے گا، اس چھوکرے ساون پر ہمارا احسان بھی ہو جائے گا..... اور..... اور پھر ہم اسے سکھا..... بہلا کر..... اختر بانو کے ہنگلے میں لے جائیں گے، مگر پھر.....“ وہ رک گیا اور الجھن آمیز نظروں سے وڈیرے کی طرف تنکٹے لگا۔

”میں تیری بات سمجھ رہا ہوں منشی۔“ وڈیرا جلدی سے بولا..... ”اللہ رکھی کو ایک بار ہنگلے سے نکال تو لے..... ساون کو بھی دیکھ لیں گے.....“ پھر وہ منشی میرل کو سرگوشی میں کچھ سمجھانے لگا۔

☆=====☆=====☆

”چل چھوکرے تیری ضمانت ہو گئی..... باہر نکل آ.....“ ایک سپاہی نے حوالا ت کی

سلاخوں پر ڈنڈا بجاتے ہوئے بوسیدہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے ساون کو کڑک دار لہجے میں مخاطب کیا اور ساون چونک کر اٹھ بیٹھا..... اس کے پڑمردہ چہرے پر یکا یک حیرت عود آئی تھی..... شاید اسے اتنی جلدی اپنی رہائی کی امید نہ تھی..... بہر طور وہ باہر نکلا اور سپاہی اسے لے کر ارشد کے کمرے میں لے آیا وہاں منشی میرل بھی موجود تھا۔

”سائیں وڈے کا اپنے شکر یہ ادا کر ڈے چھو کر، جو تیری ضمانت بھیجی اس نے۔“ سامنے ایک بھاری بھر کم میز کے عقب میں بیٹھے پولیس انسپکٹر ارشد نے ساون کو گھورتے ہوئے کہا اس کا اشارہ وڈیرے لکھ میرخان کی طرف تھی..... جو اب ساون خاموش رہا..... منشی غالباً غلٹ میں تھا لہذا ساون کے کمرے میں آتے ہی انسپکٹر ارشد سے بولا۔

”وڈی مہربانی سائیں.....! اب ہم کو اجازت دو۔“ یہ کہتے ہوئے منشی میرل کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆=====☆=====☆

باہر سردشام کی کاٹ دار ہوا چل رہی تھی اس وقت اوطاق میں تین افراد کے باوجود سکوت چھایا ہوا تھا..... ان کے سپاٹ چہروں سے عیاں تھا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے کسی اہم سنجیدہ گفتگو میں مصروف رہے تھے..... تین افراد..... میں سے ایک وڈیرا میر لکھ میرخان، منشی میرل اور ساون تھے..... کچھ دیر پہلے ہونے والی اس اہم گفتگو میں وڈیرا لکھ میرخان ہی بولتا رہا تھا..... وہ اپنی گفتگو میں ساون کو یہ باور کروانا چاہتا تھا کہ..... معصوم اللہ رکھی..... جس کا دنیا میں اب کوئی نہیں رہا..... وہ اصول طور پر اب حویلی کی ”پناہ“ میں رہنے کی حق دار تھی جب تک کہ اس کی شادی نہ ہو جائے..... یہ گوٹھ کا ایک عام پرانا رواج تھا۔ دوسرا وڈیرے نے ساون کو اپنے ساتھ ملا کر اور اختر بانو کے ہنگلے سے اللہ رکھی کو اس کی ”پناہ“ سے نکال کر اپنی حویلی لانے کی خاطر اسے راضی کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ان دونوں یعنی اللہ رکھی اور ساون کی آپس میں شادی کا بھی بندوبست کرے گا..... پھر بھلے وہ دونوں آرام و سکون سے اپنی زندگی بسر کریں..... مزید یہ کہ اس طرح اللہ رکھی کی گمشدہ یادداشت کے لوٹ آنے کے بھی قوی امکان تھے۔

یہ تھیں چالاک وڈیرے کی چکنی چڑی باتیں جس نے ساون کو بالآخر کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا..... اور وہ اب خاموش مونڈھے پر بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے..... ساون نے ان کے ہمراہ شہر جانے کی فوری ہامی بھرنی..... وہ ایک سادہ لوح انسان تھا..... وڈیرے کی گھناؤنی سازش سے بالکل بے خبر..... بہر طور صبح تڑکے ساون کا

منشی میرل کے ساتھ شہر جانے کا پروگرام طے ہوا..... ادھر منشی میرل نے خانو کو دانستہ منظر عام سے ہٹا دیا تھا..... کیونکہ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ خانو دھچکر کو ساون سخت ناپسند کرتا ہے۔

اگلے دن علی الصباح منشی میرل، ساون اور چند خدمت گاروں کے ساتھ جیپ میں سوار ہو کر شہر لاڑکانہ چل دیئے..... سارے راستے ساون کی عجیب ذہنی کیفیت رہی..... وہ سوچ رہا تھا کیا اللہ رکھی ان کے ساتھ جانے پر راضی ہو جائے گی جبکہ وہ تو اب ساون کو بھی پہچاننے کی روادار نہ رہی تھی..... بہر طور..... یہ لوگ سب اختر بانو کے بنگلے پر پہنچ گئے..... ادھر روزینہ کو جب اس بات کا علم ہوا کہ اللہ رکھی کو لینے اس کے گوٹھ سے ساون سمیت کچھ لوگ آرہے ہیں تو وہ یکدم پریشان اور غم زدہ سی ہو گئی..... کیونکہ وہ اتنے عرصے میں معصوم اللہ رکھی سے بہت مانوس ہو چکی تھی..... بلکہ وہ کیا..... دونوں ہی ایک دوسرے کے خاصی قریب آچکی تھیں۔

روزینہ نے دبے دبے لہجے میں اپنی ماں اختر بانو سے احتجاج بھی کیا کہ..... کم از کم اللہ رکھی کو اس کی یادداشت لوٹنے تک یہیں رہنا چاہئے تھا..... مگر اس کی ماں کا بدستور یہی موقف تھا کہ اللہ رکھی کا اپنے لوگوں میں لوٹنا ہی بہر حال بہتر تھا تا کہ اس کی کھوئی ہوئی یادداشت کے دوبارہ لوٹنے کے روشن امکانات پیدا ہو سکیں۔

”نہیں میں ان لوگوں کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی..... میں تم سے دور نہیں ہو سکتی.....“ اللہ رکھی تڑپ کر بولی۔

روزینہ جو اپنی ماں کی ہدایت کے مطابق چارونا چار اللہ رکھی کو ذہنی طور پر ساون وغیرہ کے ساتھ واپسی لوٹنے کے لیے تیار کر رہی تھی..... اس کی بات پر وہ اور بھی رنجور سی ہونے لگی اور بے اختیار بھیگی ہوئی نظروں سے اس کے معصوم چہرے کی جانب تنکے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگالیا اور جب بولی تو اس کی آواز میں گہری رقت تھی..... ”میری پیاری بہن!..... تجھے خود سے جدا کرنے کو تو میرا بھی جی نہیں چاہ رہا..... مگر مجبور ہی ہے اور اس میں تیرا بھی بھلا ہے.....“ روزینہ ذرا چپ ہوئی..... پھر ذرا مختلف انداز میں سمجھاتے ہوئے قدرے رساں سے بولی..... ”دیکھ اللہ رکھی..... وہ جوڑکا ہے ناساں..... وہ تجھ سے بہت محبت کرتا ہے..... مجھے تو اس بے چارے پر بھی ترس آتا ہے..... میں تو کہتی ہوں تو اس کے ساتھ گوٹھ جاتے ہی بیاہ کر لینا.....“ اس کی بات سن کر اللہ رکھی نے ذرا چونک کر روزینہ کی طرف دیکھا اس کے معصوم چہرے پر سرنی سی تیر گئی تھی..... پھر فوراً اس نے اپنی نگاہیں جھکا دی تھیں۔

”اور پھر تو کون سا ہمیشہ کے لیے خدا نخواستہ ہم سے جدا ہو رہی ہے..... ساون سے شادی کے بعد..... بھی ہم تجھ سے ملتے رہیں گے..... یوں سمجھ ہم تیرے میکے کے ہوں گے.....“ روزینہ کی بات سن کر بے اختیار اللہ رکھی کے دلکش لبوں پر ایک معصوم مسکراہٹ چل گئی..... اور روزینہ پھر اسے اپنے گلے سے لگاتے ہوئے تسلی دے کر بولی..... ”پتہ ہے..... مُمی کا بھی یہی خیال ہے کہ تجھے ساون سے فوری شادی کر لینی چاہئے..... ساون امی کو بھی پسند ہے..... اور مُمی کی بات کبھی غلط نہیں ہوتی۔“

بالآخر اللہ رکھی نے آخری بار اپنی بھیگی ہوئی پلکوں کو اٹھا کر روزینہ کی طرف افسردہ نگاہوں سے دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”مت رو..... میری بہن..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے پورا یقین ہے..... تو اگر ساون سے شادی کر لے گی تو دیکھنا ایک نہ ایک دن تجھے سب کچھ یاد آجائے گا..... اور تب تو..... اپنے ”کھوئے“ ہوئے ساون کو پا کر بہت خوش ہوگی..... لیکن..... لیکن..... پھر شاید ہمیں تو بھول جائے..... اللہ رکھی.....“ روزینہ نے اچانک افسردہ ہوتے ہوئے کہا..... اور اس کی سوچی ہوئی غم آگیز نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر جم سی گئیں۔

☆=====☆

اختر بانو ایک جرأت مند اور نڈر خاتون تھیں..... وہ اللہ رکھی کی..... سپردگی کو مکمل طور پر قانونی بنانے کی غرض سے..... منشی میرل وغیرہ کے ساتھ گوٹھ داد پور وڈیرے کی حویلی تک جانے کے لیے خود تیار ہو گئیں..... اور نہ صرف یہ..... بلکہ انہوں نے اپنے ہمراہ ایک قریبی جاننے والے ایڈووکیٹ..... افتخار احمد کو بھی ساتھ لے لیا تھا..... روزینہ بھی ہمراہ تھی..... یہ لوگ سب اپنی کار میں سوار تھے..... اللہ رکھی کار میں ہی موجود تھی جبکہ ساون اور منشی میرل وغیرہ..... ایک الگ جیپ میں براجمان تھے..... یہ مختصر سا قافلہ گوٹھ داد پور کی طرف روانہ ہوا۔

اللہ رکھی اور روزینہ کے چہروں پر افسردہ سی خاموشی چھائی ہوئی تھی..... جبکہ اختر بانو جو ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھیں..... ان کے جہاندیدہ چہرے سے تفکر نمایاں تھا ادھر ان کے آگے موجود جیپ میں ساون کی دلی کیفیت بھی عجیب ہو رہی تھی..... اسے خوشی کا بھی احساس ہو رہا تھا اور ذہن کی کسی عمیق گوشے میں ایک ”کھٹک“ کا بھی احساس بے چین کئے دے رہا تھا..... بہر طور..... لگ بھگ گھنٹہ بھر پختہ سڑک پر محو سفر رہنے کے بعد یہ گاڑیاں ذہنی جانب کپے میں اتر گئیں..... یہاں سے قریباً آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں بالآخر

خاصے وسیع رقبے تک پھیلی ہوئی پختہ پتھروں سے بنی حویلی کے سامنے آن رکیس۔

سب سے پہلے جپ میں سے خاصی غلت میں منشی میرل اتر ا..... اس کے چہرے پر خاصا تردد پایا جاتا تھا..... پھر آنا فانا حویلی کا مہمان خانہ کھلوا دیا گیا..... اور یہ سب لوگ وہاں آگئے..... اس ہال کمرے کی چھت خاصی اونچی تھی..... وہاں صوفے اور سرکنڈوں کے مونڈھے بھی موجود تھے خدمت گار اور چاکر حرکت میں آچکے تھے..... ان لوگوں کو وہاں چھوڑ کر میرل..... خاموشی کے ساتھ کھسک گیا اور سیدھا کمرہ خاص میں جا دھکا وہاں..... وڈیرا امیر لکھ میر خان مہمانوں سے ملاقات کی تیاری میں مشغول تھا..... اس کے چہرے پر بھی خاصی پریشانی پائی جاتی تھی..... منشی کو دیکھتے ہی وہ درشتگی سے بولا۔

”اڑے میرل!..... میں نے تجھے صرف اس چھو کری اللہ رکھی کو لانے کے لیے بھیجا تھا یہ تو اپنے ساتھ پورے شہر کو اٹھالایا..... میں نے سنا ہے کوئی وکیل بھی ساتھ آیا ہے تیرے.....“

منشی میرل کے چہرے پر خجالت کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے پہلے ہی سے وڈیرے کی ناراضگی کا اندازہ تھا تاہم وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

”سائیں بھوتار..... میرا کوئی قصور نہیں اس میں..... وہ زنانی (عورت) ہے نا اختر بانو..... بڑی چالاک ہے..... یہ سارا کیا دھرا اسی کا ہے..... میں لینے تو صرف اللہ رکھی کو ہی گیا تھا.....“

”اچھا..... اچھا..... اب بس کر..... ملنا تو پڑے گا ہی ان سب سے.....“ وڈیرا بیزار سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بڑبڑایا..... اور منشی میرل خاموش رہا۔

☆=====☆=====☆

اندیشوں بھری شام..... دور غربی افق میں غروب آفتاب سے تاریکی مستعار لینے کے لیے پرتو لے کھڑی تھی..... وڈیرا لکھ میر خان اپنے کمرہ خاص میں موجود تھا..... اس کے سامنے میز لوازم آوارہ سے بھری ہوئی تھی..... منشی میرل بھی سامنے مونڈھے پر بیٹھا کمینے پن سے وڈیرے کے بے خود ہوتے چہرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

”ڑے منشی.....!“ معاً وڈیرے نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں سامنے بیٹھے منشی کو

پکارا۔

”خاخر سائیں وڈا.....!“ وہ مستعدی سے بولا۔

”شیر الی عورت خود..... کو بڑا چالاک سمجھتی تھی..... ہیں.....“ وڈیرے کے

لڑکھڑاتے لہجے میں گہرا نخوت آمیز طنز تھا۔ اس کا اشارہ اختر بانو کی طرف تھا۔

”سائیں..... ہوگی چالاک مگر اپنے لیے، وہ خوشی خوشی اللہ رکھی کو آپ کے حوالے کر گئی۔“ منشی میرل نے خوشامدی لہجے میں کہا اور وڈیرے کی مخمور آنکھوں میں بواہوسی کی آمیزش مزید گہری ہو گئی..... پھر لمحہ بھر توقف کے بعد وڈیرا لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔

”اللہ رکھی کے ساتھ کون ہے اس وقت؟“

منشی میرل وڈیرے کا اشارہ سمجھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ ”سائیں وڈا!..... وہی آپ کی پرانی خادمہ فضلاں..... اپڑیں خانو دھیر کی بہن..... وہی ہے اس کے ساتھ.....“

”اڑے بابا! جا پھر دفغان ہو جلدی..... بول اس گدھی کو نکڑا..... اللہ رکھی کو ادھر لے کر آئے۔“

منشی فوراً ہار نکل گیا..... کمرے میں دانستہ روشنی کا اہتمام کم رکھا گیا تھا..... وڈیرے لکھ میر خان کو اپنا دل تیز تیز دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی مخمور نظریں کمرے کے واحد بند دروازے کی طرف تھیں..... اس کی آنکھوں میں ایک بڑی دیرینہ خواہش کی تکمیل کی مسرت پھوٹی پڑ رہی تھی..... پھر دروازہ کھلا..... اور بھاری بھر کم فضلاں، معصوم اللہ رکھی کو لئے کمرے میں داخل ہوئی..... اللہ رکھی سہمی ہوئی چڑیا کی طرح گھبرائی گھبرائی اندر داخل ہوئی۔

”ڑی..... سلام کر اپڑیں سائیں کو.....“ اس کے عقب میں کھڑی فضلاں نے معصوم اللہ رکھی کو ٹھوکا دیا۔

”بس تو جا..... فضلاں..... اس کی بڑی بڑی آنکھیں تو خود مجھے سلام کر رہی ہیں۔“ وڈیرا مخمور نگاہوں سے اللہ رکھی کی دلکش مگر سر اسیمہ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا..... اور جب فضلاں وڈیرے کا اشارہ سمجھتے ہوئے ہٹنے لگی تو..... وڈیرے نے پھر بلند آواز میں فضلاں کو جاتے جاتے ہدایت دی..... ”ڑی..... باہر..... سنا کر دو..... کسی کی آواز مجھے سنائی نہ دے..... سمجھی.....“

”جی سائیں!“ فضلاں کے لہجے میں واضح طور پر کپکپی عود کر آئی تھی اور پھر وہ چلی گئی۔

اب کمرے میں سکوت چھا گیا تھا جبکہ معصوم اللہ رکھی ہراساں ہرنی کی مانند وڈیرے کو دھیرے دھیرے اپنی جانب بڑھتے ہوئے خوف زدہ نظروں سے تکیے جا رہی تھی..... وڈیرا اس کے بالکل قریب پہنچ کر بولا۔ ”اللہ رکھی!..... مجھ سے کاہے کو ڈرتی

نوجوان کی آنکھوں سے غیرت و حمیت کے شعلے نکلنے لگے۔ اور کانوں میں اپنے مرحوم باپ دودا خان کے الفاظ گونجنے لگے۔

”علی بخش! اللہ رکھی! میری منگ ہے۔ اور تیری ہونے والی ماں۔ بے شک سوتیلی سہیلی۔ مگر باپ کی لج۔ بیٹے کی بھی عزت ہوتی ہے۔“ یہ نوجوان علی بخش تھا اس نے اللہ رکھی کے خستہ وجود پر اپنی اجرک ڈال دی اور کلباڑی ہاتھوں میں تولتا غیظ و غضب کا طوفان بنا حویلی کی جانب دوڑ پڑا۔ ادھر اللہ رکھی حیران و پریشان اسے پہچان بھی نہ پائی وہ آگے بڑھ گئی۔ تار کی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر وہ کسی نہ کسی طرح۔۔۔۔۔ ساون کا پوچھتی۔ گرتی پڑتی اس گھر کے دروازے پر آکر نڈھال ہو کر گر پڑی۔۔۔۔۔ دروازہ ساون کے باپ موگو نے کھولا تھا۔ وہ اللہ رکھی کو اس حالت میں دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ پھر جب وہ کسی طرح اسے سہارا دے کر اندر لایا تو ساون جیسے سن ہو کر رہ گیا۔۔۔۔۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی کل کائنات اس کے قدموں میں بکھرنے لگی ہو۔ اس نے فوراً اپنی بکھرتی ہوئی کائنات کو بڑھ کر سمیٹ لیا۔

”اللہ رکھی!۔۔۔۔۔ یہ تیرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ مجھے بتائیں۔ اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ غیظ و غضب سے اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔ اس نے فوراً اپنی کلباڑی ہاتھوں میں لے لی۔ اس کی ماں اور بہن ہدایتاں ساون کو جوش و غیرت کی آگ میں سلگتا دیکھ کر دہل کر رہ گئیں۔

”نہیں ساون!۔۔۔۔۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ تو کہیں نہیں جا۔۔۔۔۔ میں تجھے کھانا نہیں چاہتی۔ تو کہاں چلا گیا تھا ساون۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔ وڈیرے کے پاس کون چھوڑ کر گیا تھا۔“

اللہ رکھی کی زبان پر اپنا نام اور اس کی خوبصورت آنکھوں میں اپنے لئے شہنا سائی دیکھ کر ساون کی آتش انتقام ذرا سرد پڑنے لگی اور وہ خوشی و انبساط سے اللہ رکھی کو شانوں سے پکڑ کر مسرت آمیز لہجے میں دیوانوں کی طرح اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔۔۔۔۔ ”اللہ رکھی! میری اللہ رکھی!۔۔۔۔۔! تہ۔۔۔۔۔ تو نے مجھے۔۔۔۔۔ مجھے پہچان لیا۔۔۔۔۔ اپنے ساون کو پہچان لیا۔“ اللہ رکھی اس کی بات پر قدرے چونک کر بولی۔

”ساون! میں تجھے بھولی کب تھی۔۔۔۔۔ یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔؟“

”میں تجھے سب بتا دوں گا اللہ رکھی۔۔۔۔۔ پہلے مجھے اس ذلیل وڈیرے سے حساب کر آنے دے۔“ ساون ایک بار پھر آگ بگولا ہوتے ہوئے بولا۔ مگر اس اثناء میں اس

ہے۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ میں تو تمہارا وڈا بھوتار ہوں۔۔۔۔۔ آجا۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہی وڈیرا اس پر جھپٹا۔ اللہ رکھی کے حلق سے ایک تیز چیخ برآمد ہوئی اور وہ خود کو بچاتے ہوئے چند قدم پیچھے کو ہٹی تو اس کا پاؤں رپٹ گیا وہ فرش پر آ رہی۔ اس کی اجرک نما چادر وڈیرے کے پنچے میں آگئی تھی جسے اس نے غلت میں پرے پھینک دیا اور زمین بوس کا پتی سکتی اللہ رکھی پر آ رہا۔۔۔۔۔ اللہ رکھی کو اپنی عزت کے خاک میں ملنے کے جاں سوز لمحات کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ وہ خود کو چھڑا کر دروازے کی جانب دوڑی تو وڈیرے کا ہاتھ بجلی کی سی سرعت سے حرکت میں آیا اور اللہ رکھی منہ کے بل پختہ فرش پر گری اور اس کی پیشانی پر سخت چوٹ آئی۔۔۔۔۔ بے اختیار وہ زور سے چیخی۔۔۔۔۔ ایک لمحے تو اس کی آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔ اور دل و دماغ کی بھی لمحہ بھر یہی کیفیت رہی مگر پھر جسے اس کے ذہن اور دل سے تارکی کا پردہ منکملت چاک ہوا تو اچانک اسے یوں لگا جیسے وہ یک دم خواب سے جاگی ہو۔۔۔۔۔ اور وہ بھی ایسے خواب سے جو جاگنے کے فوراً بعد ہی ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اب خوف اور ڈر کی جگہ حیرت نے لے لی تھی۔ اس کے ذہن نے ایک ایسی ہی ایسا پلٹا کھایا تھا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ اس پر ابھی کیا قیامت گزرنے والی تھی۔ پھر سب سے پہلے اس کے دماغ میں جس کی شبیہ ابھری تھی اور جس کا نام کپکپاتی زبان آیا وہ ساون کا تھا۔

ادھر وڈیرا پھر اس پر جھپٹا اسے اپنی مخدوش صورت حال کا احساس ہوا اور اس بار وہ ”ساون“ کا نام لے کر زور سے چیخی۔۔۔۔۔ پھر جانے کس طرح اللہ رکھی نے اپنی کہنی وڈیرے کی ناک پر رسید کی اور اس کے ایک جانب اٹھتے ہی اللہ رکھی۔۔۔۔۔ دروازے کی جانب بڑھی۔ اللہ رکھی کی یادداشت واپس آتے ہی گویا اس کے نازک شریر میں ہمت و حوصلے کی ایک نئی قوت عود کر آئی تھی وہ جلدی سے دروازے کے پٹ کھول کر۔۔۔۔۔ ایک چوڑے اور پختہ گلیارے میں آگئی یہ حویلی کے وسطی دروازے کا راستہ تھا۔۔۔۔۔ جو ذرا آگے دوڑنے کے بعد اللہ رکھی کو نظر آ گیا۔۔۔۔۔ اللہ رکھی نے جلدی سے اس پر چڑھے ہوئے پرانی طرز کے کنڈے کو ہٹایا اور پھر ذرا دیر بعد ہی وہ حویلی سے باہر ایک طرف کو بے تحاشہ دوڑی چلی جا رہی تھی۔ جیسے اس کے عقب میں ان گنت بلائیں متعاقب ہوں۔۔۔۔۔ پھر معاہدہ کسی مضبوط جسم سے ٹکرائی اور اس کی چیخ نکل گئی۔ نیم تاریکی میں اللہ رکھی نے اس غیر مانوس مگر قدرے کرخت نظریں لئے نوجوان کو دیکھا۔۔۔۔۔ اور ہانپتے ہوئے اسے اپنے اوپر گزرنے والی قیامت کے بارے میں بتانے لگی۔ اس کے یہ بتانے کی دیر تھی کہ اس



کی ماں اور بہن بھی اس کے آگے گڑ گڑاتی ہوئی آگئیں اور اللہ رکھی بھی اپنی قسم دیتے ہوئے ساون کو اپنے ارادے سے باز رکھتے ہوئے بولی۔

”نہ ساون..... تجھے میری قسم..... خود پہ قابو پالے..... اللہ سائیں اس ظالم میری کا خود ہی منہ کالا کرے گا.....“ اللہ رکھی کی التجا کام کر گئی اور ساون کا غصہ ذرا..... ٹھنڈا پڑا..... اور سب نے سکھ کا سانس لیا۔

☆=====☆=====☆

اگلے دن پورے گوٹھ داد پور میں کہرام مچا ہوا تھا..... وڈیرے لکھ میر خان کو..... علی بخش نے کلہاڑیوں کے وار کر کے ہلاک کر ڈالا تھا اور علی بخش کو پولیس گرفتار کر کے لئے گئی تھی..... گوٹھ کے لوگ اس بات پر متحیر تھے کہ بھلا علی بخش کو وڈیرے سے ایسی کیا دشمنی تھی کہ اس نے آنا فنا وڈیرے کو موت کے گھاٹ اتار دیا مگر یہ بات صرف اللہ رکھی اور ساون ہی جانتے تھے کہ..... علی بخش نے وڈیرے کو کیوں ہلاک کیا تھا۔

کچھ روز بعد جب ساون اور اللہ رکھی کی آپس میں شادی ہونے والی تھی تو ساون نے شرمائی شرمائی اللہ رکھی سے کہا..... ”ہم اپنی شادی میں شہر سے اختر بانو اور روزینہ کو بھی ضرور بلوائیں گے۔“ تو اللہ رکھی نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”ساون! یہ اختر بانو اور روزینہ کون ہیں؟“ تو ساون مسکرا کر چپ ہو رہا..... اسے سب سے زیادہ ترس روزینہ پر آیا۔

(ختم شد)